روح کے شکاری

ایم اے راحت

روح کے شکاری

حصہ اول

ایم-اے راحت


پبلیکیشنز
ٹبہ بابا فرید ضلع کچہری لاہور
Ph:7311965

طیارہ ایک پرسکون پرواز کر رہا تھا۔ ائیر ہوسٹسیں اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھیں، کئی ملکوں اور کئی نسلوں کے مسافر طیارے میں موجود تھے اور میرا ذہن کسی ایسی کہانی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا جو اپنی طرز کی بے مثال ہو۔ کوئی ایسی کہانی جو منفرد ہو، لیکن کہانی کا موضوع ابھی تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ کیا کہانی ہے۔ کیا کہانی ہونی چاہیے۔

میری نگاہ طیارے کے مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ طویل ترین بوئنگ کے آخری سرے تک تو میں مسافروں کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا لیکن جہاں تک نظر کام کر جائے...... اور جہاں تک نظر نے کام کیا مجھے بہت سے ایسے کردار نظر آئے جن کے چہرے بے شمار انوکھی کہانیوں کے اوراق تھے۔ ان چہروں پر کہانیاں تحریر تھیں۔ آہ...... کاش میں یہ کہانیاں سن سکوں، انہیں تحریر کر سکوں۔

لیکن یہ سب آسان نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی خواہش تھی جو پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اول تو سفر مختصر، پھر بھلا یہ لوگ میری یہ فرمائش کبھی پوری کریں گے۔ ہاں...... اگر کوئی ایسا عمل ہو جائے جس سے ہم لوگوں کو ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے تو کم از کم میں اپنے منتخب افراد سے ان کی داستانیں ضرور سنو۔ اے کاش۔ کچھ ہو جائے۔ مثلاً یہ جہاز کسی خوفناک طوفان میں گھر جائے اور پائلٹوں کو اسے کسی ویرانے میں اتارنا پڑے۔ آہ کیا پرلطف بات ہو۔ کہانی تو آسانی سے شروع ہو سکتی ہے۔

اور کہانی شروع ہو گئی۔ اتنے بڑے بوئنگ کو ایسے شدید جھٹکے لگنا کسی بہت بڑے خطرے کی نشانی تھی۔ افراتفری مچ گئی۔ جہاز کے شیشوں سے ایک خوفناک طوفان کے

آثار نظر آنے لگے۔ چاروں طرف بجلیاں کوند رہی تھیں اور ماحول بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔ پائلٹ کیبن میں پائلٹ قسمت کی آزمائش میں مبتلا تھے۔ وہ طوفان کی شدت سے خوفزدہ تھے اور ماہرانہ تدبیریں کر رہے تھے لیکن جہاز پر ہواؤں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بجلیاں جہاز سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

''جہاز کو بلندی پر لے جانا خطرناک ہو گا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر' ہمیں بلندی کم کر دینی چاہئے۔''

''چلو۔!''

اور جہاز کو نیچے لے جایا جانے لگا۔ اس خوفناک طوفان میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب جہاز کسی بلند چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ یہ خطرہ موجود تھا۔ بجلیوں کی تیز روشنیوں سے کبھی کبھی ماحول روشن ہو جاتا تھا' اور بلند پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آنے لگتا تھا۔ لیکن اوپر بھی موت تھی اور نیچے بھی۔ فیصلہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ کون سی موت ان کا مقدر بنے گی۔

اور پھر جہاز کو ایک خوفناک جھٹکا لگا اور پائلٹ ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔ انہوں نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا لیکن پائلٹ کیبن کو کافی نقصان پہنچ گیا تھا۔ بے شمار ڈائل ٹوٹ گئے تھے۔ شیشے کے ٹکڑے پورے کیبن میں بکھر گئے تھے۔ سمت نما بالکل ناکارہ ہو گیا تھا اور یہ تباہی بجلی کی زبان نے مچائی تھی جو کسی طرح برق شکن کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

مسافروں میں چیخ و پکار مچ گئی اور ہوسٹس حتی المقدور انہیں پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اب موت سامنے تھی۔ لوگ سب کچھ بھول گئے تھے اور وحشت زدہ ہو کر شیشوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔

پائلٹوں نے سنبھل کر ڈگمگاتے جہاز کو سنبھالا۔ اس کے دو انجن ناکارہ ہو گئے تھے اور یہ صرف ایک حملے میں ہوا تھا۔ طوفان نجانے کب تک رہے گا۔ ابھی تو ابتداء تھی۔ پائلٹ اس بات کو محسوس کر رہے تھے۔

''شہریار!'' خرم شاہ نے لرزتی آواز میں پکارا اور نوجوان شہریار اسے دیکھنے لگا۔

''حالات ضرورت سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ جہاز کے مسافروں کو اب زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ کیوں نہ ان لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دیا جائے۔''

''نہیں مسٹر خرم شاہ' میں اس کے خلاف ہوں اگر موت مقدر ہے تو ان لوگوں کو موت سے قبل اس کا خوف کیوں دلایا جائے۔ کیا آپ لوگ حالات سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں؟'' تھرڈ پائلٹ فیروز نے کہا۔

''ہاں! حالات اب ہمارے کنٹرول سے باہر ہو چکے ہیں۔ اب تو ہم کسی سمت کا بھی اندازہ نہیں کر سکتے۔ نہ جانے ہم کہاں ہیں۔ جہاز کا رخ کس طرف ہے۔''

''گویا موت بالکل قریب ہے؟'' فیروز نے دیوانگی بھرے لہجے میں پوچھا اور دوسرے لوگ اس قوی ہیکل نوجوان کو دیکھنے لگے جو خاموش طبع اور متین تھا لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

''ہاں۔ موت قریب ہے فیروز۔ لیکن اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ حواس کھو دیئے جائیں۔ آخر ایک دن سب کو مرنا ہے۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''آپ کا خیال غلط ہے جناب۔'' فیروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میری خواہش ہے کہ جہاز کو ایک ناکارہ چیز سمجھ کر میرے حوالے کر دیا جائے۔ موت نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ ہم اس سے بھرپور مقابلہ کر کے خود کو اس کے حوالے کریں گے۔''

''اوہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے تو ہم تم سے تعاون کریں گے۔''

''آپ میرے خیال کو دیوانگی کہیں گے۔ میں جو کچھ کروں گا' تجربے اور ہوابازی کے اصولوں کے خلاف ہو گا' اور مجھے یقین ہے کہ اس مشکل میں بھی آپ مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''تم بتاؤ تو ہمیں۔'' خرم شاہ نے کہا اور ایک بار پھر انہیں خود کو سنبھالنا پڑا۔ جہاز کے کسی حصے پر دوبارہ بجلی گری تھی۔ لیکن فیروز نے انہیں کچھ بتانے کی زحمت نہ کی۔ وہ تھراٹل کی طرف بڑھا' اور اس نے اسے انتہائی اوپر تک کر دیا۔ جہاز کا اگلا حصہ آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور اب وہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ بالکل کسی راکٹ کی طرح۔ مسافر کرسیوں

سے چپک گئے تھے۔ ہوسٹسیں جہاز کے آخری حصے میں گر پڑی تھیں اور انہیں کافی چوٹیں آئیں تھیں۔ خود پائلٹ کیبن کے دروازے پر جا گرے تھے۔ اب جہاز ایک کنویں کی طرح تھا جس کی دیواروں میں نصب شدہ کرسیوں میں انسان لٹک رہے تھے۔ اگر مضبوط چمڑے کی پیٹیاں انہیں سنبھالے نہ ہوتیں تو وہ سب جہاز کی دم میں بھرے ہوتے۔

"فیروز۔ تم پاگل ہو گئے ہو' یہ کیا کر رہے ہو' جہاز سیدھا کرو۔" خرم شاہ اپنے اوپر سے دوسرے پائلٹوں کو دھکیلتا ہوا بولا۔

"اگر تم لوگوں میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو اسے قتل کر دوں گا۔" فیروز نے دیوانگی سے کہا۔ وہ جہاز کے تھراٹل سے لٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے جہاز کی رفتار مسلسل تیز کرتا جا رہا تھا۔ پائلٹوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ خود وہ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ سنسنا رہے تھے۔ آنکھوں میں تاریکی پھیلتی جا رہی تھی اور جہاز کسی راکٹ کی طرح آسمان پر سیدھا اٹھ رہا تھا۔ اس وقت اگر بجلی کی کوئی لہر اس کے اوپری حصے کو چوم لیتی تو وہ اس کا آخری بوسہ ہوتا۔ اس کے بعد جہاز کا وجود باقی نہ رہتا۔ لیکن برقی جھکڑوں کے تمام نشانے خالی جا رہے تھے۔ البتہ اگر جہاز سیدھی حالت میں ہوتا تو اب تک ان کے کئی حملے کامیاب ہو چکے ہوتے۔

نہ جانے کتنی بلندی تک وہ اسی طرح اٹھتا رہا۔ مسافروں کے دم گھٹے جا رہے تھے اور پھر فیروز نے دوسری کوشش کی۔ اس نے تمام تھراٹل جھکا دیئے اور ایک بار پھر خوفناک افراتفری مچ گئی۔ بہت سے مسافر زخمی ہو گئے تھے۔ ایک ہوسٹس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ پائلٹ بھی جہاز کے انجن سے ٹکرائے تھے۔ شہریار کا سر پھٹ گیا تھا۔ چنانچہ خرم شاہ اور پیٹر دیوانہ وار فیروز پر جھپٹے۔ انہوں نے اس دیوانے کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن فیروز ان چاروں میں سب سے کم عمر اور سب سے قوی ہیکل تھا۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت بالکل درست نہ تھی۔ اس کے طاقتور گھونسے نے پیٹر کو کئی فٹ اچھال دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے خرم شاہ کی گردن پکڑ لی تھی۔

"میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں مسٹر خرم شاہ۔ براہِ کرم اس وقت صرف وہ ہونے دیجئے جو میں چاہ رہا ہوں۔" اس نے خونخوار لہجے میں کہا اور خرم شاہ نے دونوں

ہاتھ اٹھا دیئے۔ "شکریہ!" فیروز نے اس کی گردن چھوڑ دی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جہاز تیز رفتاری کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ اس کے انجنوں سے شعلے نکلنے لگے لیکن فیروز کو کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ اب وہ جہاز کو نیچے.......... اور نیچے اتار رہا تھا۔ اور چند منٹ کے بعد ان سب نے محسوس کیا کہ طوفان پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ جہاز کا تعاقب کرنے میں ناکام رہا ہے اور یہ احساس جہاں حیران کن تھا وہیں دلوں میں مسرت کی لہریں پیدا کرنے والا تھا کہ انہوں نے طوفان کو شکست دے دی ہے۔ وہ طوفان کے چنگل سے نکل آئے ہیں اور اب طوفان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ زخمی ہونے کے باوجود ان کے دلوں میں نئی امنگیں پیدا ہو گئیں۔ ان کے جسموں میں پھرتی آ گئی۔ انہوں نے ہوش میں آ کے اپنا کام سنبھال لیا لیکن جہاز کی حالت دیکھ کر ان کے ہوش ایک دفعہ پھر گم ہو گئے۔ صرف دو انجن کام کر رہے تھے۔ ایندھن کی مقدار بتانے والی سوئی اب بے جان ہو چکی تھی۔ گویا ایندھن ختم ہو چکا ہے اور جہاز صرف ریزرو میں چل رہا ہے۔ دو انجن تباہ ہو چکے ہیں اور باقی دو انجن بالکل بیکار ہیں۔ وہ کتنی دیر تک ساتھ دیں گے۔

اس خوفناک صورت حال کے بعد سب سے پہلے جس چیز کا جائزہ لینا تھا وہ جہاز کی بلندی تھی۔ خرم شاہ نے بلندی کے آلے کا جائزہ لیا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ جہاز زمین سے صرف پچاس فٹ اوپر تھا۔ معجزہ ہی تھا۔ ہاں، یہ معجزہ تھا کہ ابھی تک جہاز کے پرخچے نہیں اڑے تھے۔ انہوں نے آنکھیں صاف کر کے ونڈ شیلڈ کے دوسری طرف دیکھا۔ تاحد نگاہ سفید میدان نظر آ رہے تھے۔

"برف"۔ ان کے ذہن میں تصور ابھرا' وہ کسی برفانی علاقے میں ہیں۔ مگر کیا ان برف کے میدانوں میں طیارہ بحفاظت اتر سکے گا۔ اگر اتر نہ سکا تو گر پڑے گا۔ خرم شاہ کو خود ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ دیر کرنا موت کو قریب تر لانا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی نرمی سے فیروز پر اپنا مافی الضمیر واضح کر دیا اور فیروز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کا مشورہ درست ہے مسٹر خرم شاہ۔ یہ لیجئے۔" اس نے طیارے کو پھر خوفناک انداز میں نیچے جھکا لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی انجن بند کر دیئے۔ طیارے نے برف سے ایک خوفناک رگڑ کھائی اور برف کے سفید ذرات کا بادل بلند ہو گیا۔ ونڈ شیلڈ

ڈھک گئی اور پھر طیارہ حیرت انگیز طور پر رک گیا۔ نہ جانے کیسے۔؟ بہر حال رک گیا تھا۔

خرم شاہ نے ایک گہری سانس لی۔ وہ فیروز کی بے مثال جرأت پر دنگ تھا۔ درحقیقت اس وقت فیروز جیسا آدمی ہی اس بے دردی سے طیارے کو زمین پر دے مار سکتا تھا۔ اگر وہ احتیاط سے اسے نیچے اتارنے کی کوشش کرتے تو اتنی آسانی سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور ممکن تھا طیارہ ضائع ہو جاتا۔ اس وقت اندھے اقدامات کی ہی ضرورت تھی۔

وہ سب دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ ونڈ شیلڈ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے پہلے مسافروں کی خبر لینی تھی۔ چنانچہ وہ چاروں ہمت کر کے اٹھے اور پائلٹ کیبن کا دروازہ کھول کر دوسری طرف نکل آئے۔ مسافروں پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ زخمی ہوسٹسیں بے ہوش پڑی تھیں۔ بہت سے مسافروں کے جسموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان میں سے اکثر کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئے تھے۔ بہت سوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ حواس کھو بیٹھے تھے اور ان پر سکتہ طاری تھا۔

''ہماری طرف سے زندہ بچ جانے پر مبارک باد قبول کریں۔ طیارے کو نیچے اتار لیا گیا ہے۔'' خرم شاہ نے ان لوگوں کی ناگفتہ بہ حالت کو تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا اور بہت سے بے جان جسموں میں زندگی دوڑ گئی۔

''ہاں۔ بچ گئے۔ بچ گئے ہم۔ بچ گئے۔'' کئی آوازیں ابھریں اور دوسرے لوگ بھی چونک پڑے اور پھر انہوں نے دیوانہ وار سیٹ بیلٹس کھول دیں۔ قہقہے لگانے لگے، ناچنے لگے۔ ان سب کے اعصاب کشیدہ تھے لیکن اب بھی بہت سے لوگ اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔

''تم ائرہوسٹسوں کو دیکھو۔ وہ بے چاریاں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے سب سے زیادہ مصیبت کا شکار رہی ہیں۔'' خرم شاہ نے تینوں پائلٹوں سے کہا اور ان تینوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ انہوں نے ائرہوسٹسوں کو باری باری اٹھا کر ایک جگہ لٹا دیا۔ دو

ائرہوسٹسیں زندگی کھو بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ دوسری کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی لاشوں کو ڈھک دیا گیا اور وہ دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگے۔

پھر خرم شاہ نے مسافروں سے اپیل کی۔ ''ہمارے پاس فرسٹ ایڈ کا کافی سامان موجود ہے۔ براہ کرم آپ میں سے جو حضرات ڈاکٹر ہوں یا ابتدائی طبی امداد سے واقفیت رکھتے ہوں، وہ رضا کارانہ طور پر دوسروں کی مدد کریں۔'' اور اس کی اپیل پر بہت سے لوگ تیار ہو گئے۔ انہوں نے خرم شاہ کی بتائی ہوئی جگہ سے فرسٹ ایڈ کا سامان حاصل کیا اور زخمی مسافروں کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ خرم شاہ اور اس کے ساتھی بھی تیزی سے مصروف عمل تھے۔ ابھی تک انہوں نے اس جگہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی جہاں طیارہ اترا تھا۔ بہر حال وہ بعد کی بات تھی۔ پہلے مسافروں کی مکمل خبر گیری ضروری تھی۔ یہ بہت ضروری کام تھا۔ جہاز کے مسافر پوری تندہی سے تعاون کر رہے تھے۔ معمولی زخم والوں نے اپنے زخموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسروں کی مرہم پٹی پر زیادہ توجہ دی تھی اور سب کے تعاون سے وہ بہت جلد حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن پورے مسافروں کے سروے سے چند المناک انکشافات بھی ہوئے تھے۔ مسافروں میں سے تینتالیس افراد حرکتِ قلب بند ہونے سے ہلاک ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں اور چند کمزور دل کے مرد بھی تھے۔ دو ائرہوسٹسیں ہلاک ہوئی تھیں۔ اس طرح مرنے والوں کی تعداد پینتالیس تھی اور بہر حال یہ ایک بڑی تعداد تھی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ باقی لوگوں کا بچ جانا ہی معجزہ تھا۔

لاشوں کو جہاز کے آخری حصے میں پہنچا دیا گیا۔ سیٹیں کھول دی گئیں۔ چند ائرہوسٹسیں ہوش میں آ گئی تھیں۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے اپنے فرائض سنبھال لئے۔ کچن میں گرم کافی تیار ہونے لگی اور پھر وہ مسافروں میں تقسیم کر دی گئی۔ اس کے بعد خرم شاہ، فیروز اور دوسرے دونوں پائلٹ طیارے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ جام ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک کوشش کرنے کے بعد بھی وہ ناکام رہے تو انہوں نے مسافروں کو مدد کے لئے طلب کیا اور سب

مل کر کوشش کرنے لگے۔ لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر خرم شاہ کو ہی کچھ خیال آیا۔ اس نے سیٹوں کے برابر والے شیشوں سے دوسری طرف جھانکا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ شیشوں کے دوسری طرف برف اٹی ہوئی تھی اور جس انداز میں برف نظر آ رہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ طیارہ کافی حد تک برف میں دھنسا ہوا ہے۔

''پیٹر!'' اس نے ایک پائلٹ کو آواز دی اور پیٹر جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''ونڈ شیلڈ کے وائپر چلا کر اسے صاف کرو۔ میں ایک اور خطرے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''بہت بہتر!'' پیٹر نے خطرے کی وضاحت طلب نہیں کی اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے پائلٹ روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے وائپر چلانے کی کوشش کی لیکن وائپر کامیاب نہ ہو سکے۔ ونڈ شیلڈ پر بھی برف کی موٹی تہہ تھی جسے طاقتور وائپر صاف نہ کر سکے۔ تب اس نے واپس آ کر خرم شاہ کو اس کے بارے میں بتایا۔

''ہوں!'' خرم شاہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر وہ فیروز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''فیروز، میرا اندازہ ہے کہ طیارہ برف کی کسی پہاڑی میں گھس گیا ہے۔ میں اس کے اس طرح رک جانے کی وجہ سوچ رہا تھا جواب معلوم ہوئی۔ گویا یوں سمجھو کہ ہم برف کی قبر میں دفن ہیں اور اس خطرناک صورتحال کے بھیانک نتائج کا اندازہ تم بخوبی لگا سکتے ہو۔ آکسیجن زیادہ دیر تک ساتھ نہ دے سکے گی اور اس کے بعد پھر وہی بے بسی کی موت!''

فیروز کے چہرے پر گہرے غور و تفکر کے آثار پیدا ہو گئے۔ پھر اس نے کہا۔ ''ہم نے انتہائی حد تک اپنے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن صرف ہم لوگ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے زندگی بچانے کے لئے جہاز کے مسافروں کو ہماری مدد کرنا ہوگی۔ میرا خیال ہے اب صورت حال مختلف ہے۔ ہم ان سے صاف کہہ دیتے ہیں کہ انہیں ہمارے ساتھ انتھک محنت کرنا ہوگی۔''

''میرا خیال ہے یہ لوگ انکار نہیں کریں گے۔ لیکن کیا کیا جائے؟''

''یہ سب کچھ آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ ہاں ایک بات اور عرض کروں گا۔ وہ یہ

کہ ان حالات میں طیارے کے یہاں سے نکلنے اور اس کی درستگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انجن جل چکے ہیں اور ایندھن ختم ہو گیا ہے۔ البتہ ہمارے وائرلیس کام کر سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم امدادی پارٹیوں کو طلب کریں گے لیکن اس وقت جب ہمیں کھلی ہوا میں پہنچنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔''

''لیکن پروگرام کیا ہے فیروز؟''

''ہم برف میں سرنگ بنائیں گے۔ جو ہمیں باہر تک پہنچا دے اور اس کے لئے ہمیں یہ سیٹیں توڑ کر ان کے پائے وغیرہ نکالنے پڑیں گے جن سے برف کھودی جا سکے۔'' فیروز نے کہا اور خرم شاہ گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''بلاشبہ، قدرت نے تمہیں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ میں تمہارے اس کارنامے کی تعریف تفصیل سے اور فرصت کے وقت کروں گا جو تم نے طیارے کو طوفان سے نکال کر انجام دیا ہے۔ فی الحال ہم زندگی تو بچا لیں۔'' اور پھر وہ مسافروں کے درمیان کھڑے ہو کر بولا۔ ''دوستو! پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی میں ہم نے زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو کچھ کیا ہے' وہ آپ کے سامنے ہے۔ میں اس طیارے کا فرسٹ پائلٹ ہوں لیکن مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی ہے کہ میں آپ لوگوں کی اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ خوفناک طوفان نے ہمیں چاروں طرف جکڑ لیا تھا۔ عقل ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اعضاء مفلوج ہو گئے تھے۔ آپ اس خوفناک صورتحال کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ہمیں درپیش تھی۔ کیونکہ آپ کو اصل بات بتانے سے گریز کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ ہم ہمت ہار بیٹھے تھے اور موت لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرے نوجوان دوست نے اپنے خون کی گرمی کو استعمال کیا۔ اس نے ایک بہادر نوجوان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے موت کے چیلنج کو قبول کیا' اور درحقیقت ہوا بازی کی دنیا کو اگر کبھی اس کارنامے کو جاننے کا موقع ملا تو میرا دوست فیروز دنیا بھر کے ہوا بازوں کا ہیرو ہو گا! اس نے ایک ایسا ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا جسے عقل کبھی تسلیم نہیں کرتی۔ خدا کی مدد شامل رہی اور طیارہ نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتھیو، طیارے کے دو انجن تباہ ہو چکے ہیں۔ ایندھن قطعی ختم ہو گیا ہے اور اس وقت یہ طیارہ ہمارے لئے صرف ایک سر

چھپانے کی جگہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے فرائض صرف اسی وقت تک لاگو ہیں جب تک ہم قدرت کے آگے ہاتھوں بے بس نہ ہو جائیں اور ہم اس دور سے کہیں آگے نکل آئے ہیں۔ چنانچہ میری درخواست ہے کہ آپ ہمیں اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار نہ سمجھیں۔ ہم میں سے کسی کی غلطی سے یہ حادثہ پیش نہیں آیا۔ اب ایسی صورت میں جبکہ ہم ایک قدرتی آفت کا شکار ہو کر کسی نامعلوم جگہ آ پڑے ہیں۔ تو ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی بچانے کے لئے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر دے۔ اجتماعی جدوجہد ہماری زندگیاں بچا سکتی ہے۔ میں آپ سے حقیقت حال نہیں چھپاؤں گا! طیارے کے ناکارہ انجن کسی نہ کسی طرح اسے نیچے تو لے آئے! لیکن وہ اسے روکنے میں ناکام رہے اور زمین پر اترنے کے بعد طیارے کے خود بخود رک جانے کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ لیکن دروازہ کھولنے کی کوشش اور دوسرے حالات کا جائزہ لینے کے بعد انکشاف ہوا ہے کہ طیارہ برف کے کسی تودے میں گھس گیا ہے۔ یہی اس کے رک جانے کی وجہ تھی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ برف کا یہ تودہ کتنا طویل و عریض ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، ہمیں نکلنے کی جدوجہد تو کرنا ہی ہے۔ کیونکہ بہت تھوڑے وقت کے بعد ہم آکسیجن کی کمی کا شکار ہو جائیں گے اور یہ طیارہ ہماری قبر بن جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ہر معاملے میں ایک دوسرے کی مدد کریں' میں آپ میں سے ہر ایک کی رائے قبول کروں گا۔ کیونکہ مسئلہ اب ہم سب کے لئے یکساں ہے۔ میری رائے ہے کہ ہم سب جو کچھ بھی ہاتھ لگے اسے لے کر برف میں سوراخ کریں اور بالآخر اس کے اختتام پہنچ جائیں' کیا آپ لوگ ہماری مدد کریں گے؟''

عورتوں کے علاوہ تقریباً تمام ہی مسافر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔ ان سب نے خرم شاہ کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا اور خرم شاہ خوش ہو گیا۔

''زندگی میں بہت سے مرحلے آتے ہیں دوستو' کچھ لوگ ایڈونچر کی زندگی پسند کرتے ہیں لیکن ان کی مصروفیات انہیں اجازت نہیں دیتیں۔ اب غیر متوقع طور پر اس کا موقع مل گیا ہے۔ کل جب آپ اپنے مکانوں کے ڈرائنگ رومز میں، یا خواب گاہ میں

بیٹھ کر اپنے بچوں اور دوستوں کو اس خوفناک سفر کی کہانی سنائیں گے تو آپ کو ایک عظیم مسرت کا احساس ہوگا! آیئے۔ زندگی کی جدوجہد کی ابتداء کریں۔'' خرم شاہ نے کہا اور پھر وہ سب سیٹیں اکھاڑنے لگے۔ سب ہی کے چہروں سے خوف دور ہو گیا تھا۔

جو لوگ زخمی تھے اور ان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ انہوں نے معذرت کی تو خرم شاہ نے کہا۔ ''ہم آپ کو بھی اپنے شانہ بشانہ محسوس کر رہے ہیں۔ آج آپ زخمی ہیں تو ہم آپ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کل ہم بھی زخمی ہو سکتے ہیں، اس وقت آپ ہماری مدد کریں۔''

خرم شاہ کا خیال تھا کہ سب پہلے دروازے کو اندر سے اکھاڑ لیا جائے اور اس کے بعد برف میں سرنگ کی کھدائی شروع کی جائے' لیکن فیروز نے ایک بار پھر ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''طیارے کی دائیں بائیں سمت غیر یقینی ہے۔ نہ جانے اس تودے کی چوڑائی کتنی ہو۔ اس کے برعکس اس کے سامنے کی سمت زیادہ موزوں ہے کیونکہ بہر حال اس طرف برف اتنی نرم تھی کہ طیارے کو داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ اس لیے ونڈ شیلڈ توڑ کر سامنے کے رخ پر کھدائی موزوں رہے گی۔''

''مناسب خیال ہے۔'' خرم شاہ نے اس سے اتفاق کیا اور نو جوانوں کی ٹیم ان لوگوں کی قیادت میں پائلٹ روم میں داخل ہو گئی۔ ان سب کے ہاتھوں طیارے کی کرسیوں کا لوہا اور دوسری چیزیں تھیں۔ ونڈ شیلڈ پر ضربیں لگائی جانے لگیں اور چند منٹ کے بعد مضبوط ونڈ شیلڈ چکنا چور ہو گئی۔ انہوں نے شیشے کے ٹکڑے صاف کئے اور پھر فیروز، خرم شاہ، پیٹر اور شہر یار اوزاروں سے برف میں سوراخ کرنے لگے۔ اگر برف کے بجائے مٹی ہوتی تو انہیں ایک مشکل یہ پیش آ سکتی تھی کہ وہ کھودی ہوئی مٹی کو کہاں لے جاتے۔ ظاہر ہے اسے طیارے میں بھرنا تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن برف میں دب جانے کی خاصیت ہوتی ہے۔ اس چیز کو انہوں نے مدنظر رکھا تھا۔ گویا اتنا بڑا سوراخ کیا جا رہا تھا جس کی برف سوراخ کی دیواروں میں دب کر ٹھوس ہو جائے۔ یہ ترکیب انتہائی کارآمد رہی۔ برف کی کھدائی میں بھی زیادہ مشکلات نہیں پیش آ رہی تھیں کیونکہ وہ زیادہ سخت نہیں تھی۔ دوسرے لوگ اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ پھر تقریباً پانچ فٹ کی کھدائی کے بعد

ایک دوسری ٹیم مصروف ہوگئی اور یہ لوگ بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ اس طرح چار چار آدمیوں کی ٹولیاں کھدائی میں مصروف رہیں۔ کام تیزی سے جاری تھا۔ وہ لوگ پوری دلچسپی سے اس میں حصہ لے رہے تھے اور اجتماعی جدوجہد کے کامیاب نہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر پارٹی ناپ ناپ کر پانچ فٹ کھدائی کر رہی تھی۔ اس طرح جب آٹھویں پارٹی کی باری آئی تو اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔

انہوں نے ابھی پانچ فٹ کھدائی پوری بھی نہیں کی تھی کہ ان کی کدال برف کی دیوار کے پار نکل گئی۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا ان کے چہروں سے ٹکرایا اور ان کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکل گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی اس سوراخ کو چوڑا کیا اور پھر برف کے دوسری طرف نکل گئے۔ اس طرح انہوں نے برف میں تقریباً چالیس فٹ لمبی سرنگ بنا کر باہر نکلنے کا راستہ تیار کر لیا۔ ذرا سی دیر میں دوسرے لوگوں کو اس کی خبر کر دی گئی اور تھوڑی دیر میں جہاز کے بہت سے مسافر باہر آ گئے۔ ان میں خرم شاہ اور اس کے ساتھی بھی تھے۔

لیکن باہر کا منظر عجیب تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، برف کے میدان نظر آ رہے تھے۔ ان میدانوں میں درخت بھی تھے لیکن برف سے ڈھکے ہوئے۔ اونچے نیچے برف کے تودے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ان کے بائیں سمت تقریباً چار پانچ فرلانگ کے بعد خوفناک ڈھلان پھیلے ہوئے تھے۔ گو یہ ڈھلان بھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی گہرائی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ زمین سے ہزاروں فٹ بلند کسی مقام پر ہیں۔ گویا اس طویل و عریض میدان کے اختتام پر بھی ڈھلان ہوں گے اور جغرافیائی اعتبار سے ان ڈھلانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ جانے کہاں وہ خوفناک کھڈوں سے پر ہوں جن میں گرنے کے بعد زندگی کا تصور بھی حماقت ہوگا۔!

دوسرے لوگ اس خوبصورت منظر کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے لیکن خرم شاہ اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

''بہر حال، ایک مرحلہ طے ہو گیا۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ پلان بھی ہمارے لئے

سود مند نہیں ہے۔ اگر ہم امدادی پارٹیوں کو اس طرف متوجہ نہ کر سکے تو یہاں سے نکلنا آسان کام نہ ہوگا' لیکن زندگی کی آخری سانس تک جدوجہد ضروری ہے۔ کیا تمہیں صورت حال کی خوفناکی کا احساس ہے شہریار؟''

''کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے تمام جہاندیدہ لوگ اسے محسوس کر رہے ہوں گے۔''

''ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں یہاں کب تک رکنا پڑے بہرحال اس کے لئے ضروری انتظامات کرنے ہوں گے مثلاً خوراک اور دوسری چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کی جائے۔ ظاہر ہے ہمارے پاس خوراک کا بندوبست تو ہے نہیں۔ اب صرف امدادی پارٹیوں کی آس ہے۔ اگر وہ یہاں تک پہنچ گئیں تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ زندگی بڑے مشکل مرحلے میں داخل ہو جائے گی؟''

''اب کیا حکم ہے جناب؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''ابتدائی انتظامات۔ میرا خیال ہے طیارے کی گمشدگی کی اطلاع سب کو مل گئی ہو گی، اور امدادی پارٹیاں بہت جلد روانہ ہو جائیں گی۔ اس لیے سب سے پہلے جہاز کے تمام مسافروں سے رنگین کپڑے لے لو اور ان کے فلیگ بنا کر پوری چوٹی پر پھیلا دو۔ پہلے یہ کام کر لو۔ اس کے بعد ہم باہر جا کر وائرلیس کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں گے! بلکہ پیٹر اور فیروز دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر یہ کام سنبھال لیں۔ ہم کسی بلند جگہ پر وائرلیس اسٹیشن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہاں سے قریبی ممالک سے رابطہ قائم کیا جائے۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''مناسب۔ ویسے کیا اس علاقے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہیں مسٹر خرم شاہ؟''

''بہت مشکل ہے۔ اور اگر کر بھی لیں وہ فی الحال ہمارے لیے سود مند نہیں ہے۔ اس سے فائدہ بھی کیا ہوگا!''

''ہاں۔ یہ تو درست ہے بہرحال ہم اپنے مشن پر چلتے ہیں۔ آپ اپنے کام کو تکمیل تک پہنچائیں۔'' فیروز نے کہا اور وہ واپس سرنگ میں داخل ہو گئے۔



دنیا کے نہ جانے کون سے غیر آباد اور ویران خطے میں یہ آبادی ہوگئی تھی۔ انسانی زندگی جدوجہد میں مصروف تھی۔ ذہانتیں ابھر آئی تھیں۔ نوجوانوں نے اپنے اپنے کام بانٹ لئے تھے۔ یہ سب عیش وعشرت کے رسیا تھے۔ ان کی صلاحیتیں اطلس وکمخواب میں لپٹی ہوئی گہری نیند سو رہی تھیں لیکن زندگی کے اس نازک موڑ پر وہ جاگ اٹھے تھے اور وہ سب کچھ کر رہے تھے جو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

برف کی تقریباً تمام بلند چوٹیوں پر رنگین کپڑے لہرا رہے تھے۔ انہیں اونچی اونچی راڈوں میں باندھ دیا گیا تھا۔ جہاز سے ہر وہ چیز نکال لی گئی تھی جو اس سلسلے میں کام آ سکتی تھی۔ فیروز درحقیقت بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مالک ثابت ہوا تھا۔ اس سے قبل بھی اس کے ساتھیوں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا لیکن اس وقت اس کی جو صلاحیتیں سامنے آئی تھیں، وہ حیرت انگیز تھیں۔ اس نے جہاز کے فرنیچر سے لکڑیاں نکالی تھیں اور ان لکڑیوں کے اس نے اسکیٹنگ شوز بنائے تھے اور پھر دو راڈوں کی مدد سے سب سے پہلے اس نے ان اسکیٹنگ شوز کا تجربہ کیا تھا اور اس تجربے کی شاندار کامیابی سے نوجوانوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

وہ جو برف پر اسکیٹنگ کے ایکسپرٹ تھے' برف کے میدان پر پھسلتے پھر رہے تھے۔ برف کا طویل اور دشوار گزار سفر اب ان کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے میدان کے قرب وجوار کے تمام علاقے کی سیر کر لی تھی۔ ہاں دور دراز کے علاقے ابھی باقی تھے اور اس طرف کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا! دوسری طرف خرم شاہ اور شہریار چند نوجوانوں کے ساتھ وائرلیس کا تمام سامان لے کر ایک بلند تودے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس پر وائرلیس اسٹیشن بنا چکے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس وقت برف کا طوفان آ جائے اور برف باری ہونے لگے۔ اس لیے انہوں نے اسٹیشن پر چھت کا بندوبست بھی کیا تھا۔ کافی بلند اینٹینا باندھا تھا۔ بہرحال جس انداز میں کام ہو رہا تھا' اس سے ان لوگوں میں زندگی کا پتہ چل رہا تھا اور اگر ایک خوف ناک تصور ان کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ اسے اپنی زندگی کا خوبصورت دور کہہ سکتے تھے۔ ان کے دلوں میں لگن تھی اور وہ کسی کام میں تھکن محسوس نہیں کر رہے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اگر ان سب کے ذہنوں

پر وہ خوفناک تصور نہ ہوتا تب شاید ان میں سے ایک بھی اس جذبے اور اس لگن سے کام نہ کرتا۔ بہرحال ہمدردی اور نیکیوں کے بے شمار مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے اور وقتی طور پر وہ سب مایوسی کے گڑھوں سے نکل آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ بہت جلد وہ یہاں سے واپس جا سکیں گے۔

پھر خرم شاہ نے وائرلیس سے پہلا پیغام نشر کیا۔ اس نے اپنا کوڈ نمبر پوری دنیا کے لیے دہرایا اور اپنی پوزیشن بتانے لگا۔ یہ سلسلہ سورج چھپنے تک جاری رہا لیکن ٹرانسمیٹر پر جوابی پیغام نہیں موصول ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قریب میں کم از کم اس وائرلیس کے حیطہ عمل میں کوئی ایسی آبادی نہیں تھی جو ان پیغامات کو وصول کر سکتی یا اگر تھی تو شاید موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے وہ پیغامات وصول نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال خرم شاہ مایوس نہیں ہوا۔ سورج چھپنے پر اس نے وائرلیس اسٹیشن پر دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی۔ یہ شہریار اور پیٹر تھے۔ باقی تمام لوگ سرنگ کے راستے دفن شدہ جہاز میں آ گئے۔

زخمیوں کی حالت بہتر تھی۔ ائر ہوسٹسیں بے چاری یہاں بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھیں۔ وہ ہلکا کھانا تیار کر رہی تھیں جو تیار ہونے کے بعد مسافروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ شہریار اور پیٹر کو کھانا وائرلیس اسٹیشن پر ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ ویسے رات کے جھکتے ہی باہر کی فضا کافی سرد ہو گئی تھی۔ اس لئے پیٹر اور شہریار کے لئے موٹے لباس کا خاص بندوبست کر دیا گیا۔ اس کے بعد خرم شاہ نے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ "میرے دوستو! کیا ہم اس بات پر فخر نہ کریں کہ اس قدرتی حادثے سے نمٹنے کے لئے ہم نے جس اتحاد کا ثبوت دیا ہے، وہ لافانی ہے۔ ہم نے چند گھنٹوں میں اپنی بقاء کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ ناقابل شکست ہے۔ ہم میں سے ہر فرد نے اپنی ذہانت کا بھرپور استعمال کیا ہے اور اب ہم سب اس وقت تک ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، جب تک امدادی پارٹیاں یہاں نہیں پہنچ جاتیں۔ اس کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں بھی اس سفر کو نہ بھول سکیں گے۔ میں کوئی فلاسفر نہیں ہوں، ایک سیدھا سادہ انسان ہوں اور دانشوروں کے چند اقوال سے واقف ہوں جنہیں آپ کے سامنے دہرانا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں سانس کی آمدورفت

جدوجہد کی دوسری شکل ہے۔ ہماری زندگی ہمیں درسِ عمل دیتی ہے اور یہی عمل ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ جس طرح ایک جوہری سونے کا زیور تیار کرکے اس میں رنگین نگینوں کی گلکاری کرتا ہے، اسی طرح زندگی کا حسن حادثات سے نکھرتا ہے۔ یہ حادثے زندگی میں جڑے ہوئے نگینے ہوتے ہیں جن کی چمک انسان کو تروتازہ رکھتی ہے۔ بعض اوقات یہ حادثے ہمیں پستیوں میں بھی پہنچا دیتے ہیں اور بعض اوقات یہی ہماری زندگی کا عروج ہوتے ہیں۔ میں اپنی گفتگو طویل نہیں کرنا چاہتا، صرف چند باتیں عرض کروں گا۔ میں نے وائرلیس پر دن بھر کوشش کی ہے لیکن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر ہمارا کسی کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے امدادی پارٹیاں، ایک ہفتہ، ایک ماہ، ایک سال تک یہاں نہ پہنچ سکیں۔ ممکن ہے ہمارا کسی جگہ سے رابطہ قائم نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں کیا ہم خودکشی کرلیں گے؟ میرا خیال ہے یہ انسان کی توہین ہوگی اور اس طرح جان دینے والے سکون سے مر بھی نہ سکیں گے۔ ہمیں اس وقت تک جدوجہد کرنا ہوگی جب تک ہم اپنی منزل پر نہ پہنچ جائیں یا جان نہ دے دیں۔ ہم مرنے کی کوشش کرنے کے بجائے زندہ رہنے کی کوشش کریں گے اور اگر اس کوشش میں موت آجائے تو میرے خیال میں وہ زندگی کی صحیح منزل ہوگی۔ میں آپ کو مایوسی کا سبق نہیں دے رہا، آپ لوگ خود ذہین ہیں، خودمختار ہیں۔ ہمیں ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا' میں تو صرف جہاز چلانا جانتا ہوں۔ ان حالات سے نپٹنے کے لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی' میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک طویل جدوجہد کا بندوبست کریں۔ اس برف پر زندگی گزارنے کے بارے میں سوچیں۔ یہ ہماری قسمت ہے کہ ہم کل ہی یہاں سے خوش وخرم روانہ ہو جائیں اور اگر نہ ہو سکیں تو مایوسی کا شکار نہ ہوں' بلکہ یہاں وقت گزارنے کے لیے ہمارے پاس تمام ذرائع ہوں۔ آپ میرا مقصد سمجھ رہے ہیں؟''

''ہاں مسٹر خرم شاہ! آپ کی گفتگو حقیقت سے قریب ہے!'' ایک معمر شخص نے کہا۔

''یہاں کوئی کسی کو گائیڈ نہیں کرے گا! کوئی کسی پر مسلط نہیں ہوگا! ہر فرد کو آزادی ہے کہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کی لیے سوچے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرے۔''

''مناسب مشورہ ہے۔!''

''جہاز میں جو کچھ موجود ہے اب وہ صرف ہم سب کی بھلائی کے لیے ہے۔ میں اس پر اپنا یا اپنی کمپنی کا حق نہیں سمجھتا، اب سب کچھ آپ کا ہے۔ اس کی تفصیل آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں یا خود دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اس کے حقدار ہیں۔ ہاں میں اتنا عرض کر دوں کہ ہمارے پاس مختصر ترین سامان ہے۔ جو شاید چند روز کے لیے بھی کافی نہ ہوگا۔ اس برف پر پانی کی کمی نہیں ہے۔ ہم جتنا پانی چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ خوراک کا مسئلہ ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ یہ مسئلہ نوجوانوں کی کسی ٹولی کے سپرد کر دیا جائے۔ انہیں خاص طور سے اسکیٹنگ شوز مہیا کیے جائیں تاکہ وہ دور دور تک نکل کر شکار تلاش کریں اور دوسروں اور اپنے لیے خوراک مہیا کریں۔''

''لیکن کیا آپ کے خیال میں اس برف پر شکار ملنے کی امید ہو سکتی ہے مسٹر خرم شاہ؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ہاں! برفانی پرندوں کے بارے میں، میں نے سنا ہے۔ انہیں شکار کرنے یا دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔'' خرم شاہ نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔'' ایک درمیانی عمر کے جسیم آدمی نے کہا جس کی خوبصورت داڑھی، تندرست و توانا جسم اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

''ضرور فرمائیے مسٹر۔'' خرم شاہ سوالیہ انداز میں خاموش ہوگیا۔

''آپ مجھے ڈاکٹر حیات کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کی کارکردگی کو دل سے سراہتا ہوں' گو بوڑھا ہوں لیکن اس جدوجہد میں جوانوں کی طرح حصہ لینے کو تیار ہوں اور اپنی تمام تر خدمات پیش کرتا ہوں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ برفانی پرندوں کا شکار سخت مشکل کام ہے، اور خاص طور سے ایسی شکل میں جب آپ کے پاس آتشیں ہتھیار نہ ہوں۔ خوش قسمتی سے میں شکاری بھی رہا ہوں۔ اس لیے اس بارے میں جانتا ہوں، البتہ یہاں آپ کو بہترین غذا مل سکتی ہے' جو برف پر زندگی گزارنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی مچھلی ہوتی ہے جسے ''براڈوے'' کہتے ہیں۔ ان

جگہوں پر جہاں مستقلاً برف جمی رہتی ہے' یہ برف کے نیچے رہتی ہے۔ اس کے پاؤں بھی ہوتے ہیں اور برف میں سوراخ کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے پاؤں استعمال کرتی ہے۔ جگہ جگہ سوراخ کر کے مچھلیوں کے غول خوراک کی تلاش میں باہر نکل آتے ہیں بہرصورت، اگر ہم وہ غول تلاش نہ بھی کر سکے تب بھی ایسی جگہوں پر جہاں برف کی سطح نرم ہو، تقریباً چار فٹ گہرا گڑھا کر کے ان مچھلیوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہایت گرم ہوتی ہیں اور ان کا گوشت لذیذ اور ہاضم ہوتا ہے، اور اس علاقے میں یہ مچھلیاں بکثرت مل سکتی ہیں۔ میں ان کی تلاش کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔"

"بلاشبہ آپ کی قیمتی معلومات ہم سب کے لیے زندگی بخش ہیں۔" خرم شاہ نے تعریفی لہجے میں کہا اور دوسرے لوگ بھی ڈاکٹر حیات کو مبارکباد پیش کرنے لگے۔

خاصی رات گئے تک وہ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتے رہے۔ بیشتر لوگ اس مہم کے لیے کارآمد تھے۔ ان سب کے سپرد ان کی ذمہ داریاں کر دی گئیں۔ اس طرح برف کے نیچے اس عجیب وغریب کمین گاہ میں وہ لوگ ایک خاندان کی حیثیت اختیار کر گئے! باہر شاید سردی شدید ہو لیکن اندر اس کا قطعی احساس نہیں تھا، البتہ آدھی رات کے قریب شہریار اور پیٹر واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ سردی ناقابل برداشت ہے۔ اگر وہ پوری رات وہاں رہے تو ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔!

"ٹھیک ہے ہم دن کے وقت اپنا کام جاری رکھیں گے اور رات میں آرام کریں گے۔" خرم شاہ نے کہا اور ان لوگوں کو آرام کا مشورہ دے کر خود بھی ایک گوشے میں لیٹ گیا۔



دس دن' امیدوں اور مایوسیوں کی کہانیاں لئے گذر گئے۔ ہر نیا سورج امیدوں کی روشنی لے کر طلوع ہوتا اور مایوسیوں کی تاریکی میں غرق ہو جاتا۔ رات آہوں اور سسکیوں کی رات ہوتی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلی جاتیں مستقبل پر غور کیا جاتا۔ لوگ لاکھ عزم رکھتے تھے لیکن گزرنے والا وقت انہیں مایوسی کی طرف کھسکا دیتا تھا اور بالآخر بے بسی کی موت کے خیالات ان کے اذہان میں ابھرنے لگتے۔ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ایک

دن ایک قطار میں بنی ہوئی ان سفید قبروں میں ان کی قبریں بھی شامل ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کی قبریں تھیں جو طوفان کے خوف سے ہلاک ہو گئے تھے۔ ابھی تک اس قبر میں کسی نئی قبر کا اضافہ نہیں ہوا تھا لیکن چند بوڑھوں کی حالت کافی خراب تھی۔ وہ سردی کا شکار ہو گئے تھے اور قریب المرگ تھے۔ یہ لوگ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ جہاز کے مسافروں کے لیے ڈاکٹر حیات کا دم بے حد غنیمت تھا۔ یہ دلیر بوڑھا گوناگوں صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے نوجوانوں کی ٹیم کے ساتھ "براڈوے" تلاش کر لی تھی اور اب ہر صبح نوجوانوں کی ایک ٹیم مچھلیوں کی تلاش میں نکل جاتی اور بہرحال اتنی مچھلیاں حاصل کر لاتی کہ وہ زندہ رہ سکتے۔ انہی مچھلیوں کے خون کو ڈاکٹر حیات نے ان بیماروں کو استعمال کرایا تھا، لیکن جن لوگوں کے قویٰ ہی زندگی کی آخری کہانی سنا رہے ہوں، انہیں اس خون سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔

وائرلیس پر بیٹھنے والے اب صرف لکیر پیٹ رہے تھے' ورنہ ان کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا' جیسے ہزاروں میل تک کوئی آبادی نہ ہو۔ وہ دنیا کے ایسے سرے پر ہوں۔ جہاں اب تک انسان کے قدم نہ پہنچ سکے ہوں۔ ان دس دنوں میں انہوں نے آسمان کی انتہائی حدوں سے بھی کسی طیارے کو گذرتے نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا ابھی تک اس علاقے سے ہی ناواقف ہو۔ اسے اس کے وجود کا ہی علم نہ ہو۔

اور یہ صورتِ حال سب محسوس کر رہے تھے' لیکن ابھی ان کے حوصلے پست نہ ہوئے تھے' چند لوگ اب بھی پرعزم تھے اور دوسروں کو بھی زندگی کے راستے دکھانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور انہی کی کوششوں نے ابھی تک سب کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔

گیارہویں صبح دو بوڑھے آدمی جان بحق ہو گئے اور یہ صبح تمام مسافروں کے لیے سخت منحوس تھی۔ سب کے دل کانپ گئے تھے اور ان سب کو اپنا مستقبل نظر آ گیا تھا۔ دونوں بوڑھوں کو بغیر کفن کے دفن کر دیا گیا۔ ان کے جسموں سے لباس بھی اتار لیا گیا تھا تاکہ وہ دوسروں کی زندگی بچانے کے کام آ سکے۔ ظاہر ہے اب ان مردہ جسموں کو لباس کی ضرورت نہیں تھی۔ عورتیں خاص طور سے متاثر تھیں۔ ان کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے تھے۔ ان میں بہت کم تھیں جو طیارے سے باہر نکلتی تھیں' ورنہ وہ زیادہ تر اندر ہی رہتی

تھیں۔

اس دن نو جوان شکار کو بھی نہ گئے' چنانچہ جہاز کے کچن ہی سے ضروریات پوری کی گئیں جو بہر حال خطرناک بات تھی۔



پورا ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا اور اس ڈیڑھ ماہ میں حالات کافی بدل گئے تھے۔ ہر شخص خودمختاری کی زندگی گزار رہا تھا۔ اخلاقیات کے سارے لیکچر بے اثر ہو گئے تھے۔ انسان فطری درندگی پر اتر آیا تھا۔ اب کوئی کسی کے لیے کچھ نہ کرتا' جہاز کی ایک ایک چیز ختم ہو گئی تھی۔ اب خود شکار کرو، خود کھاؤ پر عمل ہو رہا تھا۔ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں مزید تیس آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے بھوک کے شکار ہوئے تھے اور بہت سے سردی کے۔ خاص طور سے عورتوں کی مٹی پلید ہو گئی تھی۔ وہ بے چاریاں محفوظ تھیں جن کے ساتھ مرد تھے' ورنہ باقی صرف رحم دلوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ جہاز کے چاروں پائلٹ لاوارث عورتوں کے ہمدرد تھے' وہ خود بھوکے رہ کر انہیں کھلاتے تھے۔ لیکن کب تک! مسلسل فاقوں نے انہیں بھی لاغر کر دیا تھا اور وہ صحیح طور سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت کوئی نہ تھا جو دوسروں کے لیے سوچے۔ جو سوچنا بھی چاہتے تھے وہ دوسروں کے رویے سے بد دل ہو گئے تھے۔ اگر کوئی اس سلسلے میں نو جوانوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو دوسرے اس کا مذاق اڑاتے یا اس جگہ سے اٹھ کر چلے جاتے۔ سب کے سب انسانیت سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اب چھوٹے چھوٹے حادثے بھی ہونے لگے تھے۔

وہ سرمئی شام تھی۔ سفید برف پر سرمئی آسمان کے سائے پڑ رہے تھے اور فضا بے حد حسین ہو گئی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے لیے اب موسم سے لطف اندوز ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سب تو زندگی کے لیے ترس رہے تھے۔ موسم کا حسن تو فرصت کی باتیں تھیں بہت سے لوگ مچھلیوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ گو یہاں مچھلیوں کی بہتات تھی' لیکن جگہ جگہ انہیں نقصان پہنچا تھا اس لیے مچھلیاں بھی اب محتاط ہو گئی تھیں' وہ کھلے ہوئے علاقوں میں پھرنے سے گریز کرتیں۔ اس لئے بہت سے ناتجربے کار لوگوں کو بھوکے ہی رہنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر حیات اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس وقت طیارے سے کافی دور ایک برفانی ٹیلے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک نوکدار آلہ تھا جس سے وہ برف کھود رہا تھا۔ گرم لباس میں دونوں لڑکیاں اداس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر چونکہ اس سلسلے میں کافی تجربے کار تھا اس لئے کسی بھی دن اسے اور اس کی بچیوں کو بھوکا نہیں مرنا پڑا تھا۔ بلکہ دوسری کچھ لاوارث عورتیں بھی اس کی کاوشوں پر انحصار کرتی تھیں۔

اس وقت بھی اس نے ایک ایسی ہی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو دوسروں کی نگاہوں میں بیکار تھی' لیکن ڈاکٹر کو یقین تھا کہ مچھلیوں نے یہ جگہ محفوظ خیال کی ہو گی اور یہاں ضرور موجود ہوں گی۔ گڑھے کے کنارے برف کا کافی ڈھیر جمع ہو گیا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد پانی نکل آیا۔ ڈاکٹر نے پیشانی سے پسینہ خشک کیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں پانی کا جائزہ لے رہی تھیں' دفعتاً وہ جھپٹا' اور دوسرے لمحے اس نے ایک مچھلی کو پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ انیلا کے پاس شکاری چاقو تھا' اس نے جلدی سے مچھلی کی گردن علیحدہ کر دی' حالانکہ یہاں آنے سے قبل وہ بے حد نفاست پسند اور الٹرا ماڈرن لڑکی تھی' اس نے اپنی زندگی میں شاید مچھر بھی نہ مارا ہو' لیکن اب مچھلیوں کو وہی صاف کرتی تھی اور ان کے گوشت کے قتلے بناتی تھی۔

ڈاکٹر مچھلی اس کے حوالے کر کے دوسری مچھلی تلاش کرنے لگا اور پھر اس نے دوسری مچھلی بھی پکڑ لی۔ اس کے بعد وہ تیسری مچھلی تلاش کر رہا تھا کہ ٹیلے کی دوسری سمت سے قدموں کی آواز سنائی دی اور ڈاکٹر گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ آنے والا جوہن آٹرے تھا۔ چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں اور موٹی گردن والا جوہن آٹرے جو ہالینڈ کے ایک کلب میں ورزش کراتا تھا۔ اس کا جسم بے حد تنومند تھا۔ دائیں گال پر چاقو کے زخم کا گہرا نشان تھا جو اس کی شخصیت کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر۔" اس نے طنزیہ سے انداز میں کہا اور پھر دونوں لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

"ہیلو!" ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"خوب خوب۔ تم نے خوراک کا بندوبست کر لیا ہے' نہ جانے ان مچھلیوں کو ہم سے کیا بیر ہو گیا ہے۔ صبح سے مصروف ہوں ایک بھی ہاتھ نہیں لگی!"

"مجھے ایک مچھلی اور چاہیے۔ اس کے بعد یہ گڑھا تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں ڈاکٹر کہ اب خود کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں نے بھی سوچا کہ کیوں نہ دوسروں کی محنت پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ اس تصور کو ذہن میں جگہ دی ہی تھی کہ آپ سے ملاقات ہوگئی' اب اگر آپ کا احترام کرتا ہوں تو پہلے ہی مرحلے پر ناکامی کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیا یہ درست ہوگا ڈاکٹر؟" اس نے دوسری بار لڑکیوں کو دیکھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر بدستور گڑھے کی طرف متوجہ تھا۔

"میں ان میں سے ایک مچھلی لے جا رہا ہوں۔ تم ایک کے بجائے دو پکڑ لینا۔"

"ممکن ہے دو مچھلیاں نہ مل سکیں۔" ڈاکٹر نے سکون سے کہا۔

"تب بھی...... یہ تمہارے لیے کافی ہوں گی۔"

"نہیں ڈیئر آٹرے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جن کی خوراک کا بندوبست مجھے کرنا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تم سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ وہ خود یہ سب کچھ نہیں کر سکتیں!"

"اوہ۔ تم شاید عورتوں کی باتیں کر رہے ہو۔ اپنی فکر کرو ڈاکٹر' اپنے بارے میں سوچو۔ حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ہمیں صرف اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ویسے میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔"

"وہ بھی بتا دو۔" ڈاکٹر نے گردن اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں ڈاکٹر کہ یہاں اس چھوٹے سے خطے میں' جہاں خوراک کے لیے ان مچھلیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے' افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ مچھلیاں بھی ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ کیوں نہ افرادی کمی کر دی جائے تاکہ دوسرے لوگ زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکیں۔"

"وہ کس طرح؟" ڈاکٹر اب سیدھا ہوگیا تھا۔

"تم بوڑھے لوگ' زندگی کے بہت سے دور دیکھ چکے ہو۔ تم نے کافی عیش کر لیے ہیں۔ اب ایسی صورت میں تم نوجوانوں کو زندہ رہنے کا موقع دو۔ یہاں تم لوگوں کی وجہ سے ایک تکلیف کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ نوجوان لڑکیاں تم سے چمٹی ہوئی ہیں۔ کون

جانے یہاں سے زندہ واپس جانے کا بندوبست ہو یا نہ ہو۔ کیوں نہ اس تھوڑی سی زندگی کو رنگینیاں بخش دی جائیں لیکن بوڑھوں کی وجہ سے یہ ناممکن سا ہوگیا۔ اس لیے میرا خیال ہے تمہیں ہمارے لیے میدان خالی کر دینا چاہیے۔ تم لوگ رضا کارانہ طور پر خودکشی کر لو تاکہ تمہارے بعد ہم عیش کر سکیں۔"

"خوب...............خوب!" ڈاکٹر حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے دوسرے بوڑھوں سے مشورہ کر لیا ہے؟"

"ابتداء تم سے کی ہے۔" وہ بدستور بدتمیزی سے بولا۔

"اور اگر بوڑھے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو؟"

"تب پھر ان تمام بوڑھوں کو ڈھلان سے نیچے لڑھکا دیا جائے یہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ ویسے مجھے تمہاری یہ لڑکی بہت پسند ہے۔" اس نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں' فی الحال لڑکیوں کے بجائے بوڑھوں کی بات کرو میرے بچے۔ کیونکہ ظاہر ہے اپنی زندگی میں وہ تمہیں اپنی لڑکیوں کے قریب نہ ہونے دیں گے۔"

"یہ گفتگو پھر کبھی تفصیل سے ہوگی۔ فی الحال مجھے بھوک لگی ہے اس لئے میں اپنا حصہ لے جا رہا ہوں۔" وہ انیلا کی طرف بڑھا۔ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کے قریب ہوگئی تھیں اور سہمی سہمی نگاہوں سے اس بدہیئت آدمی کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں ہاں۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میرا خیال ہے میں نے ابھی تمہارا حصہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ پہلے ہمارا حصہ ہے اور پھر ان عورتوں کا جنہیں مچھلیاں پکڑ کر دینے والا اور کوئی نہیں ہے۔" بوڑھے حیات نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"تمہارے تسلیم کرنے نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" آٹرے نے جھکتے ہوئے کہا۔

"فرق تو پڑے گا!" حیات نے کہا۔

"کیا فرق پڑے گا۔ وہ بھی بتا دو۔" آٹرے نے ایک مچھلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ!" بوڑھے نے جواب دیا اور اس کی لات آٹرے کے منہ پر پڑی۔ آٹرے

مچھلی سمیت دوسری طرف الٹ گیا اور لڑکیوں کے منہ سے سہمی ہوئی چیخ نکل گئی۔ آٹرے نے اٹھنے میں پھرتی دکھائی تھی کیونکہ بہرحال وہ ایک کلب کا پیشہ ور لڑاکا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے وہ نوکدار آلہ سیدھا کرلیا جسے مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور بوڑھے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ بوڑھا دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آٹرے کے چہرے پر خوفناک آثار تھے۔ پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب میں نہ صرف ان مچھلیوں بلکہ ان لڑکیوں کے لیے بھی تم سے جنگ کروں گا۔ تمہارے بعد یہ میری ملکیت ہوں گی' اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس اقدام کو میرے نوجوان دوست سراہیں گے۔''

''بیشک۔ بیشک' یہ تمہارا کارنامہ ہوگا! اور وقتی طور پر تم ان کے ہیرو بن جاؤ گے۔ آؤ آؤ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ تمہاری طرح پھرتیلا نہ ثابت ہوسکوں گا!'' ڈاکٹر حیات نے مسکراتے ہوئے کہا اور آٹرے نے پوری قوت سے اس پر حملہ کردیا۔ لیکن اسے خود بھی احساس نہ ہوا کہ کس طرح وہ آلے سمیت ڈاکٹر کے سر سے اچھل کر دور جا گرا۔ لیکن نیچے گرتے ہوئے اس نے پھر اپنے ورزشی داؤ کا استعمال کیا تھا۔ چنانچہ دوسرے لمحے وہ پھر پیروں کے بل کھڑا تھا۔ اب اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔

''ذرا احتیاط سے حملے کرو آٹرے۔ کیا لڑکیوں کی طرح اچھل کود کررہے ہو۔ تمہاری کامیابی پر نوجوانوں کی خوشیوں کا انحصار ہے میں چاہتا ہوں تم کامیاب ہو جاؤ۔ آؤ یار۔ ذرا پھرتی سے وار کرو۔ کافی وقت ضائع ہو رہا ہے۔'' اور درحقیقت اس بار آٹرے نے پوری صلاحیتیں استعمال کی تھیں۔ اس نے ڈاکٹر کو ایک طرف جھکائی دی اور دوسری طرف سے حملہ کردیا۔ نوکدار آلہ ڈاکٹر کے سینے کی طرف لپکا اور بغل سے نکل گیا۔ البتہ اب وہ ڈاکٹر کے موٹے بازوؤں میں پھنسا ہوا تھا۔ بالکل اس انداز میں جیسے معانقہ کررہا ہو' آلہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اس انداز مین کہ اس کے ہاتھ جنبش بھی نہیں کرسکتے تھے اور خود اس کا دم گھٹا جارہا تھا۔ اس نے جسم کی بھرپور قوت صرف کرکے خود کو ڈاکٹر کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

لیکن خدا کی پناہ۔ اسے محسوس ہورہا تھا جیسے وہ لوہے کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہو۔

اس کی سانس اکھڑنے لگی۔

''تمہیں کلیجے سے لگا کر بڑی فرحت مل رہی ہے میرے بچے۔ درحقیقت بہادر آدمیوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔! کیا میں تمہاری پسلیاں اپنے جسم میں نصب کرلوں' دوہرے جسم کا مالک کہلاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے بڑے پرخلوص لہجے میں کہا لیکن آٹرے کی حالت خراب تھی۔ اس کی زبان بند ہوچکی تھی۔ ہاتھ میں دبا ہوا نوکدار آلہ برف پر گر پڑا تھا اور آنکھوں کے نیچے تاریکی چھاتی جارہی تھی۔ ''کچھ بولو تو سہی میرے لعل۔ تمہاری خوش فعلیاں کہاں گئیں؟'' ڈاکٹر نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''ہم۔ ہم۔ مم۔ مجھے۔ چھ۔ چھوڑ دو۔!' بمشکل تمام آٹرے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''آہ عزیز من' اتنی جلدی۔ ابھی تو حسرتیں دل کی دل میں ہیں۔ بہرحال اگر تم تکلیف میں ہو تو ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے ایک دم اسے چھوڑ دیا اور وہ پٹ سے برف پر گر پڑا۔ خوف کے باوجود دونوں لڑکیوں کی ہنسی نکل گئی تھی لیکن آٹرے کے دل پر جو بیت رہی تھی، وہی جانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے' لیکن بوڑھے شیطان نے نہ جانے کیا کیا تھا کہ اس کے اعصاب اس کے قابو میں نہ تھے' وہ اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت بھی نہ پا رہا تھا۔ بوڑھا چند ساعت اسے دیکھتا رہا۔ پھر مچھلیوں کے گڑھے کے پاس جا بیٹھا۔

آٹرے چند ساعت اس طرح پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لحات دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا رہا اور پھر پاؤں اس قابل ہوگئے کہ اٹھ کر بھاگ سکے تو تیزی سے اٹھ کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

''مچھلی تو نہیں لے گیا۔'' بوڑھے حیات نے چیخ کر کہا اور دونوں لڑکیاں بے تحاشہ ہنس پڑیں۔ بوڑھے کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

برفانی قید خانے کی صعوبتوں سے بہت سے لوگ دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ سب ایک دوسرے سے بیزار تھے لیکن ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ رات کو خاص طور

پر وہ یکجا ہو جاتے تھے کیونکہ برف کی سخت سردی جہاز کے دفن شدہ مکان تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ ان کے لیے محفوظ پناہ گاہ تھا۔ اگر یہ پناہ گاہ نہ ہوتی تو شاید ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا ہوتا۔ رات کو سردی ایسی ہی شدید ہوتی تھی۔ دن بھر وہ لوگ جانوروں کی طرح خوراک کی تلاش میں نکل جاتے اور رات کو تھکے ماندے جہاز کے ڈھانچے میں آ پڑتے تھے۔ بعض اوقات سب کے موجود ہونے کے باوجود بے پناہ خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ کوئی ایک دوسرے سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس خاموشی کو کسی کے رونے کی آواز توڑ دیتی لیکن عالم یہ تھا کہ لوگ رونے والے کو سر اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سب ایک ہی مصیبت کا شکار تھے۔ کون کسے تسلی دیتا!

یہ رات بھی دوسری بھیانک راتوں کی طرح تھی۔ جہاز میں لوگ الٹے سیدھے پڑے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے' کچھ سو رہے تھے۔ خاصی رات گزر چکی تھی۔ دفعتاً جہاز میں ایک تیز نسوانی چیخ گونج اٹھی۔ لوگوں نے کسلمندی سے پہلو بدلے اور پھر گھٹنوں میں سر چھپا لیے۔

''نہیں' نہیں۔ خدا کے لئے نہیں!'' درد آمیز نسوانی آواز پھر سنائی دی۔ یہ آواز ان عام آوازوں سے ذرا مختلف تھی جو روزانہ سنائی دیتی تھیں۔ کسی کو مخاطب کر کے کچھ کہا گیا تھا۔ اس لیے سونے والے کچھ چونکے۔

''نہیں' نہیں۔ آہ۔ نہیں!'' عورت کی آواز پھر گونجی اور پھر وہ زور سے چیخی۔ ''بچاؤ!''

اور اس بار بہت سی گردنیں اٹھ گئیں۔ جہاز کی دم کے قریب ایک ٹوٹی سیٹ پر کوئی ڈرامہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک اسپینش نوجوان تھا جس نے اپنے قریب سوئی ہوئی ایک لاوارث لڑکی پر وحشیانہ حملہ کر دیا تھا۔ چونکے ہوئے لوگ گردنیں کچھ اور بلند کر کے ان دونوں کی دھینگا مشتی دیکھنے لگے!

''میں۔ میں تجھے قتل کر دوں گا' سمجھی۔ ورنہ خاموش رہ!'' اسپینش نوجوان کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کپڑے پھٹنے کی آواز سنائی دی۔

''بچاؤ۔ آہ۔ بچاؤ۔'' لڑکی پھر چیخی اور پھر وہ اٹھ کر بھاگی۔ اسپینش نوجوان نے

لپک کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور لڑکی بری طرح گری۔ دوسرے لمحے اسپینش نوجوان اس پر سوار تھا۔ لڑکی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن اسی وقت ایک اور نوجوان اٹھ کر اسپینش نوجوان کے سر پر پہنچ گیا۔ دوسرے نوجوان نے پوری قوت سے اس کے لمبے بالوں کو پکڑ کر اسے لڑکی پر سے اٹھا لیا۔

''میرا خیال ہے اس سخت سردی کے باوجود' ابھی یہاں موجود لوگوں کے خون اس قدر سرد نہیں ہوئے ہیں۔'' اس دوسرے نوجوان نے کہا اور اسپینش نوجوان نے اسے ایک موٹی سی گالی دی۔ دوسرے لمحے وہ دوسرے نوجوان سے لپٹ پڑا لیکن اسپینش نوجوان کے مقابلے میں یہ دوسرا نوجوان کافی طاقتور تھا۔ اس نے اسپینش نوجوان کے دبلے پتلے جسم کو کمر سے پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے جہاز کی دیوار سے دے مارا۔ اسپینش نوجوان کی دلخراش چیخ سنائی دی اور بہت سے لوگ گھبرا کر اٹھ گئے۔

روشنی میں جہاز کی دیوار کے قریب اسپینش نوجوان بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کا سر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا پائلٹ۔'' ایک اور نوجوان نے کہا۔

''تم میں سے جتنے اس کے حمایتی ہوں اٹھ کھڑے ہوں۔'' دوسرے نوجوان نے جو جہاز کا پائلٹ فیروز تھا' غرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے تینوں ساتھی اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئے۔ اسپینش کی حمایت میں بولنے والے نوجوان نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ دوسرے لوگوں میں سے بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ اسپینش نوجوان نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا تھا۔

''اس کی لاش اٹھا کر باہر پھینک دو۔'' فیروز نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور پیٹر اور شہریار نے آگے بڑھ کر اسپینش نوجوان کی ٹانگیں پکڑ لیں' پھر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے' درمیان میں سونے والے جلدی جلدی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے لاش لے جانے والوں کو راستہ دے دیا تھا اور پھر شہریار اور پیٹر لاش پھینک کر واپس آ گئے۔

تمام مسافروں پر سکتہ طاری تھا۔ لڑکی ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ بوڑھے حیات نے

اپنی بیٹی کو آواز دے کر کہا کہ لڑکی کو اپنا لباس دے دو، اور انیلا اور نائلہ جلدی سے اٹھ کر لڑکی کے قریب پہنچ گئیں۔ انہوں نے لڑکی کو لباس پہنایا اور اسے اپنا پاس لٹا لیا۔ جہاز کے مایوس مسافر پھر اپنی جگہوں پر لیٹ گئے سب خاموش تھے اور سب کے ذہنوں میں بے شمار خیالات کلبلا رہے تھے ان کے ذہن نہ جانے کہاں کہاں دوڑ رہے تھے۔ اور رات بھر لوگ کبھی سوتے اور کبھی جاگتے رہے، خاص طور سے عورتوں کی بری حالت تھی۔ سب ہی خوفزدہ تھیں۔ اگر یہ رجحان بڑھ گیا تو؟

دوسری صبح حسب معمول اداس تھی۔ لوگ جہاز کے ڈھانچے سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ وہی بیزاری' وہی مایوسی' خوراک کی تلاش! وہی روز مرہ کے معمولات' رات کے واقعے کو سب فراموش کر چکے تھے۔ شاید وہ لڑکی بھی جس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تھا۔

''کیا تم کچھ دیر مجھ سے گفتگو کرنا پسند کرو گے؟'' جون آٹرے نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور نوجوان چونک کر رک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے جون آٹرے کو دیکھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے اسپینش نوجوان کی موت پر آواز بلند کی تھی۔ لیکن پھر فیروز اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے آٹرے کے تنومند جسم سے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''ایک انتہائی اہم مسئلہ!'' آٹرے نے کہا۔ ''آؤ۔ ہم اس ٹیلے پر چل کر بیٹھیں۔'' اس نے دوستانہ انداز میں نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور نوجوان اس کے ساتھ چل پڑا۔

''میں اس کے لئے رنجیدہ ہوں' جسے رات کو بیدردی سے مار ڈالا گیا۔'' آٹرے نے برف کے تخت تودے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ تمہارا دوست تھا؟''

''نہیں۔ اسی سفر میں شناسائی ہوئی تھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''تمہارا نام شاید بارٹر ہے؟''

''ہاں۔''

''تو مسٹر بارٹر۔ اگر غور کیا جائے تو اب تو ہم سب ایک دوسرے کے دوست، ایک دوسرے کے مونس ہیں تقدیر نے اس ویرانے میں ہمیں لا پھینکا ہے اور یہاں ہم موت کا

انتظار کر رہے ہیں۔ کیا یہ بے بسی کی موت سب کو قبول ہے؟''

''میں سمجھ نہیں سکا!'' بارٹر نے کہا

''معمولی سی بات ہے مسٹر بارٹر۔ ہم جانتے ہیں کہ موت ہم سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس برفستانی قبرستان سے نکلنا ناممکن ہے لیکن یہ خشک لمحات، موت کا انتظار۔ ہم موت کا انتظار اس طرح کیوں کریں؟ کیوں نہ ہم برف کی سفیدی میں کچھ رنگینیاں شامل کر لیں تاکہ ہنستے کھیلتے موت کو قبول کریں؟''

''رنگینیوں سے کیا مراد ہے؟''

''یہ لڑکیاں۔ جن کی تعداد نوجوانوں کے برابر ہو گی۔ کیونکہ ہم مردوں میں بوڑھوں کا شمار نہیں کریں گے۔ یہ لڑکیاں ہماری اس مختصر زندگی کو دلچسپ بنا سکتی ہیں۔ لیکن بوڑھوں نے اس بھیانک مقام پر بھی ہمارے اوپر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ نوجوانوں کے مقابلے میں بوڑھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اگر ہم نوجوان اتحاد کر لیں تو ان بوڑھوں کی ہمارے سامنے کیا چلے گی۔ اور اگر انہوں نے ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو ہم انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے' بلکہ میرا تو یہی خیال ہے کہ بوڑھوں کی زندگی ضروری نہیں ہے' یہاں ہمارے گزارے کے لیے صرف یہ مچھلیاں ہیں جن کی تعداد کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن بہرحال یہ کچھ وقت تک ہمارا ساتھ ضرور دے سکتی ہیں۔ ان بوڑھوں کی وجہ سے یہ خوراک بھی ضائع ہو رہی ہے جو ہمارا حق ہے۔ چنانچہ انہیں قتل کرنے سے کافی خوراک بچ سکتی ہے۔ ہم میں سے ہر نوجوان اپنی پسند کی لڑکی منتخب کر لے گا اور اس لڑکی کا کفیل ہو گا، اس کے لیے خوراک تلاش کرے گا! میں ایک بات کہوں گا' اگر ہماری زندگی میں یہ لڑکیاں شامل ہو جائیں تو ہمارے دلوں میں امنگ پیدا ہو جائے گی، اور اس طرح ممکن ہے کہ ہماری پوشیدہ صلاحیتیں ابھر آئیں اور ہم یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر لیں۔''

بارٹر متحیرانہ نگاہوں سے آٹرے کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہونٹ تر کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے متفق ہوں مسٹر آٹرے! لیکن کیا دوسرے نوجوان اس کے لئے تیار ہو جائیں گے؟''

"انہیں تیار کرنا ہوگا۔ اگر تم میری بات سے متفق ہو تو دوسرے بھی متفق ہوں گے۔ پھر کیوں نہ اس کی ابتداء ہم کریں۔ اگر ہم انہیں متفق کر سکے تو پھر کس کی مجال ہوگی کہ ہمارے سامنے آئے! میں جانتا ہوں کہ نوجوانوں میں سے کچھ سر پھرے ہمارے مخالف بھی ہوں گے لیکن اگر ہماری تعداد بڑھ گئی تو پھر وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے مسٹر آٹرے۔ پھر براہ کرم مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"خفیہ طور پر آج ہی سے یہ مہم شروع کر دی جائے۔ تم اپنے طور پر، اور میں اپنے طور پر نوجوانوں سے بات کرتا ہوں۔ اور پھر وہ بھی یہی کام کریں۔ تمام تحریکیں اسی طرح جڑ پکڑتی ہیں۔"

"میں یہ کام آج ہی شروع کر دوں گا!"

"وعدہ۔!" آٹرے نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"وعدہ۔!" بارٹر نے جواب دیا اور وہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔!



بوڑھا ڈاکٹر حیات آج سب سے آخر میں نکلا تھا۔ دوسرے تمام شکار کی تلاش میں جا چکے تھے لیکن بوڑھا کچھ تیاریوں میں مصروف تھا۔ نہ جانے وہ جہاز میں کیا کیا تلاش کرتا پھرا تھا۔ آج اس نے اسکیٹنگ شوز بھی ساتھ لئے تھے۔ جسے دیکھ کر اس کی بیٹی نائلہ نے پوچھا۔

"یہ اسکیٹنگ شوز کیوں ڈیڈی۔؟"

"آج میں ذرا لمبے راستے پر جاؤں گا۔" حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم لوگ؟"

"تم لوگ آج یہیں رہو۔ دوسری لڑکیوں کو ساتھ لے کر قرب و جوار کی سیر کرو۔ میرا خیال ہے تم لوگ اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"

"لیکن کیوں ڈیڈی۔ آج یہ تبدیلی کیوں۔؟"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں نائلہ۔ آج میں ذرا لمبا سفر کروں گا! کیا میں تمہاری

طرف سے مطمئن ہو جاؤں؟"

"جیسی آپ کی مرضی ڈیڈی۔" نائلہ نے کہا اور بوڑھے نے مسکرا کر ان دونوں کے شانے تھپتھپائے اور پھر وہ برف کی سرنگ سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے اسکیٹنگ شوز پیروں میں باندھے اور ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گزوں سے اپنے جسم کو دھکیلنے لگا، اور پھر وہ برف کے میدان میں پھسلنے لگا۔ بہت سے نوجوان اسے راستے میں ملے لیکن وہ ان سب کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتا رہا۔ آج اس کا رخ ان ڈھلانوں کی طرف تھا جو ناقابل عبور تھے۔

برف پر رزق کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ بلاشبہ یہ طاقتور بوڑھا بے شمار صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ شاندار اسکیٹنگ کر رہا تھا اور تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جس لائن پر وہ آگے بڑھ رہا تھا اسے اس نے پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور پھر وہ اتنا آگے نکل آیا تھا جتنا دوسرے لوگ کبھی نہیں آئے تھے۔ لیکن وہ وہاں بھی نہ رکا۔ کافی دیر کے بعد وہ بالآخر ڈھلانوں کے قریب پہنچ گیا۔ گہرے ڈھلان تاحد نگاہ پھیلے ہوئے تھے اور ان کا کہیں اختتام نظر نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً ان ڈھلانوں کے اختتام پر دوسرے ڈھلان بھی تھے۔ وہ نہ جانے کہاں تک گئے ہوں۔ بوڑھا ڈھلانوں کے کنارے پر کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ برف کے ایک سرے پر کسی سیاہی پر پڑی اور وہ اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے گز سنبھالے اور اس سیاہی کی طرف بڑھا! تھوڑی دیر کے بعد وہ سیاہی کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں رک کر اس نے پھر ڈھلانوں کو دیکھا۔ اس طرف کے ڈھلان دور تک ہموار تھے اور راستے میں برف کے ابھرے ہوئے تودے نظر نہیں آتے تھے۔ کئی منٹ تک ان ڈھلانوں کو دیکھنے کے بعد اس نے ان سیاہ چٹانوں کو دیکھا جو برف سے جھانک رہی تھیں۔ یہاں برف کی تہہ زیادہ موٹی نہیں تھی اور وہ چٹانیں ابھر آئی تھیں۔ وہ چٹانوں کے قریب پہنچ گیا اور انہیں ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا! چٹانوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے سے برف کھودنے کا آلہ نکالا اور پھر ایک چٹان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اسکیٹنگ شوز کھول کر ایک طرف رکھے اور پھر چٹان کی جڑ سے برف صاف کرنے لگا۔ کافی کھودنے کے بعد

اس نے گہری سانس لی۔ وہ چٹان کی جڑ صاف کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے چٹان کے ایک ٹکڑے کو کاٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ چٹان زیادہ سخت نہ نکلی اور تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس کا ایک بڑا ٹکڑا علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً دو من وزنی پتھر کو ایک طرف سرکانے کے بعد وہ پھر ویسا ہی ایک ٹکڑا علیحدہ کرنے لگا اور دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد اس نے چار وزنی پتھر چٹان سے جدا کر دیئے۔ پھر وہ ان وزنی پتھروں میں سے ایک کو برف پر کھسکاتا ہوا ڈھلان کے کنارے پر لے آیا۔ دوسرے پتھر کو اس نے اس جگہ سے تقریباً پچاس گز دور رکھا اور اس طرح باقی دونوں ٹکڑوں کو بھی اس نے پچاس پچاس گز کے فاصلے پر رکھ دیا۔ وہ اس تمام کام سے تھک گیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا، تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ پھر اٹھا اور ایک ٹکڑے کے قریب پہنچ گیا۔ پتھر ڈھلان کے کنارے پر تھا۔ تھوڑی سی طاقت نے اسے ڈھلان پر دھکیل دیا اور وزنی پتھر ڈھلان پر پھسلنے لگا۔ وہ تیزی سے ڈھلان پر جا رہا تھا اور بوڑھا گہری آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ پتھر کی رفتار بھی نوٹ کر رہا تھا اور اس کے پھسلنے کا انداز بھی دیکھ رہا تھا۔

لیکن اچانک پتھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ نرم برف کے کسی حصے میں غروب ہو گیا تھا۔ بوڑھے کا دل دھک سے رہ گیا۔ چند منٹ وہاں رہنے کے بعد وہ دوسرے پتھر کے نزدیک آیا اور اس نے اسے بھی ڈھلان پر دھکیل دیا۔ دوسرا پتھر بھی اسی رفتار سے چل پڑا۔ اس نے پہلے پتھر سے کافی زیادہ سفر طے کیا لیکن ایک مخصوص فاصلے پر پہنچ کر وہ زور سے اچھلا اور فضا میں کئی گز بلند ہو گیا۔ اس کے بعد نیچے گرا اور پھر بلند ہو گیا۔ اس دوران وہ الٹ پلٹ ہوتا رہا تھا۔ بہر حال کافی دور تک نظر آنے کے بعد وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ پھر تیسرے پتھر کی طرف چل پڑا۔ تیسرا پتھر بھی ڈھلان طے کرنے لگا اور بوڑھا اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ یہ تیسرا پتھر بغیر کسی رکاوٹ کے ان ڈھلانوں تک پہنچ گیا جو آگے جا کر نگاہوں سے معدوم ہو جاتے تھے۔ بوڑھے نے ایک دفعہ پھر ایک گہری سانس کھینچی۔ اس نے برف پر ایک گہرا نشان بنا دیا اور آخری پتھر کی طرف چل پڑا۔

اور اس پتھر نے بھی اپنا سفر بخیر و خوبی طے کیا تھا اور وہ بھی نگاہوں سے معدوم ہو گیا۔ بوڑھے نے یہاں بھی ایک نشان بنا لیا اور پھر وہ قرب و جوار میں ابھری ہوئی چٹانوں کو دیکھنے لگا۔

سورج ڈھلنے لگا تھا۔ بوڑھے نے چند چھوٹے چھوٹے پتھر کاٹ کر برف کا ایک تودہ بنایا اور پتھروں کو اس پر رکھ دیا۔ یہ گویا اس نے نشان بنایا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اسکیٹنگ شوز دوبارہ باندھے اور پھر سست روی سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اب اس نے اپنا اصل کام شروع کر دیا۔ وہ گزوں سے برف ٹٹول رہا تھا۔ ایک جگہ وہ رک گیا اور اس نے اسکیٹنگ شوز دوبارہ کھول دیئے۔ اس کے بعد وہ برف میں گڑھا کھودنے لگا یہاں تک کہ پانی نکل آیا اور شام کو چار بجے کے قریب جب وہ واپس پلٹا تو اس کے تنومند جسم سے چار مچھلیاں لٹکی ہوئی تھیں۔



وہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ رات پھر برفباری ہوتی رہی تھی اور برف کی تہہ جابجا موٹی ہو گئی تھی۔ حسب معمول بوڑھے اور جوان بچے کھچے گوشت کا ناشتہ کر کے شکار کی تلاش میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے! نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد آج معمول سے پہلے باہر نکل گئی تھی۔ صرف چند نوجوان تھے جو بوڑھوں کے ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔ سرنگ کے دہانے سے وہ چند ہی گز گئے ہوں گے کہ اچانک نوجوانوں کا ایک گروہ سامنے سے نکل آیا۔ ان کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ سب کے سب برف کھودنے کے آلات سے مسلح تھے اور سب کے چہروں پر ایک خوفناک تاثر تھا۔ بوڑھے اور ان کے ساتھی نوجوان چونک کر رک گئے۔

تب آٹرے آگے بڑھا۔ اس کا چہرہ شرارت سے چمک رہا تھا۔ اس نے ایک زہر خند مسکراہٹ سے حیات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بوڑھے ڈاکٹر حیات۔ میں نے جس وقت کی پیشن گوئی کی تھی، بالآخر وہ آ گیا۔ آج نوجوانوں کا یہ گروہ میرا ہم خیال ہے اور میرے ایک اشارے پر تم سب کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو تیار ہے؟“

"لیکن بات کیا ہے مسٹر آٹرے؟" خرم شاہ نے جو بوڑھوں کی صف میں شامل تھا' حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم نوجوانوں نے ایک فیصلہ کیا ہے مسٹر خرم شاہ کافی غور وخوض کے بعد ہم نے ان نوجوانوں کو چھانٹا ہے جو ہمارے ہم خیال ہیں۔ امید ہے تم بھی ہم سے اتفاق کرو گے۔"

"وہ فیصلہ کیا ہے مسٹر آٹرے؟" خرم شاہ نے پریشانی سے کہا۔

"مسٹر خرم شاہ۔ آپ کو علم ہے کہ یہاں اس برف پر' ہماری زندگی لمحاتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کون کس وقت موت کے شکنجے میں جا پھنسے۔ یہاں ہمارے لئے موت کے علاوہ کچھ نہیں۔ برف' سردی' بھوک یہ تمام چیزیں موت کو آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھا رہی ہیں اور بہر حال ہم اسے قبول کرنے کے لئے مجبور ہیں' یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں' جب ہم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں تو کیوں نہ زندگی کے یہ لمحات آزادی سے اور اپنی مرضی سے گزاریں۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ ہم نوجوان، تم بوڑھوں کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ تم نے اپنی زندگی کا زیادہ وقت عیش وعشرت میں گزارا ہے لیکن ہمیں اس نوجوانی میں موت قبول کرنا پڑ رہی ہے' کیا یہ ناانصافی درست ہے؟"

"لیکن یہ ناانصافی ہم میں سے کسی کی نہیں ہے آٹرے۔ کیا تم ہمیں اس کا ذمہ دار سمجھتے ہو؟" خرم شاہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو لیکن تم نے جو قیود ہمارے اوپر لگا رکھی ہیں، کیا تم ان سے انکار کرو گے؟"

"براہ کرم ان کی تفصیل بتاؤ؟"

"لڑکیاں۔ یہ تمام لڑکیاں بوڑھوں کی قیدی ہیں۔ ہم سب مایوسی کے شکار ہیں۔ ہم سب موت کے راہی ہیں۔ ہماری زندگی اندھیرے کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہمیں روشنی کی ضرورت ہے۔ ہمیں تازگی کی ضرورت ہے۔ ہمیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تم جانتے ہو خرم شاہ، عورت مرد کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس کا قرب مل جائے تو صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ مایوسیاں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم نے لڑکیوں کو ہم سے دور

کر رکھا ہے۔ تم نے اس ناقابلِ یقین زندگی میں رنگینی کے لمحات ہم سے چھین لئے ہیں۔ ہم ان لمحات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ان لڑکیوں کو آپس میں بانٹ لینا چاہتے ہیں۔ ہم اس چند روزہ زندگی کو حسین بنانا چاہتے ہیں لیکن ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تم لوگ ہو۔" آٹرے خاموش ہو گیا۔ تمام بوڑھوں کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے تھے، یہ بڑا خطرناک رجحان تھا۔

"لیکن تم مہذب دنیا کے مہذب لوگ ہو۔ کیا تمہارے ضمیر یہ برداشت کر لیں گے کہ یہ بے سہارا باعزت لڑکیاں تمہاری ہوس کی بھینٹ چڑھ جائیں؟" خرم شاہ نے اپیل کی اور آٹرے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"مہذب دنیا۔ کون سی مہذب دنیا۔ کس دنیا کی بات کر رہے ہو خرم شاہ؟ وہ تو ایک خواب تھا۔ کیا تم وہ خواب ہمیں دوبارہ دکھا سکتے ہو؟"

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" خرم شاہ نے کسی کو نہ بولتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے یہ مچھلیاں ضائع ہو رہی ہیں جنہیں ہم زیادہ عرصے تک اپنی خوراک بنا سکتے ہیں۔ تم نہ ہو گے تو ہم زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس لئے ہماری پیشکش ہے کہ تمام بوڑھے نوجوانوں کی زندگی کے لئے رضاکارانہ طور پر خودکشی کر لیں' ورنہ دوسری شکل میں ہم انہیں قتل کر دیں گے۔" آٹرے نے کہا۔

خرم شاہ کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے نفرت سے ان سب کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تم سب لوگ اس سے متفق ہو؟"

"ہاں۔ ہم نے آٹرے کو اپنا لیڈر بنا لیا ہے۔ یہی ہماری ترجمانی کرے گا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ تم بھی کسی کی اولاد ہو۔ تمہارے بھی بزرگ دنیا میں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' لیکن اب اس دنیا سے ہمارا کیا واسطہ؟" آٹرے نے جواب دیا۔

"گویا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟"

"بالکل!"

''تم ہمیں کوئی مثبت راستہ تلاش کرنے کی اجازت بھی نہ دو گے؟''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟'' آٹرے نے جواب دیا۔

''ان دوسرے نوجوانوں کا کیا ہوگا جو ہمارے ساتھ ہیں؟''

''ان کا مقدر بھی تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ ہاں اگر ان میں سے کچھ خلوص دل سے ہمارے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہوں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے!''

''لیکن میرے دوست۔ ہم بوڑھے اتنی آسانی سے جان نہ دیں گے۔ ہم تم سے جنگ کریں گے۔ ٹھیک ہے تم جوان ہو۔ ہم پر حاوی ہو جاؤ گے، لیکن ہم تم میں سے چند کو ہلاک کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کو اس جدوجہد سے کیا فائدہ ہوگا جو اس جنگ میں ہلاک ہو جائیں گے؟''

''وہ باقی نوجوانوں کے لیے جان دیں گے۔ کسی بھی تحریک کے لئے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' آٹرے نے کہا۔

''تب پھر غور سے سن لو جون آٹرے۔'' دفعتاً ڈاکٹر حیات نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں سب سے پہلے تمہیں ہلاک کروں گا۔ اور تم جانتے ہو میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ میں عہد کرتا ہوں کہ تم میں سے کم از کم پندرہ جوانوں کو ہلاک کروں گا۔ ہمیں تمہارا چیلنج قبول ہے۔ تیار ہو جاؤ'' بوڑھے حیات کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

آٹرے بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کے چہروں پر بھی خوف کے آثار ابھر آئے۔

''یہ بوڑھا واقعی شیطان ہے۔ ہمیں پوری قوت صرف کر کے پہلے اسے ہلاک کرنا ہوگا۔'' آٹرے نے کہا۔

''سنو آٹرے۔ ٹھنڈے دل سے سنو۔ جوش میں مت آؤ۔ بوڑھے ڈاکٹر نے مچھلیاں حاصل کرنے میں تمہاری رہنمائی کی ہے۔ ہم جہاندیدہ ہیں۔ قتل و غارت گری سے پرہیز کرو۔ ممکن ہے ہم سب ایسی کوئی صورت نکال ہی لیں جو سب کے لئے سلامتی کا باعث ہو۔ ہمیں موقع دو کہ ہم غور وخوض کر کے کوئی ایسا حل تلاش کرلیں جس کے تحت

تمہیں یہ ضرورت پیش نہ آئے۔''

''کیا تم لڑکیاں ہمارے حوالے کرنے کو تیار ہو؟''

''اس کا جواب ہم ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہیں دے دیں گے۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''تب تمہیں تھوڑی دیر کی رعایت ہے۔ اس طرف جاؤ اور کوئی ایسا فیصلہ کر کے واپس آؤ جو ہمارے لئے قابلِ قبول ہو۔''

''آؤ دوستو ہمیں ان جذباتی نوجوانوں کے بارے میں ہمدردی سے غور کرنا چاہئے۔ آؤ۔'' خرم شاہ نے کہا اور تمام لوگ واپس پلٹ کر ان سے دور چلے گئے۔ نوجوانوں کا گروہ ان کے سامنے پوری طرح تیار کھڑا تھا۔

''انسان۔ دنیا کا سب سے خوفناک درندہ ہے۔ تہذیب و اخلاق کے ضابطے اس پر لبادے ڈال دیتے ہیں لیکن جب وہ ننگا ہوتا ہے تو اپنی اصل شکل میں آ جاتا ہے۔ بیشک یہ صورتِ حال تکلیف دہ ہے لیکن کیا اس سے نپٹنے کا راستہ اس کے علاوہ کوئی اور ہے کہ ہم ان کی بات مان لیں؟ میں اپنے تمام دوستوں سے مشورہ چاہتا ہوں۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے مسٹر خرم شاہ۔ ہم میں سے کون اپنی زندگی میں اپنی عزت کا نیلام دیکھ سکے گا! ٹھیک ہے ہم سب لڑیں گے۔ اپنی آبرو کے لئے لڑیں گے اور ہم اپنی بیٹیوں کو بھی جنگ میں شریک کریں گے۔ اس برف پر ایک خونریز معرکہ ہو جانے دو خرم شاہ۔ وہ ہماری اولادیں ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے محافظ ہیں۔ ہم نے انہیں پیدا کیا ہے۔ ہم انہیں بھیڑیوں کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟'' ایک بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں دوست۔ میں بھی ان لڑکیوں پر آنچ آنے سے پہلے جان دے دینا پسند کرتا ہوں۔ میں صرف تمہاری رائے چاہتا تھا۔ درندوں کو ان کے ارادوں سے روکنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ بیشک ہماری زندگیاں موت کے مقابل ہیں۔ خواہ وہ بھوک سے آئے، یہاں سے نکلنے کی کوشش میں آئے یا ان لوگوں سے جنگ کی شکل میں آئے۔ موت اتفاقیہ طور پر زیادہ قریب آ گئی ہے۔ پھر جب مرنا ہی ہے تو انتظار کیوں کیا جائے۔ آپ میں سے ہر ایک کو بولنے کی آزادی ہے۔ جو بہتر سوچ

سکے فوراً بولے۔" خرم شاہ نے کہا۔

"آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے مسٹر خرم شاہ؟" ایک بوڑھے نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی ایک بات باقی ہے۔ اب میں ان نوجوانوں سے سوال کرتا ہوں جو ہمارے ساتھ ہیں۔ دوستو! تم جوان ہو۔ شاید تمہاری رگوں میں ضرورت سے زیادہ شریف خون ہے، ورنہ نوجوانوں کے گروہ میں تم بھی شریک ہوتے۔ کیا انسانیت کی اس جنگ میں تم ہم بوڑھوں کا ساتھ دو گے؟"

"ہم سب زندگی کی بازی لگانے کے لیے بے چین ہیں۔" نوجوانوں نے پرجوش انداز میں کہا۔

"شکریہ شریف نوجوانو۔ اگر شر کے ساتھ خیر کا وجود نہ ہوتا تو دنیا انسانیت سے کبھی کی خالی ہو چکی ہوتی۔ اب تم اس ناچیز کی رائے سنو۔ ہمیں ان درندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی بیٹیوں کو بھی آبرو کی اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے تیار کرنا ہے۔ انہیں غیرت پر مر مٹنے کا سبق دینا ہے۔ تاکہ جب ہم ان کے مقابلے پر آئیں تو تیار ہوں۔ لیکن اندازے سے پتہ چلتا ہے کہ نوجوان ہمیں اس کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سنو میرے دوستو! بڑے فتنے کو رفع کرنے کے لیے کچھ قربانیاں بھی دی جاتی ہیں۔ ہمیں کچھ ایسے بھی کام کرنے ہوں گے جن سے ہمارے ضمیر پر بوجھ آ پڑے گا۔ نوجوانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ہمیں ان سے تعاون کرنا پڑے گا ایسی باتیں کہنا پڑیں گی جو ان کے لیے دلکش ہوں۔ قابل قبول ہوں۔ سنو۔ میں خدا کے وجود کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تمہاری بیٹیاں میری اپنی بیٹیاں ہیں۔ تمہاری بہنیں میری اپنی بہنیں ہیں۔ میں جو کچھ ان لوگوں سے کہوں گا وہ میرے اور تمہارے ضمیر کے خلاف ضرور ہوگا، وہ تمہارے دل کے ٹکڑے ضرور کر دے گا لیکن یہ ضروری ہے میرے دوستو یہ ضروری ہے۔ ہم دشمن پر فتح حاصل کر لیں گے۔ اگر ہم مرے تو آبرو سے مریں گے۔ اپنی بیٹیوں کی عزت کے ساتھ دفن ہوں گے۔ تم اگر پسند کرو تو نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لیے میرا انتخاب کر لو۔ میں جو کچھ کہوں' جو کچھ کروں اسے مصلحت جانو اور اس پر صاد کرو۔"

"ہم تمہارے اوپر بھروسہ کرتے ہیں خرم شاہ۔" بہت سے لوگوں نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے۔ اب میں نوجوانوں سے مخاطب ہوں۔ میرے نیک بچو۔ تم نے جس عزم اور نیک نیتی کا اظہار کیا ہے۔ میں تمہیں اس پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ اب ہم جو کچھ کریں گے وہ مصلحت ہوگی۔ تمہیں اپنے ضمیر کے خلاف ان لوگوں سے دوستی کرنا ہوگی۔ ان کے ارادوں میں شریک ہونا پڑے گا۔ اس کا اظہار کرنا پڑے گا!"

"آپ جو کچھ کہیں گے ہم وہی کریں گے مسٹر خرم شاہ۔"

"تب سنو۔ میں نوجوانوں کے لیے تجاویز پیش کرتا ہوں جو ان کے حق میں ہوں گی۔ مجھے یقین ہے وہ انہیں پسند کریں گے۔ تم کہو گے کہ تم بھی اس حق سے کیوں محروم رہو۔ اور تم نوجوانوں کے اس گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔"

"ہم آپ کی ہدایات پر عمل کریں گے۔" نوجوانوں نے کہا۔

"تب آؤ۔ ہم انہیں فیصلہ سنا دیں۔" خرم شاہ نے کہا اور وہ سب نوجوانوں کے گروہ کی طرف بڑھ گئے جو انہیں شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ خرم شاہ نے چہرے پر مایوسی پیدا کر لی۔ چند ساعت کے بعد وہ سب نوجوانوں کے سامنے پہنچ گئے۔ تب آٹرے آگے آیا اور کینہ توز نظروں سے خرم شاہ کو گھورتے ہوئے بولا۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا بوڑھے چالباز؟ ہم تمہارا فیصلہ سننے کے لیے بے چین ہیں۔"

"فیصلہ تمہارے حق میں ہے میرے بگڑے ہوئے بچو۔ لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔"

"کیا شرائط ہیں؟" آٹرے نے پوچھا۔

"ہم سے اس انداز میں گفتگو مت کرو آٹرے۔ بہرحال جتنی بھی ہے' ہم قوت ضرور رکھتے ہیں۔ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تم میں آدھے باقی رہیں گے۔ اس کے بعد ہی تم جو کچھ کر سکو گے کرو گے۔ لیکن عقل و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنی قوت بحال رکھیں۔ نادان لڑکو۔ ہماری ذہانت' تجربہ' اور تمہارا عمل' دونوں مل کر ایک ایسا دن لا سکتے ہیں جب ہم یہاں سے آزاد ہوں۔ ہم مہذب دنیا میں پہنچ سکیں۔ اگر ہم کبھی مہذب دنیا میں پہنچ گئے تو ہمارے ضمیر اس فعل پر ہمیشہ ملامت کرتے

رہیں گے جس کے خواہش مند تم ہو۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ایسا حل تلاش کیا جائے جو تمہیں اور ہمیں دونوں کو قبول ہو۔ جس سے تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ہمارا ضمیر بھی داغدار نہ ہو۔"

"کیا تم ایسا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے بوڑھے خرم شاہ۔" آٹرے نے کہا۔

"ہاں۔ میرے خیال میں ہم ایسا حل تلاش کر چکے ہیں۔"

"تو بتاؤ۔ ممکن ہے ہم اس پر ہمدردی سے غور کریں۔"

"ہم لڑکیاں تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ایک شرط پر۔ تم سب ان میں سے اپنی اپنی پسند کی لڑکی تلاش کر لو۔ اس کے بزرگ سے اس ضمن میں بات کر لو۔ ہم میں سے کوئی بھی بوڑھا تمہارے ساتھ اس کی شادی کرا دے گا۔ تم اسے بحیثیت بیوی رکھ سکو گے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر ہم تم مل کر کبھی مہذب دنیا میں پہنچ سکے تو وہ عورت تمہارے سر پر مسلط نہ ہوگی۔ تم چاہو تو اسے طلاق دے سکتے ہو۔ اس طرح ہم گنہگار بھی نہ ہوں گے اور تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تم اپنی بیویوں کے ساتھ زندگی گزار سکو گے۔ بتاؤ کیا اس سے تمہارا مقصد باعزت طور پر حل نہ ہو جائے گا اور کیا اس عمل سے ان لوگوں کو بھی سکون نہ ملے گا جن کی بیٹیوں کو تم اس طرح پامال کرنا چاہتے ہو۔ رہ گئے ہم بوڑھے، تو ہم پیش کش کرتے ہیں کہ ہم تمہاری خدمت کریں گے۔ تمہارے لیے شکار کریں گے۔ آج سے ایک ضابطہ بنا لو۔ ہم شکار کریں گے۔ ایک جگہ جمع کریں گے اور پھر اسے آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ خواہ کتنا ہی حصہ میں کیوں نہ آئے۔ اس کے علاوہ بھی ہم تمہاری ہر ممکن خدمت کریں گے۔ ہمیں بھی زندہ رہنے دو!"

آٹرے کے چہرے پر غور و خوض کے آثار ابھر آئے اور پھر اس نے گردن اٹھا کر کہا۔ "کیا دوسرے لوگ بھی اس کے لیے تیار ہیں؟"

"ہاں۔ ان غیر یقینی حالات میں، میں نے انہیں اس پر آمادہ کر لیا ہے۔"

"لیکن۔ ایسی شکل میں ہم کیوں گھاٹے میں رہیں مسٹر خرم شاہ؟" فیروز نے مداخلت کی۔

"کوئی گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ ہم سب کے لیے ایک ہی انداز میں سوچیں گے۔"

"ہم بھی مسٹر آٹرے کے ساتھ شامل ہیں۔" فیروز نے کہا اور نوجوانوں کا ٹولہ پروگرام کے مطابق آٹرے کے ساتھیوں میں جا ملا۔

"کیا مشورہ ہے دوستو؟" آٹرے نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" نوجوانوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"تب ٹھیک ہے۔ ہمیں تمہاری شرط منظور ہے۔" آٹرے نے جواب دیا اور نوجوان خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ بوڑھوں کی گردنیں لٹک گئی تھیں۔



"میں نوجوانوں کے لیڈر کی حیثیت سے تم لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ اپنی لڑکیوں کو باہر بھیج دو، اور تم لوگ اسی وقت سے ہمارے لیے کام کرنا شروع کر دو۔" آٹرے نے کہا۔

"ہم تمہاری دوسری ہدایت پر فوری عمل کرنے کے لیے تیار ہیں مسٹر آٹرے۔ تم نہ صرف نوجوانوں کے، بلکہ ہمارے بھی لیڈر رہو۔ ہم کوئی کام تمہاری مرضی کے بغیر نہ کریں گے۔ لیکن جو باعزت سمجھوتہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہوا ہے، تمہیں بھی اس کی پابندی کرنا ہوگی۔" خرم شاہ نے کہا۔

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔" آٹرے نے خرم شاہ کے انداز گفتگو سے قدرے نرم ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ فیصلہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہوا ہے۔ بے چاری لڑکیوں کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر ہم نے اسی طرح انہیں تمہارے سپرد کر دیا تو ان کے ذہن تم میں سے کسی کو قبول نہ کر سکیں گے اور یوں بھی مصیبت کے وقت میں رومان ان کے ذہنوں میں نہ ہوں گے۔ خاص طور پر اس لئے کہ وہ لڑکیاں ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ تم میں سے کسی کو پسند کرتی ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ تمہیں اس سلسلے میں تھوڑا سا وقت دینا ہوگا تا کہ ہم ان کے ذہنوں کو تمہاری طرف رجوع ہونے کے لیے تیار

کر سکیں۔"

آٹرے کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم تمہیں وقت دینے کے لیے تیار ہیں' لیکن ایک بات کی نشاندہی کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ تم لوگوں نے اگر ہمارے خلاف سازش کی تو پھر ہم ہر معاہدے سے آزاد ہوں گے اور اس کے بعد ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوگی۔"

"برف کے اس ویرانے میں ہماری زندگیاں یوں بھی بہت مختصر ہیں۔ یہاں سازشوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہم تمہاری صلاحیتوں کو بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر لڑکیوں کے حصول کے بعد تمہارے ذہن یکسو ہو سکیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔ کیونکہ اس طرح یہاں سے نکلنے کے لیے کوئی ترکیب سوچی جا سکتی ہے۔ لیکن لڑکیوں کو بھی بہر حال صورتِ حال سمجھانا ہو گی۔ ہاں وہ شرط برقرار ہے۔ ہم مناسب اوقات میں تم لوگوں کو عارضی ازدواجی رشتوں میں منسلک کئے بغیر لڑکیاں تمہارے حوالے کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔"

"ہم وہ شرط منظور کر چکے ہیں۔" آٹرے نے کہا اور نوجوان خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے ساتھ شامل ہونے والے شریف نوجوان بھی انہی کے ساتھ چلے گئے تاکہ ان کے عزائم سے باخبر رہیں۔ نوجوانوں کے گروہ کے جانے کے بعد بوڑھے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔ وقتی طور پر انہوں نے اس طوفان کو ٹال دیا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ طوفان ٹلا نہیں ہے۔ اس سے نبٹنے کے لیے سخت کاوشیں کرنا ہوں گی۔

کافی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر بوڑھے حیات نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں لڑکیوں سے گفتگو کر لینا چاہیے۔ انہیں ان کی عزت بچانے کی مہم میں برابر کا شریک رکھا جائے تو بہتر ہے۔"

"میرے خیال میں ہمارا ان سے گفتگو کرنا درست نہ ہو گا ڈاکٹر حیات، اور پھر بہر حال نوجوان ذہین ہیں۔ مایوسی نے انہیں درندہ بنا دیا ہے۔ وہ بہک گئے ہیں لیکن ذہانتیں برقرار ہیں۔ ان سے نبٹنے کے لیے زبردست صلاحیتوں سے کام لینا پڑے گا۔"

خرم شاہ نے کہا۔

"آپ کی کیا رائے ہے مسٹر خرم شاہ؟"

"اس سلسلے میں آپ کو اپنی لڑکیوں کی صلاحیتوں سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے ڈاکٹر کہ آپ کی بچیاں کافی خود اعتماد ہیں۔ وہ اس پورے ہنگامے کے دوران خوفزدہ یا مایوس نظر نہیں آئیں۔ آپ یہ کام اپنی دونوں بچیوں کے سپرد کر دیں۔ وہ دوسری لڑکیوں کو صحیح انداز میں صورتِ حال سے باخبر کر کے انہیں حالات سے نبٹنے کے لیے تیار کریں اور ان کا عندیہ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔" حیات نے کہا۔ "بہر حال دوسرا کام ہمیں آج سے کرنا ہو گا۔"

"یعنی شکار کی تلاش؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر حیات نے جواب دیا۔

"اس کے لیے ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی، ڈاکٹر حیات۔"

"میرے اندازے کے مطابق یہاں ابھی اتنی خوراک موجود ہے جو ہمارے لیے ایک ماہ تک کافی ہو گی۔ میں ان جگہوں کی نشاندہی ضرور کروں گا۔ پہلے میں لڑکیوں کو صورتحال سے باخبر کر دوں۔ آپ لوگ میرا انتظار کریں۔" ڈاکٹر حیات نے کہا اور پھر وہ برف کی سرنگ کے اندر داخل ہو گیا۔ چند منٹوں بعد وہ لڑکیوں کے قریب تھا۔ اس نے نائلہ اور انیلا کو دوسری لڑکیوں سے الگ بلایا اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لڑکیاں بغور باپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ڈیڈی؟" انیلا نے پوچھا۔

"تم دونوں میری عادت سے واقف ہو۔ میرے نظریات بھی جانتی ہو۔ میں سانس کی آمد و رفت تک انسان کو بے بس نہیں سمجھتا۔ انسان صرف خدا کے سامنے بے بس ہے۔ خدا نے اسے زندگی دی ہے اور جب وہ موت دیتا ہے تو اسے بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے لوگ مایوسی کے شکار ہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں' میں اس برف پر اس وقت تک کی زندگی پر یقین رکھتا ہوں جب تک موت کا وقت نہ آ جائے۔ تمہیں یہ سن کر

شاید حیرت ہو کہ میں اس ویرانے سے فرار کا منصوبہ تیار کر چکا تھا' میرا خیال تھا کہ تم دونوں کو یہاں سے لے کر نکل جاؤں اور بلاشبہ میں نے اس کے انتظامات بھی کر لئے ہیں۔ لیکن یہ انتظامات دوسروں کی نگاہوں میں دیوانگی ہی کہلاتے۔ کوئی میرا ساتھ نہ دیتا سوائے تم دونوں کے۔ اس لئے میں نے کسی سے ذکر ہی نہ کیا۔ میں اگر ایک احمقانہ کوشش کر رہا ہوں تو یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ دوسروں کو کیوں میں اپنے تجربے کی بھینٹ چڑھاؤں۔ ممکن تھا آج ہم ایک عجیب سفر شروع کر دیتے جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندگی کی پرخار وادیوں کی سیر کراتا یا موت کی پرسکون منزلوں تک پہنچاتا۔ لیکن بہرحال میں نے اسے مناسب سمجھا تھا۔ اس وقت تک مجھے دوسروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں اپنا مسئلہ خود حل کرتا کیونکہ وہ میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے لیکن اب صورتحال اچانک بدل گئی ہے اور میں مجبور ہو گیا ہوں کہ اس وقت انہیں تنہا نہ چھوڑوں۔"

حیات نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور لڑکیاں پریشانی سے اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ حیات کی الجھی ہوئی گفتگو ان کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

"دراصل نوجوانوں کا ایک گروہ، اس بدبخت آٹرے کی سرکردگی میں بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے جسے میں نے مارا تھا۔"

"بغاوت! وہ کیا چاہتے ہیں ڈیڈی۔" نائلہ نے پوچھا۔

"لڑکیاں۔ ان کا خیال ہے کہ اس ویرانے میں ان کی موت بے رنگ نہ ہو اور مرنے سے قبل وہ اپنی سفلی آرزوؤں کی تکمیل کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے بوڑھوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تا کہ لڑکیوں کو اپنے تصرف میں لا سکیں۔"

"اوہ۔" نائلہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"تھوڑی سی غلطی میری بھی تھی۔ میں نے اس خطرناک پاگل کے رجحان کو پڑھ لیا تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے اسی دن برف میں دفن کر دیتا لیکن میں نے انسانی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے بھاگ جانے دیا اور وہ بہت خطرناک ثابت ہوا۔"

"پھر کیا طے پایا ڈیڈی؟" نائلہ نے کہا۔

"ہم نے وقتی طور پر اس وعدے کے ساتھ ان وحشیوں کو سنبھال لیا ہے کہ لڑکیاں ان کے حوالے کر دی جائیں گی لیکن زیادہ عرصہ تک ہم انہیں نہ روک سکیں گے۔ چنانچہ اب اپنی عزتوں کی حفاظت کے لیے لڑکیوں کو خود میدان عمل میں آنا پڑے گا۔"

"انہیں کیا کرنا ہو گا؟"

"نوجوانوں کی دلدہی۔ انہیں اپنی ذہانت سے اپنی عزت بچانا ہو گی اور ہمیں اتنا وقت فراہم کرنا ہو گا کہ ہم ان سے نبٹنے کی تیاریاں مکمل کر سکیں۔ لیکن یہ بات صرف لڑکیوں کی ذہانت پر منحصر ہے۔ ہمیں انہیں نوجوانوں سے ملنے کی آزادی دینا ہو گی۔ ورنہ نوجوان شبہات میں مبتلا ہو جائیں گے اور ممکن ہے وقت سے پہلے یہاں کوئی خون ریز معرکہ ہو جائے۔ اب یہ کام صرف لڑکیوں کا ہے کہ وہ کس طرح انہیں بے وقوف بنا کر ٹال سکتی ہیں۔ ہم نے ان سے کہا ہے کہ ہم ان کی عارضی شادی کریں گے تا کہ وہ عزت سے ایک ایک لڑکی کے مالک بن سکیں۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے، ڈیڈی؟" نائلہ نے پوچھا۔

"بوڑھوں کے گروہ نے تم پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں کو اس کام پر آمادہ کرو۔ اور سنو، میں تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ تم بھی دوسروں کی طرح اپنا کام کرو۔ یہ انسانیت کی جنگ ہے۔ اس میں ہر حربہ جائز ہے۔ میں چشم پوشی کروں گا۔ کیا میں جاؤں؟" بوڑھے ڈاکٹر حیات نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"او کے ڈیڈی۔ آپ جائیں۔ رات کو ہم آپ کو رپورٹ دیں گے۔" نائلہ نے کہا۔

"لیکن نہایت ہوشیاری سے' نوجوان ہماری طرف سے خوفزدہ ہیں۔ وہ ہم پر کڑی نگاہ رکھیں گے۔" حیات نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔" انیلا نے جواب دیا اور حیات گردن ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے خرم شاہ وغیرہ کو بتایا کہ اس نے انتظام کر لیا ہے۔ اور پھر وہ مچھلیوں کی تلاش میں چل پڑے۔

❀ >>> ❀ >>> ❀

شام کو بوڑھوں کی ٹیم واپس آئی۔ نوجوانوں کا گروہ انہیں سرنگ کے باہر ہی ملا لیکن ایک چھوٹے سے کیبن کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ یہ کیبن جہاز کی ٹوٹی ہوئی سیٹوں' پائلٹ کیبن کے پارٹیشن اور کینوس کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ قریب پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ یہ نوجوانوں کا ہیڈ کوارٹر ہے' جہاں سے وہ بوڑھوں پر نگاہ رکھیں گے۔ نوجوان بہت خوش تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ بوڑھوں کے کندھوں سے لٹکی ہوئی مچھلیاں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ سب لوگوں نے ڈاکٹر حیات کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن لطف کی بات تو جب ہے جب ڈاکٹر حیات روزانہ ہمیں اتنی مچھلیاں فراہم کر سکیں۔'' آٹرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے ہم سے تعاون کیا مسٹر آٹرے' تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں یکساں غذا سے نجات مل جائے۔ ہو سکتا ہے ہم اس ویرانے سے نہ نکل سکیں' لیکن ہم برف کی ان ڈھلانوں سے پرے ایک ایسی دنیا تلاش کر سکیں جہاں زندگی بسر کرنے کی آسانیاں ہوں۔'' بوڑھے حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں سمجھا ڈاکٹر۔'' آٹرے نے حیرانی سے کہا۔

''میں تم سے پھر گفتگو کروں گا آٹرے۔'' حیات نے سنجیدگی سے کہا۔

''ضرور۔ اور میں تمہیں خاص طور سے اہمیت دوں گا۔ کیونکہ مستقبل میں تمہارے عقیدت مندوں میں شامل ہوں گا۔ میں تمہاری لڑکی سے اپنی پسندیدگی کا اظہار پہلے ہی کر چکا ہوں۔'' آٹرے نے ہنستے ہوئے کہا اور حیات خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''اے محنت کش بوڑھو۔ مچھلیاں تلاش کرنے کے ہتھیار یہاں جمع کرا دو۔ تم روزانہ صبح یہ ہتھیار یہاں سے حاصل کر سکتے ہو۔ جہاز سے ایسی ہر چیز ہٹا کر اس کیبن میں جمع کر دی گئی ہے جو بطور ہتھیار استعمال ہو سکے۔ کیونکہ انسان کے مزاج کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ یہ رائے ہمارے نوجوان دوست فیروز کی تھی۔ کیونکہ بہر حال مسٹر فیروز دوسروں سے بہتر صلاحیتوں کے مالک ہیں۔'' ایک اور نوجوان نے کہا۔

''ہاں۔ دوسرے نوجوانوں کی ہم میں شمولیت نے ہمارے عزم کو بلند کر دیا ہے۔

خاص طور پر مسٹر فیروز ہمارے لیے ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' آٹرے نے کہا۔

ہتھیار اس طرح جمع کروانے کے تصور سے بوڑھوں کے ذہنوں میں مایوسی کی لہریں دوڑ گئی تھیں لیکن خرم کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ رائے فیروز کی ہے تو اسے اعتماد ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔ فیروز کی نیک نیتی پر وہ آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتے تھے۔ پھر آٹرے کے زیر ہدایت مچھلیاں آپس میں تقسیم کر لی گئیں اور لوگ اپنے اپنے لیے ڈنر بنانے میں مصروف ہو گئے۔

ایک درجن نوجوان ہیڈ کوارٹر میں رہنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ویسے اس کیبن کو ہواؤں سے محفوظ بنا لیا گیا تھا اور بارہ نوجوان بآسانی اس میں رہ سکتے تھے۔ باقی حسب معمول رات کو سونے کے لیے جہاز میں چلے گئے۔ آج ان کے چہروں پر مسرت کی چمک تھی اور آج انہیں لڑکیاں بھی التفات کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

خاصی رات گزر چکی تھی۔ نائلہ اور انیلا ڈاکٹر کے قریب سو رہی تھیں لیکن درحقیقت وہ جاگ رہی تھیں۔ جب انہیں جہاز کے اندر تمام افراد کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو نائلہ نے اپنے ہونٹ ڈاکٹر کے کانوں کے نزدیک کر لیے۔

''کیا آپ جاگ رہے ہیں ڈیڈی؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''ہاں' میں تمہاری رپورٹ کا منتظر ہوں۔'' ڈاکٹر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''میں نے کام آپ کی مرضی کے مطابق کیا ہے۔ ایک ایک لڑکی کو اس کا کام سمجھا دیا گیا ہے۔ لڑکیاں پہلے تو خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ لیکن میں نے کہا کہ ان کی حفاظت کا عزم کر لیا گیا ہے۔ ان پر آنچ اسی وقت آئے گی جب سارے مرد ختم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر انہوں نے کمزوری سے کام لیا تو پھر صورتِ حال دوسری ہو گی اور اس کے بعد ان کی عزت اور ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ تو وہ سب خوش اسلوبی سے اپنا کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ اور اس کے بعد ڈیڈی' شام تک ہم نے ان لوگوں کو اپنا کام انجام دینے کی تربیت دی ہے۔ کل سے ہی وہ اپنا کام کرنا شروع کر دیں گی۔''

''ویری گڈ۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ گویا میں اس طرف سے

مطمئن ہو جاؤں۔"

"میں آپ کو اطمینان دلاتی ہوں ڈیڈی۔ آپ مطمئن رہیں۔"

"میں مطمئن ہوں نائلہ بیٹی۔" ڈاکٹر حیات نے جواب دیا اور نائلہ خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن حسب معمول بوڑھوں کا گروہ شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ نوجوان البتہ ابھی تک بستروں میں اینڈ رہے تھے۔ ان کی چور نگاہیں لڑکیوں کو تک رہی تھیں۔ پھر آٹرے نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں نوجوان لڑکیوں سے مخاطب ہوں۔ برف کے اس ویرانے میں ہماری زندگی حباب کی طرح ہے۔ نہ جانے کون کس وقت موت کا شکار ہو جائے۔ جب موت ہی مقدر ہے تو ہم اس سے خوفزدہ کیوں ہوں۔ زندگی کے جو لمحات باقی ہیں انہیں فطرت کے تقاضوں کے مطابق رنگین کیوں نہ بنایا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مرد کو اگر عورت کی محبت اور سہارا مل جائے تو وہ ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ ممکن ہے آپ لوگوں کا سہارا ہمارے ذہنوں کو ایسی تحریک بخش دے کہ ہم یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب سوچ سکیں۔ ہم نے آپ کے بزرگوں سے بات کر لی ہے۔ انہیں آپ کے اور ہمارے میل جول پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ بات آپ کو بتا بھی دی ہو۔ چنانچہ میں اپیل کرتا ہوں کہ خوف و دہشت کی اس فضا کو قہقہوں میں بدل دیں۔ آپ کو اپنے ساتھی کے انتخاب کی آزادی ہے۔ ہم اس سلسلے میں آپ پر جبر نہ کریں گے۔ ہاں دوسری صورت ممکن ہے ہمیں آپ پر جبر کرنے پر مجبور کر دے۔"

آٹرے خاموش ہو گیا۔

لڑکیوں کے دلوں کی جو کیفیت ہوئی تھی، اس سے وہی بخوبی واقف تھیں، لیکن یہ الفاظ ان کے لیے غیر متوقع نہیں تھے۔ وہ خود کو اس کے لیے تیار کر چکی تھیں۔ اس لیے کسی قسم کے جذبات کا اظہار ان کے چہرے سے نہ ہوا۔

"کیا آپ نے ہماری اپیل قبول کر لی ہے؟" آٹرے نے پوچھا۔

"لیکن ہمارے بزرگوں نے تو ہم سے کچھ اور کہا ہے۔" ایک لڑکی نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"انہوں نے .... انہوں نے کہا ہے کہ ہم .... رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ...."

"ٹھیک کہا ہے۔ دقیانوسی بوڑھوں کی بات ہم نے مان لی ہے۔ اور اس میں حرج بھی کیا ہے۔ ناک خواہ یوں پکڑی جائے یا یوں۔" آٹرے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بہر حال اس بات کی اجازت ہے کہ ان بوڑھوں کے فیصلے کا انتظار کر لیں۔ لیکن اس دوران ہمیں ایک دوسرے سے گھلنے ملنے اور فیصلہ کرنے کا حق تو ہے۔"

"ہاں اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" نائلہ نے جواب دیا اور آٹرے شرارت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تب مس نائلہ۔ میں آپ سے درخواست کروں گا، کیا آپ میرے ساتھ گھومنے چلیں گی؟" اس نے کہا، اور نائلہ شرماتی ہوئی سی آگے بڑھ آئی۔ آٹرے نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ "عیش کرو ساتھیو۔ اپنا کام تو بن گیا۔" اس نے سرنگ کے دہانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور دوسرے نوجوان بھی نعرہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اور پھر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا گروہ باہر نکل آیا۔ وہ ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈالے برف پر پھیل گئے۔ طویل مایوسی کے بعد آج پھر دلوں میں امنگیں جاگی تھیں۔ موت کے اندھیروں سے وہ چند ساعت کے لیے نکل آئے تھے۔ نوجوان جوڑے برف پر کلیلیں کرتے رہے۔ لڑکیاں جانتی تھیں کہ اسی میں ان کی آبرو کی بقا ہے کہ ان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ بیوقوف بنایا جائے۔ نائلہ نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور وہ اپنا رول نہایت خوبی سے ادا کر رہی تھیں۔

آٹرے نائلہ کو لے کر برف کے ایک تودے کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے نائلہ کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ "بالآخر میں نے آپ کو حاصل کر لیا، مس نائلہ۔" اس نے کہا۔

"کیا آپ مجھے پہلے سے پسند کرتے تھے یا اس دن ....؟"

"اوہ، اس منحوس دن کی یاد نہ دلاؤ۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ورنہ میں پیشہ ور

جوڈو ماسٹر ہوں۔ بس قسمت ہی خراب تھی۔ ورنہ تمہارے ڈیڈی کی زندگی نہ بچتی۔ اور جب تم نے مجھے قبول کرلیا ہے تو تمہارے ڈیڈی کو قتل کر کے مجھے افسوس بھی ہوتا۔''

''مجھے تو اس دن بھی افسوس ہوا تھا جب ڈیڈی نے آپ کی درگت بنائی تھی اور آپ برف پڑے بے بسی سے ہاتھ پاؤں پٹخ رہے تھے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد میں نے ڈیڈی سے احتجاج کیا تھا کہ انہیں آپ کے ساتھ برا سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

آٹرے چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ نائلہ اس پر طنز کر رہی ہے یا حقیقت کہہ رہی ہے۔ لیکن چالاک نائلہ کے چہرے سے وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔

''تمہیں کیوں افسوس ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا اور نائلہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''اوہ۔'' آٹرے نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی اور اپنے پیاسے ہونٹ نائلہ کے چہرے کی طرف جھکا دیئے۔ تب نائلہ ایک ادا کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں مسٹر آٹرے۔ اپنے وعدے پر قائم رہیے۔ میں.......... میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں۔ لیکن.......... لیکن رشتہ قائم ہوئے بغیر میں آپ سے قریب نہیں ہو سکتی۔ میں مشرقی لڑکی ہوں اور اپنا آئیڈیل بھی باوقار چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اور آپ کے ساتھی اپنا قول نبھائیں تا کہ ہم آپ کی بیوی بن کر فخر محسوس کریں۔''

''میں اپنا قول نبھاؤں گا نائلہ۔ آپ جیسی محبوب مل جائے تو انسان نہ جانے کیا سے کیا بن سکتا ہے۔ بےفکر رہیں۔ میرا کوئی ساتھی کسی لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکتا۔''

''شکریہ۔ نائلہ نے ایک ادا سے کہا اور آٹرے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اٹھ گیا۔

اسی وقت ایک اور برف کے تودے کے عقب سے ایک چیخ ابھری اور وہ دونوں چونک پڑے۔ آٹرے تیزی سے تودے کے پیچھے دوڑا اور نائلہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ تب انہوں نے ایک شرمناک منظر دیکھا۔ جہاز کی ایک ائرہوسٹس ایک قوی ہیکل نوجوان کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔

''گریگ!'' آٹرے دھاڑا اور نوجوان چونک پڑا۔ اس نے لڑکی کو بدستور نیچے

دبائے ہوئے آٹرے کی طرف دیکھا۔

''بھاگ جاؤ آٹرے۔ جاؤ، یہاں سے ہٹ جاؤ۔''

''کھڑے ہو جاؤ گریگ۔ ورنہ تمہارا حشر بھی جہاز کے نوجوانوں سے مختلف نہ ہو گا۔'' آٹرے نے خونخوار لہجے میں کہا اور گریگ کے سر پر پہنچ گیا۔ گریگ نے اسے ایک گندی سی گالی دی تھی اور آٹرے نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور دوسرے لمحے اس کا گھونسہ گریگ کے منہ پر پڑا۔ گریگ اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا تھا' لیکن وہ بھی کافی قوی ہیکل تھا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں آٹرے پر حملہ کر دیا۔

آٹرے ڈاکٹر حیات کے مقابلے میں واقعی حقیر ثابت ہوا تھا لیکن قوی ہیکل گریگ کے لیے وہ بہت خطرناک ثابت ہوا' اس نے گریگ کے ہر حملے کو ناکام بنا دیا اور کئی بار اسے سر سے بلند کر کے برف پر دے مارا۔ اور پھر اس وقت تک مارتا رہا جب تک گریگ بے ہوش نہ ہو گیا۔ نائلہ نے سہمی ہوئی لڑکی کے لباس سے اس کا برہنہ جسم چھپایا اور پھر وہ اور آٹرے لڑکی کو ساتھ لے کر برف کی سرنگ کی طرف بڑھ گئے۔

آٹرے خود بھی گریگ سے مختلف نہیں تھا لیکن نائلہ کا جادو سر چڑھ کر بولا تھا۔ وہ نائلہ کی محبت سے سرشار ہو گیا تھا اور گریگ کی شامت اسی لیے آئی تھی۔ اگر نائلہ چالاکی سے کام نہ لیتی تو شاید خود آٹرے بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کر سکتا تھا۔ بہرحال وہ اس وقت خود کو ایک شریف النفس انسان ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بھونپو کے ذریعے نوجوانوں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ نوجوان جوڑے ایک جگہ جمع ہو گئے تو اس نے کہا۔

''دوستو۔ یہ طے ہے کہ بوڑھوں نے ہمارے ساتھ ایک باعزت معاہدہ کر کے ہمارے مطالبے کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہمیں لڑکیوں پر تصرف کا حق مل گیا ہے۔ چنانچہ جب ہم نے ان کی بات کو تسلیم کر لیا ہے تو ضروری ہے کہ ان سے کئے ہوئے وعدے کا پاس بھی کریں۔ ابھی کچھ دیر قبل ہمارے ایک ساتھی گریگ نے اپنی ساتھی لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو بچا لیا۔ اور اب میرا حکم ہر نوجوان کے لیے یہی ہے کہ یہ لڑکیاں اگر ہم پر اعتماد کر کے باہر نکل آئی ہیں تو ہمیں ان کا اعتماد برقرار

رکھنا ہوگا۔ اگر کسی نے کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تو اس کا حشر گریگ سے مختلف نہ ہو گا۔ جو برف کی اس چٹان کے عقب میں زخمی' بے ہوش' یا مردہ پڑا ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم سب معاہدے کی پابندی کریں گے۔'' فیروز کی آواز ابھری۔ انیلا اس کے ساتھ تھی اور پھر فیروز کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اس بات کا اقرار کر لیا اور آٹرے ان کا شکریہ ادا کر کے واپس جہاز کی سرنگ کی طرف چل پڑا۔

''مجھے یقین ہے کہ مس نائلہ نے اس وحشی کو رام کر لیا ہے۔'' فیروز نے آہستہ سے انیلا سے سرگوشی کی۔

''شاید۔''

''آپ کافی بجھی بجھی سی ہیں مس انیلا۔ یقین کیجئے آپ میرے ساتھ اس حیثیت سے نہیں ہیں جیسے دوسری لڑکیاں ان بگڑے ہوئے نوجوانوں کے ساتھ ہیں۔ میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اوہ نہیں مسٹر فیروز میں آپ کی شرافت پر بھروسہ کرتی ہوں۔'' انیلا نے کہا اور فیروز گردن ہلانے لگا۔

شام کو بوڑھے واپس آ گئے۔ اس شام فیروز نے بوڑھوں سے ہتھیار بھی واپس نہیں مانگے تھے لیکن بوڑھوں نے مچھلیاں ایک جگہ ڈھیر کرنے کے بعد ہتھیار خود اس ہیڈ کوارٹر میں جمع کر دیئے اور پھر وہ ایک جگہ جمع ہو کر میٹنگ کرنے لگے۔

آٹرے نے انہیں دیکھا اور مسکراتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ ''کیا میٹنگ ہو رہی ہے بزرگو؟'' اس نے ایک بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ بوڑھوں کے چہروں سے کوئی خاص بات عیاں ہے۔ چنانچہ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

ممکن ہے تم ہماری تجویز قبول نہ کرو آٹرے' لیکن اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو بلاشبہ یہ ایک افسوس ناک اقدام ہوگا۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''کون سی تجویز؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس پر غور کروں گا۔'' آٹرے نے کہا۔

''تمہیں یاد ہے ڈاکٹر حیات نے ایک بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم ہم سے تعاون کرو تو ہو سکتا ہے ہمیں یکساں غذا سے نجات مل جائے۔ ہو سکتا ہے ہم اس

ویرانے سے نہ نکل سکیں لیکن ہم برف کی ان ڈھلانوں سے پرے ایک ایسی دنیا تلاش کر سکیں جہاں زندگی بسر کرنے کی آزادی ہو۔''

''اوہ ہاں۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں پھر مجھ سے بات کریں گے۔'' آٹرے نے کہا۔

''درحقیقت مسٹر آٹرے۔ مسٹر حیات اس برف کے جہنم میں ہمارے لیے فرشتہ رحمت ہیں۔ اگر وہ ان مچھلیوں کی نشاندہی کر کے ہمارے لیے غذا کا مسئلہ حل نہ کرتے تو 'ہم میں سے کتنے افراد زندہ ہوتے؟ شاید ایک بھی نہیں۔ ڈاکٹر سے گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر لامحدود علوم کے ماہر ہیں۔ وہ زمین دیکھ کر اس کے جغرافیائی حالات کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان ڈھلانوں سے پرے برف کا دبیز علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور وہاں درخت اور پھل پھول موجود ہیں۔ وہاں خشکی کے جانور بھی مل سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ علاقہ بھی آبادی کی نشاندہی نہ کر سکے لیکن کم از کم وہاں رہ کر زندگی اتنی ناپائیدار نہ رہے گی جتنی کہ اس برف پر۔ فرض کرو یہاں کوئی شدید طوفان آ جاتا ہے۔ اس وقت ہم کہاں ہوں گے۔ برف کے نیچے مچھلیوں کی تعداد بھی ختم ہوتی جا رہی ہے اور وہ چند روز ہی چل سکیں گی۔ اس کے بعد موت یقینی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کیوں نہ زندگی کے لیے' زندگی سے بھرپور ایک کوشش کر لی جائے۔''

''لیکن وہ نئی دنیا ہمیں برف کے ڈھلانوں کو عبور کرنے کے بعد ہی تو حاصل ہو سکتی ہے؟'' آٹرے نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں ہمیں برف کے ڈھلان عبور کرنے ہوں گے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ کیسے؟''

''اس کے لیے بھی ڈاکٹر کی بے پناہ صلاحیتیں کام کر رہی ہیں۔ ہمیں اس عظیم انسان کا شکر گزار ہونا چاہیے مسٹر آٹرے۔ اگر وہ چاہتا تو آج ہم میں نہ ہوتا۔ اپنی لڑکیوں سمیت فرار ہو چکا ہوتا۔ ایسی صورت میں تو ہمارے لیے یہاں سے نکلنے کا تصور بھی ناممکن تھا۔''

''میں اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ براہ کرم آپ میں

سے چند افراد میرے کیبن میں آ جائیں۔'' آٹرے نے کہا۔

''تم ان نوجوانوں کے لیڈر ہو آٹرے' کیا یہ سب تمہاری بات مانیں گے؟''

''ہاں اس کا تجربہ آج ہو چکا ہے۔ آپ مس نائلہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔''

آٹرے نے مختصر الفاظ میں آج کی کارروائی دہرائی اور حیات اور خرم حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''بہر حال تم نے شرافت کا ثبوت دیا ہے آٹرے' بے شک ہم تم سے جو وعدہ کر چکے ہیں اسے ضرور پورا کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے بہتر زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔'' خرم شاہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''میں تیار ہوں۔'' آٹرے نے جواب دیا اور خرم شاہ' حیات اور دوسرے چند لوگ آٹرے کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئے جہاں جہاز کی سیٹیں موجود تھیں' وہ سب ان کرسیوں پر بیٹھ گئے تب حیات نے کہا۔

''میں نے پوری زندگی مہمات میں گزاری ہے۔ ان مہمات نے مجھے زمین پہچاننے کا تجربہ بھی دیا ہے اور اس تجربے کے تحت میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈھلانوں سے پرے سنگلاخ زمین موجود ہے' جہاں درخت' پھل' پھول' اور پانی کے چشمے موجود ہیں۔ ہم وہاں رہ کر بہترین زندگی گزار سکتے ہیں اور ممکن ہے وہاں پہنچ کر ہمیں مہذب دنیا تک سفر کرنے کی سہولت بھی فراہم ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ لیکن یہ ناقابلِ عبور ڈھلان؟''

''برف کی اس ناپائیدار اور تکلیف دہ زندگی سے نجات حاصل کر کے بہتر زندگی گزارنے کے لیے خودکشی کے انداز میں اگر ایک کوشش کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟''

''آپ کے ذہن میں کوئی ترکیب ہے؟'' آٹرے نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں چند روز قبل چند تجربات بھی کر چکا ہوں اور اگر یہ نئی صورتِ حال نہ پیدا ہوتی تو شاید میں اپنے پروگرام پر عمل بھی کر چکا ہوتا۔'' ڈاکٹر حیات نے کہا۔

''خوب' تب آپ مجھے اس تجربے کے بارے میں بتائیں گے ڈاکٹر؟''

''ہاں' لیکن کل صبح۔ میں عملی طور پر اپنے اس تجربے کی نمائش کروں گا۔''

''اگر وہ کامیاب تجربہ ہے ڈاکٹر' تو تم نوجوانوں کو اس کے لئے تیار پاؤ گے۔'' آٹرے نے کہا۔

''ٹھیک ہے چنانچہ باقی گفتگو کل صبح تک کے لیے ملتوی!'' ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ لوگ اٹھ گئے۔ آٹرے انہیں باہر تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا اور پھر وہ مچھلیاں تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اس رات' ڈاکٹر اور نائلہ حسبِ معمول ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ''آٹرے کے رویے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ اس نے کسی لڑکی کی آبرو بچائی تھی؟''

''ہاں یہ حقیقت ہے ڈیڈی۔ لیکن سانپ نے وقتی طور پر کینچلی چڑھالی ہے۔ وہ کسی بھی وقت کینچلی سے باہر آ سکتا ہے۔''

''اوہ۔ میں تفصیل چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔

''صبح کو ان کے تیور خطرناک تھے۔ انہوں نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ اداسی کی فضا ختم کر دیں اور اب جبکہ ان کے بزرگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انہیں نوجوانوں کے سپرد کر دیں گے تو لڑکیوں کو بھی ان کا فیصلہ قبول کر لینا چاہیے۔ میں نے چونکہ تمام لڑکیوں کو سمجھا دیا تھا کہ اگر ہم ان نوجوانوں کو چالاکی سے بیوقوف نہ بنا سکیں تو پھر خودکشی ہی کرنی ہوگی۔ اس لئے لڑکیوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ خود ذلیل آٹرے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میں اس کے ساتھ باہر آ گئی اور پھر میں نے اسے بیوقوف بنا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس وقت تک لڑکیوں کے اور اپنے ضمیر کو داغدار نہ کیا جائے جب تک پروگرام کے مطابق وہ ان کی نہ ہو جائیں۔ وہ گدھا بن گیا اور اسی چکر میں اس نے گریگ کو قتل کر دیا۔''

''اوہ۔'' ڈاکٹر نے گہری سانس لی پھر سرگوشی میں بولا۔ ''بہر حال میرے ذہن کا بوجھ دور ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک زوردار قہقہہ لگاؤں۔ بھیڑیا بھیڑ کی کھال اوڑھ کر بھیڑوں میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ بس اب سو جاؤ نائلہ۔ ممکن ہے کل کا دن ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہو۔''

دوسرے دن صبح حسبِ معمول سب لوگ جاگ گئے۔ وافر مقدار میں مچھلیاں حاصل کی جا رہی تھیں' اس لیے آج کل صبح کا ناشتہ بھی ہونے لگا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سب باہر نکل آئے۔ نوجوان بھی ساتھ تھے۔ تب آٹرے نے نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور بولا۔

''دوستو! بوڑھوں نے ہم سے تعاون کا وعدہ کیا تھا اور اب تک انہوں نے اس پر خلوصِ نیت سے عمل کیا ہے اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ اس ویرانے میں ہم صرف موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ کسی بھی وقت برف کے نیچے مچھلیوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے، برف پر کوئی خوفناک طوفان آ جائے اور ہم سب برف کے نیچے دفن ہو جائیں۔ ایسی صورت میں یہ بوڑھے بھی ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ڈاکٹر حیات کے بارے میں، میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ مچھلیوں کی نشاندہی نہ کرتے تو ہم سب اب تک ہلاک ہو چکے ہوتے۔ انہی ڈاکٹر حیات نے اپنی لامحدود معلومات اور تجربے سے پتہ چلایا ہے کہ برف کی ان ڈھلانوں کے دوسری طرف سنگلاخ زمین موجود ہے۔ جہاں درخت پھل' پھول اور شکار موجود ہے۔ اگر ہم وہاں تک پہنچ جائیں تو برف کے اس ویرانے سے نجات پا سکتے ہیں اور ممکن ہے اس کے بعد بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نکل آئے۔ ڈاکٹر نے وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی تجربہ بھی کیا ہے' جسے وہ ہمارے سامنے دہرانا چاہتے ہیں۔ دوستو! اگر بوڑھے وعدہ کریں کہ وہاں جا کر بھی وہ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے اور بغیر کسی تاخیر کے لڑکیوں کو ہمارے حوالے کر دیں گے تو ہمیں ان کے اس تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

اگر برف کے اس جہنم سے نجات مل سکے تو اس سے بڑی بات اور کونسی ہو سکتی ہے۔'' فیروز نے کہا اور ان تمام نوجوانوں نے ہاتھ اٹھا دیئے جو دراصل بوڑھوں کے ساتھی تھے' اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے نوجوان بھی تیار ہو گئے۔

تب آٹرے نے ڈاکٹر سے درخواست کی۔ ''ڈاکٹر۔ ہم آپ کا تجربہ دیکھنا چاہتے ہیں' لیکن اس سے قبل یہ وعدہ ضروری ہے کہ وہاں جا کر بھی آپ اپنے معاہدے کے پابند

رہیں گے۔''

''مسٹر آٹرے! ہم بوڑھے یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو اس جگہ پہنچ کر بھی ہم آپ کے محکوم ہی رہیں گے۔ وہاں جا کر ہماری قوت تو نہ بڑھ جائے گی۔ میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ اگر لڑکیوں کے حصول سے نوجوانوں کی صلاحیتیں نکھر آتی ہیں تو ہم خوشی سے انہیں ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ ہاں۔ یہ وعدہ ہے۔ یہ ہم سب بوڑھوں کا وعدہ ہے کہ نئی دنیا میں قدم رکھتے ہی نوجوانوں کو تمام لڑکیوں سے منسلک کر دیا جائے اور اجازت دی جائے گی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں۔'' خرم شاہ نے کہا۔

''ہم سب تیار ہیں۔ ہم سب تیار ہیں۔'' نوجوان خوشی سے چیخنے لگے۔ تب بوڑھے حیات نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ سب اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ان کا رخ خوفناک ڈھلانوں کی طرف تھا۔ ڈھلانوں تک کا طویل اور دشوار گزار راستہ طے کر کے وہ اس نشان تک پہنچ گئے جو ڈاکٹر حیات نے کچھ روز قبل ایک تجربہ کرنے کے بعد لگایا تھا۔ ڈاکٹر حیات اس نشان کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

''یہ میرے تجربے کا نشان ہے۔ یہاں برف بہت ہلکی ہے اور اس کے نیچے ویسے ہی سیاہ پتھر موجود ہیں جو میں نے بطور نشان لگایا ہے۔ کیا نوجوان چند وزنی پتھر کاٹنے میں میری مدد کریں گے؟''

''ضرور۔'' چند نوجوانوں نے کہا' اور پھر وہ برف توڑنے والی کدالوں سے برف ہٹا کر پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چار پانچ وزنی پتھر اکھاڑ لئے گئے اور پھر ڈاکٹر کے اشارے پر ایک پتھر نشان سے دور لے جایا گیا' اور ڈھلان کے کنارے پر پہنچ کر اسے نیچے لڑھکا دیا گیا۔ پتھر کسی برق رفتار گھوڑے کی طرح برف کی ڈھلانوں پر پھسلنے لگا اور نوجوان وہ خوفناک منظر دیکھنے لگے۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر پتھر زور سے اچھلا اور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ نوجوانوں کے دل دہل اٹھے تھے۔

''اس لیے میں نے یہ جگہ ناموزوں قرار دے دی۔'' بوڑھے حیات نے کہا اور پھر اس نے ایک پتھر اسی انداز میں نشان کے دوسرے طرف لڑھکایا۔ اس پتھر کا حشر بھی ویسا

ہی ہوا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے تین پتھر اس نشان کے سامنے آگے پیچھے رکھے گئے' اور پہلے پتھر کو نشان کے سامنے والے ڈھلان میں دھکیل دیا گیا۔ پتھر کا طوفانی سفر شروع ہو گیا اور وہ تیزی سے نگاہوں سے دور ہوتا گیا لیکن اس پتھر نے برف کے طویل و عریض میدان کو بخوبی پار کر لیا اور اس کی سیاہی اس وقت تک نظر آتی رہی جب تک نگاہوں کی حد ختم نہ ہو گئی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر دوسرے اور پھر تیسرے پتھر کو بھی اسی طرح لڑھکا دیا گیا اور ان دونوں پتھروں نے اپنا سفر بخیر و خوبی طے کر لیا۔

نوجوان خوفزدہ نظروں سے اس تجربے کو دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر حیات نے دلچسپ نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر بولا۔ ''میں نے طے کیا تھا کہ ایک چوڑی سِل کاٹوں گا جس میں چاروں طرف برف کھودنے والے آلات کیلوں کی طرح گاڑ دیئے جائیں گے۔ میں اس پر نرم چیزیں بچھا کر انہیں اس قابل بنالوں گا کہ انسانی جسم کو ان پر تکلیف نہ ہو۔ پھر رسیوں کی مدد سے میں اپنی دونوں بچیوں اور خود کو ان کیلوں سے جکڑ لوں گا اور اس کے بعد ہم ان ڈھلانوں کا سفر شروع کر دیں گے اور اس وادی تک پہنچ جائیں گے جو اس برف کے قید خانے سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور جہاں رہ کر زندگی زیادہ کٹھن نہیں رہے گی۔ ہم وہاں سے آگے بڑھنے کے انتظامات بھی کر سکتے تھے لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میں خود غرضی سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے سوچا اپنی تجویز دوسروں کے سامنے پیش کر دوں تاکہ دوسرے بھی ہمت کریں۔ میں پورے خلوص سے اپنا پروگرام آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہم نے اس برف سے گزر کر اس وادی میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب آپ سب کو اس سفر کی دعوت دیتے ہیں۔ سفر کا طریقہ کار البتہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔'' حیات نے خاموش ہو کر نوجوانوں کے خشک ہونٹ اور خوفزدہ آنکھیں دیکھیں اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مجھے آپ کے چہرے دیکھ کر دکھ ہوا ہے۔ آپ جو ہم بوڑھوں کو قتل کرنے کے لیے بڑے پر جوش نظر آ رہے تھے، میری تجویز سن کر دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ عجیب رنگ ہے آپ کے خون کا۔ کیا آپ کی دلیری یہیں تک محدود ہے؟''

''طنز نہ کریں ڈاکٹر۔'' آٹرے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''بلاشبہ آپ کا تجربہ خطرات

سے بھرپور ہے' لیکن برف کے اس ویرانے میں سسک کر موت کا انتظار کرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ ایک بار زندگی کی بھرپور جدوجہد کر لی جائے۔ اس جدوجہد میں موت آ جائے تو وہ زیادہ بہتر ہو گی۔ میں تمام نوجوانوں کے بارے میں تو نہیں کہتا' لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے چند ایسے ضرور ہوں گے جو اس جدوجہد میں حصہ لینا پسند کریں گے۔ لیکن اس سے قبل چند سوالات ضروری ہیں۔''

''کیا؟''

''نمبر ایک۔ کیا ہمیں پتھروں پر اس انداز میں سفر کرنا ہو گا' جس طرح آپ نے بتایا ہے؟ نمبر دو۔ کہیں آپ بوڑھے ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کر رہے؟ نمبر تین۔ اگر ہم اس وادی میں بخیر و خوبی پہنچ گئے تو کہیں آپ لوگ اپنے وعدوں سے انحراف تو نہ کریں گے؟''

''بس یہی سوال ہیں؟'' ڈاکٹر حیات نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''سوال نمبر ایک کا جواب ہے کہ اس سلسلے میں' میں ایک بات کہہ چکا ہوں کہ سفر کا طریقہ کار اجتماعی طور پر تھوڑا سا بدل دیا گیا ہے جس کے بارے میں' میں ابھی بتاؤں گا۔ سوال نمبر دو کا جواب ہے کہ کسی قسم کے دھوکے کا امکان یوں نہیں ہے کہ یہ سفر اجتماعی طور پر کیا جائے گا۔ یعنی ہم سب ساتھ ہوں گے۔ زندگی یا موت جو کچھ بھی ہو گا ساتھ ہو گا اور سوال نمبر تین کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے یہاں بھی خود کو بے بس نہیں سمجھا ہے۔ یہاں بھی ہم تم سے اس وقت تک جنگ کر سکتے ہیں جب تک ہم سب ختم نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے ہم بزدل ثابت نہیں ہوں گے۔ لیکن ہم نے نوجوانوں کے مطالبات کو عقل کی روشنی میں پرکھ کر صرف اس لیے منظور کر لیا کہ ممکن ہے اس سے ان کی صلاحیتیں جاگ اٹھیں اور وہ یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ سوچ لیں۔ یہی کوشش اس وادی میں پہنچنے کے بعد ہو گی۔ چنانچہ کسی قسم کے انحراف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔''

آٹرے گردن ہلانے لگا پھر اس نے کہا۔ ''میں مطمئن ہوں ڈاکٹر' اب براہِ کرم وہ طریقہ بتائیے جس کے تحت ہم سفر کریں گے۔''

ڈاکٹر حیات نے مسکراتے ہوئے نوجوانوں کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''ہم تباہ شدہ طیارے کے ڈھانچے کو برف کے پہاڑ سے کھود کر نکال لیں گے۔ اس کا سامنے کا ٹوٹا ہوا حصہ درست کرلیں گے اور پھر اسے ڈھلان تک لے آئیں گے۔ پھر ہم سب اس طیارے میں بیٹھ جائیں گے اور طیارہ ڈھلان پر چھوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ہمارا سفر بذریعہ طیارہ ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے طیارہ فضا میں پرواز نہیں کرے گا بلکہ برف پر دوڑے گا۔''

''اوہ!'' آٹرے کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ حیران نگاہوں سے ڈاکٹر حیات کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے بہت سے نوجوانوں کے چہرے بھی سرخ ہو گئے تھے۔ پتھر پر سفر کرنے کی بہ نسبت طیارے کے ڈھانچے میں سفر کرنے کا تصور زیادہ دلچسپ تھا اور اس کے لیے تقریباً سبھی تیار تھے جس کا اندازہ ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔

''کیا خیال ہے دوستو! کیا زندگی کی اس جدوجہد میں تم حصہ لینے کے لیے تیار ہو؟''

''ہم سب تیار ہیں۔'' تقریباً سبھی نے بیک وقت جواب دیا۔

''ڈاکٹر حیات درحقیقت عظیم دماغ رکھتے ہیں۔ اس ناگہانی آفت میں اگر ڈاکٹر حیات ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم سب اب تک مر کھپ گئے ہوتے۔ ان کی لازوال ذہانت نے غذا کا مسئلہ حل کیا اور اب ڈاکٹر کی ذہانت نے ایک اور گل کھلایا ہے۔ درحقیقت برف پر یہ تیز رفتار سفر زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں ڈاکٹر۔ ہم سب آپ کے زیر ہدایت کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

آٹرے نے اعلان کیا اور نوجوان تالیاں بجانے لگے۔ ان میں بوڑھوں کی تالیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن چند چہرے ایسے بھی تھے جو صرف مسکرا رہے تھے۔ اور ان کی مسکراہٹ میں موت چھپی ہوئی تھی۔ جیسے خرم شاہ۔ ڈاکٹر حیات۔ فیروز...............اور پھر رہ جاتا تھا میں۔

کیا آپ مجھے بھول گئے۔ میں جس نے اپنی زندگی کا ایک طویل ترین حصہ آپ کو

دیا ہے۔ آپ نے میری کہانیوں کی پذیرائی کی ہے۔ میں نے آپ کے لیے حسین ترین کہانیاں لکھی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہانیاں کیسے لکھی جاتی ہیں۔ انسانوں کا تجزیہ کرکے، حالات کا تجزیہ کر کے۔ کہانیاں حقیقتوں سے دور نہیں ہوتیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ حقیقتوں کو ہی کہانی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ان حقیقتوں کو جو بڑی انوکھی بنیادیں رکھتی ہیں۔ میری بے شمار کہانیاں ایسی ہیں جو میں نے انسانوں سے اخذ کی ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ کہانیاں سنائی ہیں اور میں نے انہیں تراش خراش کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ یہ کہانیاں خود بخود نہیں بن جاتیں۔ بڑی کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے ان میں تب کہیں جا کر ان کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ کہانیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ ایسی کہانیاں جن میں آپ کا جو دل چاہے کہہ سکتے ہیں۔ کوئی انہیں حقیقت سے دور کہتا ہے۔ اور کوئی پڑھ کر کہتا ہے کہ مزا نہیں آیا۔ لیکن ایک کہانی کی تخلیق میں، ایک واقعے کی کانٹ چھانٹ میں بہت سی نگاہوں سے پسندیدگی کی سند حاصل کرنے کے لیے نجانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔

تو بات ہو رہی تھی اس پراسرار ہولناک اور سنسنی خیز ماحول کی۔ دماغ کی رو جس طرف بھی بھٹک جائے۔ ڈاکٹر حیات، خرم شاہ اور دوسرے وہ سارے دانشور جو اب اس برف کے ویرانے کے قیدی بن گئے تھے، اپنی اپنی تکے بازی کر رہے تھے اور میں نے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ میں ایک تماشائی کی حیثیت سے، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ! میں تو بس یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بے جان وجود کی مانند ان سب کے درمیان تھا۔ ویسے بھی کچھ لوگوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی کہ وہ دوسروں کو بچا کر لے جائیں گے اور وہ سوچ رہے تھے کہ جن لوگوں نے ان کی پذیرائی کی ہے یا جو لوگ ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے ہیں، وہ سارے کے سارے ان سے اتفاق رکھتے ہیں۔ یہ تو میری نگاہ تھی جو یہ دیکھ رہی تھی کہ بے شمار افراد ان احمقانہ منصوبوں کو مذاق اڑانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر حیات نے کسی ایک شخص سے بھی مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ صرف عمل کیا تھا چنانچہ کون ایسا تھا جو اپنے آپ کو کسی سے کم سمجھتا۔ لیکن اس سلسلے میں جو کارروائی ہو رہی تھی اس کے لیے میری رائے محفوظ ہے۔ بہرحال ایک اور سلسلہ ہوتا

ہے۔ انسان اپنے طور پر جو بھی منصوبہ بندی کر لے' فیصلے کر لے، اصل فیصلہ تقدیر کا ہوتا ہے۔ اتنے دن ہو گئے تھے ان برف کے ویرانوں میں۔ سوائے اس کے کہ چھوٹی چھوٹی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی سو لوگوں نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی ایک حقیقت ہے اور کوئی ایسا نہیں ہے جو یہاں تبدیلی پیدا کر سکے۔ بے شک کوئی ایسا نہیں تھا لیکن قدرت تو تھی۔ اب یہ قدرت کی مرضی کہ وہ کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی۔ باقی جو منصوبہ بندی کی جا رہی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ جہاز میں سفر کرنے والے لاتعداد افراد میں ہر طبقہ فکر کے لوگ موجود تھے۔ ان میں مہم جوؤں کی تعداد بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ میری گہری نگاہیں بے شمار گروپوں کا جائزہ لے چکی تھیں۔ کچھ تنہا تھے۔ کچھ ایسے جن کے ساتھ پوری پوری ٹولیاں تھیں۔ سارے کے سارے ایک ہی مشکل میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بہر حال میری نگاہوں نے بہت سے لوگوں کے چہروں پر بہت کچھ دیکھا تھا جو غالباً دوسرے لوگ اتنی آسانی سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ یہ سب غور کرنے کی باتیں تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ جس انداز میں یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر رہے ہیں وہ تو بڑا ہی سنسنی خیز ہے۔ یہاں آ کر ایک بڑا دلچسپ احساس دل کو ہوتا تھا وہ یہ کہ خوبصورت اور خوفناک مہماتی کہانیاں لکھ لینا ایک آسان سا کام ہے لیکن خود کسی مہم جوئی کا حصہ بننا اس سے بالکل مختلف۔ کوئی بھی ہو زندگی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور میں کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں کہوں گا۔ بے شک میرا مشغلہ دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف تھا یعنی یہ کہ میں صرف چہرہ شناسی کر رہا تھا اور میرے ذہن میں لاتعداد کہانیاں بنتی جا رہی تھیں بلکہ سب سے بڑی کہانی تو یہی تھی کہ میں جس جہاز سے سفر کر رہا تھا وہ حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور ہم ایک ایسی نامعلوم دنیا میں لمحے گزار رہے تھے جس کی صحیح سمت کا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب میری اپنی معلومات تو خیر ایک طرح سے نہ ہونے کے برابر تھیں لیکن جہاز کے ان مسافروں میں لاتعداد لوگ مجھے ایسے نظر آ رہے تھے جو واقعی سنجیدہ اور سنسنی خیز احساسات کے مالک تھے۔ میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

''اصل میں بعض اوقات کچھ لوگ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جیسے یہ ڈاکٹر

حیات۔ آخر انہوں نے کیوں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ہمارے لیڈر ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس سے ہم سب کو اتفاق ہے۔ حماقت کا ایک عجیب سا نمونہ!''

''تو کیا تم ڈاکٹر حیات کی اس مہم میں شریک نہیں ہو گے؟''

''یار کوئی عقل کی بات ہے۔ قدرت نے اس ورق پر زندگی کے کچھ دن لکھ دیئے ہیں تو انہیں ان بڑے میاں کے منصوبوں پر عمل کر کے موت کے حوالے کر دیا جائے۔ آخر کیوں؟''

''ویسے زیادہ تر لوگوں کو ڈاکٹر حیات کے ساتھ دیکھا ہے میں نے۔''

''ذرا سفر کا آغاز ہو پھر دیکھنا۔''

یہ تو انسانی سوچ تھی' قدرت کی سوچ کا اظہار اس شام پانچ بجے سے شروع ہو گیا۔ اچانک ہی آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ لیکن ایک بڑی عجیب بات تھی ان بادلوں کا رنگ بالکل مختلف تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے کسی نئی اور انوکھی قسم کے بادل آئے ہوں۔ ان میں نارنجی رنگ کا عنصر بہت زیادہ تھا اور یہ نارنجیاں جھلکتی چلی آ رہی تھیں یہاں تک کہ سفید برف پر نارنجی سایوں کے نشانات ابھرنا شروع ہو گئے اور اس کے بعد اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی۔ برف پر اگر ہوا چلے تو مزا ہی دے جاتی ہے۔ برف سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں جسموں کے مسامات میں شامل ہو کر اندر تک سے گلا دیتی ہیں جبکہ ہم تو یہاں بے یار و مددگار تھے' کھلی ہوا کے باسی' ان کپڑوں پر بھروسہ کرنے والے جو کسی نہ کسی شکل میں ہمیں حاصل ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ہمارے تھے اور کچھ ادھر ادھر کے' میں نے بھی اپنے جسم کو کپڑوں سے خوب اچھی طرح لپیٹ لیا اور ایک جگہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر تو ہوا کا وہ طوفان آیا کہ دیکھنے والی آنکھیں دہشت سے بینائی کھو بیٹھیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو فضا میں اڑتے دیکھا۔ ہوا کے تیز جھونکے انہیں بلند سے بلند کر دیتے۔ لاتعداد افراد میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ قدرت نے یہ چند روزہ زندگی عارضی طور پر بخشی تھی اور اب صحیح معنوں میں اختتام ہے۔ بہر حال یہ ساری ہنگامہ آرائیاں ہواؤں کے ساتھ جاری رہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ گم ہو گئے۔ سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ برف بالکل ڈھک گئی تھی۔ میں یہ سوچ رہا

تھا کہ دیکھو کب ہوا کا کوئی تیز جھونکا مجھے فضاؤں کی سیر کراتا ہے۔ کوئی تین گھنٹے تک یہ تیز ہوا چلتی رہی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہوا کا یہ طوفان ڈھلنے لگا لیکن اس کے بعد بارش شروع ہوگئی۔ بارش بھی کمال کی تھی۔ بوندیں جسم پر پڑتی تو یوں لگتا جیسے کوئی ڈنڈے مار رہا ہو۔ لیکن سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ کم از کم ہوا نے معاف کر دیا تھا، بارش کو دیکھو یہ کیا کہتی ہے۔ بہرحال ساری صعوبتیں اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیں' لیکن اس کے بعد جب دوسری صبح سورج نکلا تو منظر ہی نہیں ماحول بھی بدل چکا تھا۔ برف کے وہ عظیم الشان ٹیلے زمین بوس ہو چکے تھے جو جگہ جگہ کھڑے نظر آتے تھے۔ بے شمار افراد کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر حیات اور اس کی دونوں بیٹیاں بھی غائب تھیں۔ اس کے علاوہ بے شمار نوجوان ان گہرائیوں میں جھانک رہے تھے۔ جہاں کہیں کہیں رنگین دھبے نظر آ جاتے تھے۔ یہ دھبے ان لوگوں کے رنگین لباس تھے' جو صرف ایک رات پہلے ان سب کے ساتھی تھے۔ برف کی گہرائیوں میں کہیں کہیں انسانی جسم اس طرح بھی نظر آ رہے تھے کہ دونوں ٹانگیں برف سے باہر تھیں اور باقی جسم اندر لیکن ان ٹانگوں میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ سب سے زیادہ ہولناک منظر وہ تھا جب ہماری نگاہیں اس جہاز پر پڑیں جس کے ذریعے خوفناک سفر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس جہاز کا نام ونشان تک موجود نہیں تھا بلکہ برف کے پہاڑ کا وہ حصہ ہی غائب ہوگیا تھا جس پر جہاز ٹکا ہوا تھا۔ اس منظر پر سب ہی شدید خوفزدہ تھے اور ہر شخص داستان عبرت بنا ہوا تھا۔

اس شخص پر میری نگاہ تیسری بار پڑی تھی جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ بلند و بالا قد و قامت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، خوبصورت نقوش' لیکن چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ایک جلال سا اس کے چہرے پر ہو۔ میں نے پہلی ہی نگاہ میں اس کے بارے میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور میرے ہی وطن کا باشندہ ہے۔ لیکن یہاں کچھ ایسی افراتفری پھیلی ہوئی تھی کہ بس جو قریب آ گیا اس سے سلام دعا ہوگئی اور جو ذرا فاصلے پر نظر آیا اس کے متعلق یہی سوچ کر رہ گئے کہ کبھی ملاقات کی جائے۔ اس وقت وہ شخص مجھ سے کچھ فاصلے پر ہی بیٹھا ہوا خلا میں گھور رہا تھا۔ اتفاقیہ طور پر مجھ سے نگاہیں ملیں تو بے اختیار بول اٹھا۔

"اور اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہوتی کہ انسان اپنے آئندہ کے منصوبوں کے لیے خود ہی فیصلے کر لے۔ میں آج اپنے والد کے یہ الفاظ یاد کرتا ہوں تو ایک عجیب سا عالم دل پر گزر جاتا ہے۔ میرے مرحوم والد کہا کرتے تھے کہ دنیا کا کوئی بھی عمل کرنے کے بارے میں سوچو یا زبان سے نکالو تو انشاء اللہ کا لفظ کہہ لو اگر اپنی اور اپنے اس عمل کی بقاء چاہتے ہو۔ انشاء اللہ کے بغیر اگر کوئی فیصلہ کن بات تم نے کہی تو ایک طرح سے یہ سمجھ لو کہ وہ شرک میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی مرضی کے بغیر آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگلا سانس تک نہیں لے سکتے۔ پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ سب کچھ ہیں اور آپ یہ کر لیں گے آپ وہ کر لیں گے۔"

میں نے اس کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیا ڈاکٹر حیات کا کچھ پتا چلا؟"

"کچھ لوگوں نے اسے اور اس کی بیٹیوں کو ہوا میں دو سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب وہ جہاں ہوگا اس کا اندازہ لگا لیا جائے۔ خیر جدید لوگوں کی اپنی جدید دنیا ہے لیکن میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر حیات انشاء اللہ کے ساتھ اپنے کسی عمل کی بات کرتے تو ہوتا تو وہی جو اللہ تعالیٰ کا حکم اور اس کی مرضی تھی۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت ہمارے درمیان موجود ہوتے۔ یہ جدید لوگ جو نماز پڑھتے ہوئے یہ سوچتے ہیں کہ چلو سر پر ٹوپی رکھنا ضروری تو نہیں ہے اور اپنی منطق تراش لیتے ہیں۔ اول تو ان کا نماز پڑھنا ہی بڑا عجیب ہوگا کیونکہ اس میں بھی جدیدیت کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن ان کا یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں' اپنے سے بڑوں سے تمیز و ادب سے پیش آتے ہیں۔ اللہ کا احترام تو ہمارے وجود اور ہماری فطرت کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ اس احترام میں اگر ہم سر ڈھک کر اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو یہ ہمارا فرض ہے۔ لیکن لوگ نہیں سوچتے۔"

"آپ بہت مذہبی آدمی معلوم ہوتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"آہ' نہیں ایسی بات نہیں ہے میں تو برائیوں کی ایک پوٹ ہوں۔ اگر آپ میری برائیوں کی تفصیل سنیں گے تو دانتوں تلے انگلی دبالیں گے۔"

"آپ کا چہرہ، آپ کی شخصیت معاف کیجئے گا محترم بڑی ہی کشش انگیز اور پر اثر ہے۔ کاش میں آپ کے بارے میں جان سکتا۔"

اس نے اپنی روشن و مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ "تو جان لیجئے۔ یہاں ہمیں اور کیا کرنا ہے۔ ماضی کو یاد کرنے سے طبیعت میں ایک فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑی بڑی عجیب اور دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں ماضی کی بھی۔ میرے بارے میں سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ وہ حسین بستی جہاں کا میں باشندہ ہوں آپ یقین کریں میں اسے کائنات کا سب سے حسین علاقہ تصور کرتا ہوں کیونکہ میں نے اپنی آنکھ وہی کھولی تھی۔"

"مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟"

"میں یہی کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ وقت گذاری کے لیے یہی مشغلہ اختیار کیا جائے۔ یہاں ہر شخص کی اپنی ایک کہانی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے جتنے سانس ہمیں یہاں ملے ہیں، ان میں ان کہانیوں ہی سے دل بہلایا جائے۔"

"آپ مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟"

"ہاں!" اس نے کہا اور یہیں سے صوفی عظمت اللہ کی کہانی کا آغاز ہو گیا۔



صوفی عظمت اللہ بستی کے ہر دلعزیز لوگوں میں تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ نیک اور دیندار آدمی تھے۔ بستی کے ہر شخص کے کام آنے والے، کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ سچ بولتے تھے اور پورا تولتے تھے۔ کسی کو کبھی ان کی ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ دکان پر اور دکان بند کرنے کے بعد جو وقت ملتا تھا، وہ مذہب کی تبلیغ میں صرف کرتے تھے۔ عالم نہیں تھے لیکن سچی باتوں پر باعمل ضرور تھے اور یہی سب کچھ دوسروں کو بتاتے تھے۔ اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا منور تھا جس کی عمر اب سات سال کے قریب تھی۔ چنانچہ اس چھوٹی سی دکان کی آمدنی دونوں باپ بیٹوں کو بہتر کفالت کے لئے کافی تھی۔ ایک بھائی تھے جو بستی کے موذن تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مسجد سے ملحق مکان میں رہتے تھے۔ قدرت اللہ بھائی کی بہ نسبت دینی تعلیم سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے لیکن عظمت اللہ کی ہر دلعزیزی سے کبیدہ خاطر رہتے تھے اور بھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کی ملاقاتیں رسمی سی تھیں۔ بھائیوں والی یگانگت موجود نہیں تھی۔ صوفی عظمت اللہ کی نیک فطرت کی وجہ سے بستی والوں کو ان کے اختلاف کی خبر نہیں تھی۔

صوفی عظمت اللہ صبح ہی صبح نئی گڑھی سے دکان کے لئے سودا خریدنے گئے تھے۔ بارش کا موسم تھا اور اس موسم میں بستی والے بستی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ راستے میں ایک برساتی ندی پڑتی تھی جسے پار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ذرا سی بارش میں ایسی چڑھتی کہ ہاتھی ڈباؤ پانی ہو جاتا اور اسے عبور کرنا ناممکن۔ کریم علی نے منع کیا کہ اس موسم میں نہ جائیں لیکن وہ مسکرا کر بولا۔

دکان میں بہت سی چیزیں ختم ہوگئی ہیں کریم بھائی! بارش کا کیا! ٹھیک ہے اگر جھڑی لگ گئی تو ہفتوں پر بات جائے گی اور دکان بند کرنی پڑے گی۔ بس صبح جاؤں گا اور دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔"

لیکن اس کے جاتے ہی بارش شروع ہوگئی اور پھر تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ گھر میں منور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ معصوم بچہ کسی خطرے سے بے نیاز اپنے مشاغل میں مصروف رہا۔ صوفی صاحب دوپہر تک واپس نہیں آئے، شام کو بھی نہیں آئے، رات کو بھی نہیں آئے اور سہا ہوا منور پڑوس کے ایک گھر میں پہنچ گیا۔

"ابو جی ابھی تک نہیں آئے کریم چچا!" اس نے پریشانی سے کہا۔

"ارے کیا وہ صبح کو چلے گئے تھے؟"

"ہاں کہہ گئے تھے دوپہر تک آ جاؤں گا۔"

"فکر مت کرو بیٹے! بارش کی وجہ سے ندی چڑھ گئی ہوگی۔ اس لیے وہ دوسری طرف رک گئے ہوں گے۔ بارش رکی تو ندی اتر جائے گی اور ممکن ہے وہ کل ہی آ جائیں۔ تم کھانا وغیرہ کھاؤ اور آرام سے یہاں سو جاؤ۔ بیوی منور بیٹے کو کھانا کھلا دو۔"

کریم علی نے اپنی بیوی سے کہا اور منور بہل گیا۔

بارش رات میں کسی وقت رک گئی تھی۔ دوسری صبح آسمان صاف تھا۔ منور باپ کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے روزمرہ کے معمول کے مطابق گھر اور دکان کی صفائی کر لی تھی لیکن دوپہر کو ایک روح فرسا خبر بستی میں پہنچی اور بستی کے لوگ غم واندوہ میں ڈوب گئے۔

کنہیا اپنی بیل گاڑی میں بستی پہنچا تھا اس نے بستی والوں کو بتایا کہ کل دوپہر کو وہ بستی واپس آ رہا تھا۔ لیکن ندی چڑھی دیکھ کر اسے ندی عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی وقت صوفی عظمت اللہ بھی ندی کے کنارے پہنچے تھے۔ وہ ندی عبور کرنے کے لیے بے چین تھے۔ کنہیا نے انہیں روکا تو انہوں نے کہا کہ ابھی ندی زیادہ نہیں چڑھی ہے۔ بستی میں منور ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر وہ نہ پہنچے تو منور پریشان ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ پانی میں اتر گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ تیرتے رہے لیکن پھر پانی کا پرشور ریلا آیا۔ اس وقت وہ عین درمیان میں تھے پھر دو تین بار وہ پانی ابھرے اور اس کے بعد غائب ہو گئے۔ کنہیا دوبارہ

انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

یہ خبر پوری بستی میں پھیل گئی۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تو صوفی صاحب کی لاش کی تلاش بھی فضول تھی۔ تاہم بستی کے گھڑسوار ندی کے کنارے کنارے میلوں دور تک گئے۔ ندی کے کیچڑ میں بھی عظمت اللہ کی لاش کی تلاش کی گئی لیکن بے سود۔ ان کا کوئی نشان نہیں مل سکا۔

بستی اندوہ میں ڈوب گئی۔ جس نے سنا افسوس کیا۔ قدرت اللہ بھی تڑپ کر پہنچ گئے اور دہاڑیں مارنے لگے۔ اختلافات اپنی جگہ تھے لیکن وہ بھائی کی موت کے خواہاں نہیں تھے۔ تنہا منور کو انہوں نے سینے سے لگا لیا۔ بستی کے بے شمار لوگ منور کو سینے سے لگانے کے لیے تیار تھے لیکن چچا کی موجودگی میں کسی کے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ تھا۔ چنانچہ منور ان کی تحویل میں پہنچ گیا۔ بیگم قدرت اللہ نے البتہ ان کے اس اقدام پر سخت اختلاف کیا تھا۔

"ہن برس رہا ہے نا جیسے گھر میں۔ بچوں کی پرورش جیسے کر رہی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔ اب ایک اور فرد کا اضافہ کر لیا تم نے۔ کھانا، کپڑے، بیماری آزاری، میں کہتی ہوں کہ یہ سب کہاں سے ہوگا۔"

"کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا۔ میں اس کا چچا ہوں۔ آخر بستی والوں کی شرم و حیا بھی کوئی چیز ہے۔ لوگ کیا کہتے اگر ہمارے ہوتے ہوئے یہ دوسروں کے ہاں پلتا۔" قدرت اللہ نے جواب دیا۔

"بڑے چہیتے بھائی تھے نا۔ ہمیشہ تمہاری کاٹ میں رہے۔ کبھی پنپنے نہ دیا۔ صوفی بن گئے تھے اور ہمارا حق مارتے تھے۔ میں کہتی ہوں بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ پیسے پیسے کی بچت ضروری ہے۔ ہم اس کا خرچ کہاں سے برداشت کریں گے کیا لڑکیوں کو گھر میں بٹھا کر بوڑھا کرو گے؟"

"خدا کی بندی بھائی صاحب اس قدر قلاش بھی نہیں تھے۔ تھوڑی سی عقل سے بھی کام لو۔ منور اگر ہمارے ساتھ رہے گا تو بھائی صاحب کی چھوڑی ہوئی ہر چیز ہماری ملکیت بن جائے گی۔ اس غریب کا ہمارے علاوہ کون ہے۔ دکان میں اگر کچھ بھی نہیں تو ہزار

پانچ سو کا سامان ضرور ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کا مکان بھی ہے۔ اور بھی کچھ رکھا ہی ہوگا انہوں نے۔"

"ایں!" بیگم قدرت اللہ سنبھل گئیں پھر بولیں۔ "ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب دکان کون چلائے گا۔ جو سامان اس میں ہے اسے گھر لے آؤ۔ وہاں پڑے پڑے خراب ہوگا۔"

"افوہ۔ چند روز تو رکو۔ فوراً ہی یہ سب کچھ کرلوں گا تو بستی والے کیا کہیں گے۔"

قدرت اللہ نے جواب دیا اور ان کی بیگم خاموش ہوگئیں۔ صوفی عظمت اللہ کی طرح ان کے بھائی صاف دل نہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ زن مرید قسم کے لوگوں میں سے تھے خود ان کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ جس طرف بیوی کا اشارہ ہوتا اسی طرف چلتے۔ چنانچہ اس گفتگو کے بعد وہ بھی اس انداز میں سوچنے لگے۔ بھائی کی موت کے بعد دل میں ان کی محبت ابھری تھی۔ لیکن رو دھو کر ٹھیک ہو گئے تھے۔ بھتیجے کو لائے تو خلوص سے تھے لیکن بیگم کی مخالفت اور دلائل سے گھبرا گئے۔ جان چھڑانے کے لیے دکان اور مکان کا ذکر بادل نخواستہ کر دیا تھا لیکن اب سوچ رہے تھے کہ ٹھیک ہی تو ہے۔ منور کہاں پرورش پائے گا۔ خرچ بھی تو ہوگا۔ دکان چلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سات سالہ منور کیا کرے گا۔ چنانچہ سامان لے آنا ہی بہتر ہوگا۔ رہ گیا مکان تو اس کی فروخت کے سلسلے میں جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہوگا۔ جب بچیوں کی شادی ہوگی تب اسے بیچ کر کام چلایا جائے گا۔ بیگم کو بھی یہی سمجھانا مناسب ہے۔

قدرت اللہ صاحب مطمئن ہو گئے لیکن انہوں نے بیگم کو سمجھا دیا تھا کہ منور کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے تاکہ بستی والے انگشت نمائی نہ کر سکیں۔ ورنہ لوگ بھائی صاحب سے اس قدر متاثر ہیں کہ یہ خود منور کو سینے سے لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

بیگم قدرت اللہ زمانہ ساز خاتون تھیں۔ صوفی صاحب سے ہمیشہ سے کینہ رکھتی تھیں۔ منور کو سینے سے لگانے کا کیا سوال تھا لیکن دکان اور مکان کا معاملہ ایسا تھا جو انہوں نے اب سے چند لمحات قبل نہیں سوچا تھا۔ اب بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے

شوہر سے وعدہ کیا کہ وہ مطمئن رہیں منور کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

معصوم بچہ ان زمانہ ساز لوگوں کے ساتھ رہنے لگا اور چند ہی دنوں میں اس کے دل سے باپ کی جدائی کا اضطراب ختم ہوگیا۔ چچی امی کی محبت اور چچا کی شفقت نے اس کے معصوم دل کو مطمئن کر دیا۔ بستی کے لوگوں کو کافی عرصے تک صوفی عظمت اللہ یاد رہے۔ منور پر بھی نگاہ رکھی گئی۔ لیکن چچی اور چچا کے سلوک سے مطمئن ہو گئے۔ ظاہر ہے خون خون کے درمیان تھا، اس میں کسی کھوٹ کی کیا گنجائش تھی۔

لیکن بیگم قدرت اللہ مطمئن نہیں تھیں۔ منور انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا انہیں زہر لگتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ منور سے گھر کے کام لئے جانے لگے اور اس نے خوش دلی سے یہ فرائض سنبھال لیے۔ لیکن پھر ان کے کاموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ بچہ بچہ منور کا محتاج ہوگیا۔ اب بکریوں کے لئے چارہ لانے سے رات کو قدرت اللہ صاحب کے پاؤں دبانے تک کی ذمہ داری منور کے کاندھوں پر آ پڑی۔ کمزور شانے اس بوجھ سے چور چور ہو جاتے تھے۔ زبان کھولی تو مار پڑنے لگی۔ قدرت اللہ صاحب بھی دوسروں سے پیچھے نہیں تھے۔ جب بیگم منور کی مخالف تھیں۔ تو پھر وہ اس کے ہمدرد کس طرح رہ سکتے تھے! چنانچہ منور کی بدبختی کا دور شروع ہوگیا۔ اُسے اس ماحول سے نفرت ہونے لگی، لیکن اس کی سوچ محدود تھی اور اپنے طور پر وہ بالکل بے بس تھا.................!

باپ کے بتائے ہوئے چند اصول اسے اب بھی یاد تھے۔ چنانچہ سچ بولتا تھا اور جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا سیدھے راستے اپناتا تھا لیکن ان دنوں وہ شدید کشمکش کا شکار تھا۔ کئی واقعات ہوئے تھے جن میں اس نے سچ بولا تھا اور مار کھائی تھی۔ اگر وہ سچ نہ بولتا تو شاید مار نہ کھاتا۔ اس نے اس بارے میں بارہا سوچا لیکن جھوٹ کے لیے زبان ہل ہی نہیں سکتی تھی۔ سچ بات ہمیشہ منہ سے نکل جاتی تھی۔

جمعہ کے دن قدرت اللہ لوگوں کو مسائل سمجھاتے تھے۔ عبادت کرنے، سچ بولنے اور یتیموں، بیواؤں کے ساتھ اخوت و عدل کا درس دیتے تھے، سچ بولنے کی ہدایت کرتے تھے لیکن ان میں سے بہت سی باتیں منور کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

"چچا میاں"۔ ایک رات پاؤں دباتے ہوئے اس نے قدرت اللہ کو آواز دی۔

"ہوں، پیشاب لگ رہا ہوگا۔ دو منٹ پاؤں دباتے نہیں کہ لگا پیشاب۔ چل پاؤں دبا ذرا زور سے۔ لگ رہا ہے تو لگنے دے!" قدرت اللہ نے ڈانٹ پلائی اور وہ زور زور سے پاؤں دبانے لگا۔

"پیشاب نہیں لگ رہا چچا میاں۔" تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا۔

"تو پھر؟"

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"۔

"پوچھ مگر پاؤں دبائے جا!" قدرت اللہ نے کہا۔

"اخوت و عدل کسے کہتے ہیں؟" اس نے پوچھا اور قدرت اللہ چونک پڑے۔

انہوں نے گردن اٹھا کر منور کو دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"یتیموں کے ساتھ عدل کرنا چاہیے یا اخوت............؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا لیکن قدرت اللہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ظلم ہو رہا ہے تجھ پر یہاں! گوشت کاٹا جا رہا ہے تیرا، کیوں! ذرا سے گھر کے کام کر لیتا ہے تو طنز کر رہا ہے کمینے حرام خور۔" قدرت اللہ نے ایک لات رسید کی اور منور اچھل کر چارپائی سے نیچے جا پڑا۔ کافی چوٹ لگی تھی اس کے لیکن اس مار کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر یہ الفاظ اتنے برے تھے تو قدرت اللہ صاحب مسجد میں دوسرے لوگوں سے کیوں کہتے تھے۔ وہ رونے لگا اور قدرت اللہ نے اٹھ کر مزید دو لاتیں اس کے رسید کر دیں پھر کمرے سے باہر نکال دیا۔

اس دن کے بعد سے ان لوگوں کا رویہ اس کے ساتھ اور سخت ہو گیا۔ قدرت اللہ اب اس سے پاؤں نہیں دبواتے تھے۔ لیکن انتہائی نفرت کا سلوک کرتے تھے اس کے ساتھ۔ سارے گھر سے الگ ڈیوڑھی میں وہ زمین پر سوتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں لحاف وغیرہ کا بھی بندوبست نہیں تھا اس کے لیے لیکن تنہا سوتے ہوئے اسے بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔ اپنے باپ صوفی عظمت اللہ کے الفاظ اسے یاد تھے۔ "انسان کو صابر و

شاکر ہونا چاہیے۔ برا وقت گزر ہی جاتا ہے۔" چنانچہ خوف سے بچنے کیلیے وہ آنکھیں بھینچ لیتا تھا اور اس طرح اسے نیند آ جاتی تھی۔

اس دن وہ بکریوں کے لیے چارہ لینے گیا تھا۔ قبرستان کے اس طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ایک پگڈنڈی کسی دوسری بستی کو گئی تھی۔ چارے کا گٹھڑ باندھ کر اس نے سر پر رکھا اور واپس پلٹ پڑا۔ پگڈنڈی سے ایک گھڑ سوار گزر رہا تھا۔ یہ چوہدری گوپال شرما تھے۔ بستی کے سب سے بڑے زمیندار! کئی بار منور نے انہیں گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھا اور سوچا تھا کہ نجانے لوگوں کے پاس گھوڑے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ کتنے اچھے لگتے ہیں چوہدری صاحب گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اور کیا مزہ آتا ہوگا انہیں۔

دور تک وہ چوہدری صاحب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ بھی چارے کا گٹھڑ سنبھال کر پگڈنڈی پر ہو لیا لیکن ابھی چند قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک چیز پر نگاہ پڑی۔ کپڑے کی تھیلی سی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور تھیلی کے قریب پہنچ گیا۔ گٹھڑ اتار کر ایک طرف رکھا اور جھک کر تھیلی اٹھا لی۔ اس کا منہ کھولا تو اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ "یہ تھیلی ضرور چوہدری کی ہے۔ وہی ابھی ادھر سے گزرے ہیں۔" اس نے سوچا۔ وہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا تھا کہ بھاگ کر چوہدری صاحب کو پکڑے اور تھیلی انہیں دے دے۔ پھر............ اور اسے یاد آیا کہ ایک دن مسجد میں ایک شخص کچھ رقم لایا تھا اور اس نے مولوی قدرت اللہ سے اعلان کرایا تھا کہ جس کی رقم ہو وہ نشانی بتا کر لے جائے۔ یہی ترکیب اچھی ہے۔ چچا میاں یہ تھیلی چوہدری صاحب کو پہنچا دیں گے۔ اس نے تھیلی اپنے لباس میں رکھ لی اور پھر گٹھڑ اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چارہ ایک طرف رکھا۔ بہت سے برتن دھونے کے لیے رکھے تھے۔ قدرت اللہ صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ برتن دھونے میں لگ گیا۔

پھر جب اس نے قدرت اللہ صاحب کی آواز سنی تو جلدی جلدی باقی برتن رکھ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

"چچا میاں!...... یہ...... یہ......" اس نے تھیلی لباس سے نکال کر ان کی طرف

بڑھادی۔

''کیا ہے؟'' قدرت اللہ صاحب اب اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔

''پیسے ہیں چچا میاں''۔

''کیسے پیسے!'' قدرت اللہ نے تھیلی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور پھر اسے کھول کر دیکھنے لگا لیکن اس کے اندر نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ اس نے سراسیمہ نگاہوں سے منور کو دیکھا۔

''یہ...... یہ کہاں سے آئے ہیں۔''

''چوہدری گوپال شرما جی قبرستان والی سڑک سے اپنی گھوڑی پر گزر رہے تھے، ان کی گر گئی۔ مگر ان کی گھوڑی اتنی تیز دوڑتی ہے کہ میں بھاگ کر ان کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو میں اسے لے آیا تاکہ آپ اسے چوہدری جی کو دے دیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان کے گھر دے آؤں۔'' منور نے پوچھا۔

لیکن قدرت اللہ صاحب کے ذہن میں تو سائیں سائیں ہو رہی تھی یہ رقم...... یہ رقم...... تو ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اس رقم سے تو ان کے سارے دلدر دور ہو سکتے ہیں۔ بچیوں کی شادی ہو سکتی ہے، نیا مکان بن سکتا ہے، وہ کسی دوسری بستی میں جا کر کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ مسجد کی روٹیاں کھاتے کھاتے دل بھر گیا تھا۔ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے لیکن آج...... آج موقعہ مل گیا تھا۔

''دے آؤں چچا جان؟'' منور کے سوال نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے زور سے تھیلی بھینچ لی اور پھر آہستہ سے بولے۔

''نہیں...... میں خود پہنچا دوں گا۔ میں خود دے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے چچا میاں!'' منور نے کہا اور وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ مولوی صاحب عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ منور............ کہیں وہ ان کے اور ان کی اولاد کے مستقبل کا قاتل نہ بن جائے۔ اگر اس نے کسی سے اس رقم کا تذکرہ کر دیا تو...... تو رقم ان سے چھن جائے گی۔ اتنی بڑی دولت تو وہ پوری زندگی میں نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح محنت کرتے رہیں پھر بھی اتنی بڑی دولت

لیکن منور کا کیا کریں! انہوں نے تھیلی جلدی سے اپنے بستر میں چھپا دی اور بستر پر لیٹ گئے۔ بہت سے کام کرنے تھے انہیں لیکن اب تو ہاتھ پاؤں ہل بھی نہیں رہے تھے۔ پورا بدن اینٹھ رہا تھا۔

''اس وقت کیوں لیٹے ہو؟'' ان کی بیگم نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔

''بس ایسے ہی۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے رقیہ۔''

''کیا بات ہے؟''

''بخار محسوس ہو رہا ہے۔'' انہوں نے رقیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس عورت کو اپنا راز بتایا جائے یا نہیں۔ کہیں یہ بھی کسی سے کہہ نہ دے...... لیکن رقیہ ان کی بیوی تھی۔ ان کے دکھ سکھ کی ساتھی...... وہ بھلا کسی سے کیوں کہے گی۔

''دوا منگوا لوں تمہارے لیے؟''

''ارے نہیں ٹھیک ہو جاؤں گا بس' کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' قدرت اللہ بولے پھر رقیہ جانے لگی تو انہوں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

''سنو رقیہ۔'' اور رقیہ رک گئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے قدرت اللہ کو دیکھ رہی تھی۔

''ایک الجھن آن پڑی ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''رقیہ! اسے دیکھو۔'' انہوں نے بستر کے نیچے سے تھیلی نکال کر رقیہ کے ہاتھ میں دے دی۔ رقیہ نے تھیلی لے کر اسے کھولا اور اس کی بھی بری حالت ہو گئی۔

''ارے...... ارے...... یہ تو بہت ہیں...... یہ تو بہت ہیں یہ...... یہ......''

''میں اسی وجہ سے پریشان ہوں رقیہ! یہ تھیلی منور کو ملی ہے کہہ رہا تھا کہ چوہدری شرما گھوڑی پر جا رہے تھے۔ ان کی گری ہے۔ میں اسے واپس کر آؤں۔ رقیہ! اتنی بڑی رقم ہے یہ کہ ہماری تقدیر بدل جائے گی۔ اس بستی کو چھوڑ کر کسی دوسری بستی میں جا رہیں گے اور............ اور......'' قدرت اللہ ہانپنے لگے۔

رقیہ بیگم کا چہرہ بھی دہکنے لگا۔ دولت کی آگ ان کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ تب وہ آہستہ سے بولیں۔

"مگر تم اس رقم کو دبا جاؤ۔ واپس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"منور کا کیا کرو گی رقیہ! کسی سے کہہ دیا کم بخت نے تو...... تو کتے کی موت مارے جائیں گے۔ جو کچھ ہے وہ بھی چھن جائے گا۔"

"تو پھر چپکے سے گردن دبا دو ناس پیٹے کی...... کسی ندی میں پھینک آؤ...... اس کے دم سے مصیبتیں ہی مصیبتیں ملی ہیں۔ ہمیں پھل کیا ملا......" رقیہ نے کہا۔

"کوسنے سے کام نہیں چلے گا رقیہ بیگم! کچھ کرنا ہوگا۔ اگر تھیلی شرما جی کو پہنچا دی تو واہ واہ تو ہو جائے گی لیکن اس سے کیا ملے گا۔ جبکہ ابھی یہ رقم ہماری ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ یہ رقم ہم تک پہنچ گئی ہے۔"

"نفیسہ کے ابا! جو میں کہہ رہی ہوں وہی کرو۔ ایمان سے ہمت کر جاؤ پوری زندگی سکون سے گزرے گی۔ اس وقت ہمت کر جاؤ اپنے بچوں کے لیے۔ دنیا تو اولاد کو پالنے کے لیے نجانے کیا کیا کرتی ہے۔" رقیہ نے کہا اور قدرت اللہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے اسے باز رکھنے کا؟" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔

"ممکن ہی نہیں ہے۔ سانپ کے بچے سنپولے ہوتے ہیں۔ زہر پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔ نہیں نفیسہ کے ابا! منور بچ گیا تو ہمیں پھنسا دے گا۔ یا تو رقم واپس کر آؤ یا پھر دوسرا کام کرو۔"

"خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا رقیہ! اور پھر قتل...... اگر پتہ چل گیا تو...... تو پولیس لے جائے گی۔"

"پتہ چلے گا ہی کیسے...... گردن دبا کر رات کو نکل جانا اور ندی میں ڈال آنا۔ صبح کہیں سے کہیں جا پہنچے گا۔ ہم جھوٹ موٹ اس کو تلاش کریں گے اور رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی محبت کرنے والے چچا چچی بھلا کوئی غلط حرکت کر سکتے ہیں۔"

"ہوں!" قدرت اللہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر انہوں نے رقیہ سے کہا۔

"تم اسے ذرا میرے پاس بھیج دو۔ کہلوا دینا مجھے بخار آ گیا ہے۔ آج اذان

وغیرہ وہی دے اور نماز پڑھا دے۔"

"ٹھیک ہے۔" رقیہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ قدرت اللہ نے تھیلی پھر چھپا دی تھی اور پھر وہ منور کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہاتھ پونچھتا ہوا پہنچ گیا۔ قدرت اللہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"منور! رقم کی یہ تھیلی تم نے کہیں سے چرائی تو نہیں ہے۔"

"نہیں چچا میاں! اگر چراتا تو آپ کو کیوں دیتا...... یہ میں نے پگڈنڈی سے اٹھائی ہے اور آپ اسے چوہدری شرما کو دے دیں۔"

"تم نے کس کس کو یہ بات بتا دی؟"

"کسی کو نہیں چچا میاں! کیوں؟"

"کیا یہ ممکن ہے منور کہ تم اس کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤ۔ اس میں کافی دولت ہے۔ ہم لوگ بلکہ تم بھی اسے مزے سے خرچ کریں گے۔ عمدہ عمدہ کپڑے بنائیں گے۔ کسی دوسری بستی میں چل کر رہیں گے۔"

"ایں" منور حیران رہ گیا۔ "لیکن یہ پیسے تو شرما جی کے ہیں۔"

"انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا۔ کون کہے گا ان سے۔ دیکھا ہی کس نے ہے۔"

"یہ گناہ ہے چچا میاں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ابا نے کہا تھا کہ دوسرے کی دولت پر کبھی نگاہ نہ رکھو۔"

"تم بس زبان بند رکھنا۔ بھول کر بھی کسی کو مت بتانا کہ تمہیں ایسی کوئی تھیلی ملی ہے۔" قدرت اللہ کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تھیلی مجھے ملی تھی چچا میاں! میں شرما جی کو ضرور بتا دوں گا۔ یہ تو بڑا گناہ ہے۔"

"ہاں!" قدرت اللہ صاحب ہنس پڑے۔ "شاباش! تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ میں تو صرف تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ تم امتحان میں پاس ہو گئے۔ کیا کر رہے تھے؟"

"جی۔ جھاڑو دے رہا تھا۔"

"تم یہاں بیٹھو۔ آج جھاڑو کوئی اور دے دے گا۔ میری طبیعت خراب ہے ہاں

ذرا سر دبا دو۔'' قدرت اللہ نے کہا۔

شام کا کھانا بھی انہوں نے منور کو اپنے کمرے میں ہی کھلایا تھا۔ رقیہ کئی بار ان کے پاس آ چکی تھی۔ ایک مرتبہ قدرت اللہ صاحب نے سرگوشیوں میں اسے کچھ کہا تھا۔

شام ہوئی تو بستی تاریک ہوگئی۔ سرِ شام ہی لوگ گھروں میں جا گھسے تھے۔ یوں بھی سردیوں کے دن تھے۔ بستی کا ہر گھر بند ہوگیا تو قدرت اللہ نے منور کو دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ گھٹنے سر میں دیئے ہوئے تھے۔ بدن پر پتلی سی چادر پڑی ہوئی تھی۔ قدرت اللہ نے سارا دن اسے گھر سے باہر نہیں جانے دیا تھا اور رات کا کھانا کھاتے ہی وہ اونگھنے لگا تھا پھر وہیں زمین پر لیٹ کر سو گیا تھا۔ قدرت اللہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ باہر نکل کر انہوں نے رقیہ کو آواز دی اور وہ جلدی سے پہنچ گئی۔

''ذرا باہر کا چکر لگا کر آؤ۔ اور ہاں۔ ذرا مسجد میں بھی دیکھ لینا کوئی ہے تو نہیں۔''

''ابھی آئی''۔ رقیہ نے جواب دیا اور باہر نکل گئی۔

''کسی چڑیا کے بچے کا بھی پتہ نہیں ہے۔ مسجد خالی پڑی ہے۔ اتنی سردی میں کون ہے جو مسجد میں نظر آئے۔'' اس نے واپس آ کر جواب دیا۔

''بوری کہاں ہے؟''

''باہر موجود ہے۔''

''اٹھا لاؤ۔'' قدرت اللہ نے بولے اور کانپتے بدن کے ساتھ سوتے ہوئے منور کی طرف بڑھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوسرے لمحے منور کی پتلی سی گردن ان کے آہنی ہاتھوں میں تھی۔ انہوں نے دانت کچکچا کر پوری قوت اس کی گردن پر صرف کر دی اور منور کا کمزور بدن پھڑکنے لگا۔ اور پھر بدن ساکت ہونے کے بعد ہی انہوں نے گردن چھوڑ دی۔ اب ان کے دل کی دھڑکنیں معتدل ہوگئی تھیں۔ کپکپاہٹ بھی ختم ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نگاہ انہوں نے مردہ منور پر ڈالی اور پھر باہر نکل آئے۔ رقیہ بوری لیے کھڑی تھی۔

''اندر آ جاؤ!'' انہوں نے اسے آواز دی اور شقی القلب عورت اندر داخل ہوگئی۔

دونوں نے مل کر منور کو بوری میں ٹھونسا اور اس کا منہ باندھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر

قدرت اللہ بوری لئے دروازے پر آ گئے۔ جھانک کر باہر دیکھا اور پھر بوری کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئے۔ ان کا رخ بستی سے باہر ندی کی جانب تھا جو تقریباً ایک میل دور تھی۔ اس وقت ان کے بدن میں بلا کی چستی تھی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ بستی کے کتوں سے خطرہ تھا لیکن سردی کی وجہ سے کتے بھی دبکے ہوئے تھے البتہ قدرت اللہ کو سردی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ان کے بدن میں دولت کی گرمی بھری ہوئی تھی۔

انتہائی برق رفتاری سے انہوں نے ندی تک کا فاصلہ طے کیا اور ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ پانی پرشور آواز کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے بوری ندی میں اچھال دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تیزی سے بہتے ہوئے دیکھنے لگے۔ لاش آن کی آن میں بہتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ تب قدرت اللہ واپس چل پڑے۔ ان کا ذہن متضاد خیالات کا شکار تھا۔ ایک اچھا مستقبل ان کی نگاہوں میں تھا اور وہ اس بڑی رقم کی حفاظت کے لیے کوئی عمدہ ترکیب سوچ رہے تھے۔ اسی سوچ میں وہ گھر پہنچ گئے۔ رقیہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''کام ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ کوئی بچہ تو نہیں جاگا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں سب سو رہے ہیں۔'' رقیہ نے جواب دیا اور قدرت اللہ صاحب گہری گہری سانسیں لینے لگے پھر انہوں نے بستر کے نیچے سے تھیلی نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگے۔

رقیہ اسے کہیں زمین میں دفن کر دو۔ انتہائی احتیاط سے۔ میرا خیال ہے یہیں میرے پلنگ کے نیچے...... ہم اسے کچھ دنوں کے لیے بھول جائیں گے اور بات جب دب جائے گی تو پھر یہ بستی چھوڑ دیں گے۔''

دونوں میاں بیوی نے تھیلی ایک صندوقچے میں رکھ کر زمین میں دفن کر دی۔ اس کے بعد قدرت اللہ لیٹ گئے۔ لیکن نیند...... آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی، ایک انوکھی بے چینی تھی۔ رقیہ بھی جاگ رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔

یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ تب قدرت اللہ صاحب اٹھ گئے۔ اذان کا وقت ہوگیا تھا۔ معمول کے مطابق انہیں اذان دینی تھی۔ انہوں نے وضو کیا اور مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن مسجد میں قدم رکھتے ہی ان پر ایک عجیب سی دہشت طاری ہوگئی۔ وہ اذان دینے جا رہے تھے۔ اذان...... اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ ان کا بدن کانپنے لگا لرزتے قدموں سے وہ منبر کی طرف بڑھے اور پھر کانوں میں انگلیاں دے کر آواز بلند کی۔

"اللہ اکبر...... اللہ...... " لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے بدن پر شدید کپکپی طاری ہوگئی۔ ان کی آواز کانپنے لگی۔ ان کے پورے وجود میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ بے چین ہو گئے۔ "میرے ...... میرے...... معبود ...... میرے معبود...... میں بہک گیا تھا...... مجھے...... مجھے شیطان نے۔" لیکن پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے ہوش وحواس سنبھالے اور اذان دے کر نیچے اتر آئے۔ ایک سنہرا مستقبل ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

صبح ہو چکی تھی اور تیز رفتار ندی میں ایک بوری ڈوبتی اچھلتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن جوں جوں اس کا سفر طے ہو رہا تھا۔ بوری کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی کیونکہ ندی کناروں کو پھیلا رہی تھی اور جوں جوں کنارے پھیلتے جا رہے تھے پانی کو سکون مل رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی گہرائی ختم ہونے لگی اور رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تب ہی ایک جاندار کی آواز ابھری جو کسی کو مخاطب کر رہا تھا۔ وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک درخت سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

بوسیدہ لباس، بازو خون سے تر، چہرے پر نقاہت، بال بکھرے ہوئے، داڑھی بکھری ہوئی۔ لیکن گھوڑے کی آواز پر وہ اس طرح تڑپ کر اٹھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وحشیانہ انداز میں اس نے قریب ہی درخت سے ٹکی کھڑی بندوق گرفت میں لی اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ رخ اس کا گھوڑے کی جانب ہی تھا جو ندی کے کنارے کھڑا تھوڑی دیر قبل پانی میں منہ ڈالے پانی پی رہا تھا اور پھر اچانک منہ اٹھا کر ہنہنانے لگا تھا۔ گویا اس نے کوئی خاص چیز دیکھ لی تھی۔ اونگھنے والا کسی اور ہی جذبے کا شکار تھا۔ اس کی نگاہ اس جانب تو نہ اٹھی جس طرف دیکھ کر گھوڑا ہنہنایا تھا بلکہ وہ تیزی سے اچھل کر گھوڑے کی پشت پر چڑھ گیا اور پشت پر ہی کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں دور

دور تک بکھری چٹانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک جانب درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے لیکن تاحد نگاہ پہاڑیاں سنسان تھیں اور کوئی ان کے درمیان حرکت نہیں کر رہا تھا۔ تب اس نے حیرانی سے گھوڑے کو دیکھا اور اس کی نگاہ بوری پر پڑی جو گھوڑے سے تقریباً تیس قدم کے فاصلے پر ایک ابھرے ہوئے پتھر کے نزدیک رکی ہوئی تھی۔

"اوہ۔ یہ کیا ہے؟" اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے کود آیا۔ چند ساعت وہیں کھڑا بوری کو دیکھتا رہا اور پھر بندوق اس نے ایک طرف پھینک دی اور پانی میں داخل ہو گیا۔ پانی اس کی پنڈلیوں سے اونچا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان سے بوری کے نزدیک پہنچ گیا۔ بوری کے بندھے ہوئے منہ کو کھولتے ہوئے کئی بار اس کے منہ سے کراہ کی آواز نکل گئی اور بازو کے زخم سے خون دوبارہ رسنے لگا۔ لیکن اس نے بوری کھول لی اور اس کے اندر دیکھ کر چونک پڑا۔

"ارے"۔ اس کے منہ سے دوسری آواز نکلی۔

منور کی معصوم صورت مظلومیت کی تصویر بنی اس کے سامنے تھی اور یہ بے بسی کا کچھ ایسا انداز تھا کہ دردنا آشنا دل بھی پگھل گیا اور اس نے بوری سے اس نیم مردہ جسم کو نکال لیا۔ پھر اسے بازوؤں میں اٹھائے کنارے پر آ گیا۔ کنارے کی نرم ریت پر منور کو آہستگی سے لٹا کر اس نے اس کے سینے پر کان رکھ دیا اور ننھے سے دل کی مظلوم آواز سن کر اس کے موٹے ہونٹوں پر خوشی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحات کے لیے وہ اپنے بازو کی تکلیف بھول گیا تھا۔ اس نے بچے کا سینہ کھول کر اس کے دل پر مالش شروع کر دی اور پھر اس کے اعضا کو جنبش دینے لگا۔ بدن پر جگہ جگہ پتھروں سے ٹکرانے کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔ خون کی روانی بحال ہونے لگی اور چہرے کی سفیدی سرخی میں تبدیل ہونے لگی۔ جوں جوں بچے کے بدن میں زندگی کے آثار ابھرتے آ رہے تھے وحشی صفت آدمی کی آنکھوں میں خوشی ابھر رہی تھی۔

پھر اس نے اعضاء کی حرکت روک دی کیونکہ سب اعضاء خود جنبش کرنے لگے تھے۔ ننھے ننھے ہونٹ وا ہو رہے تھے۔ خشک زبان بار بار ہونٹوں پر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ کنارے سے چلو میں پانی بھر کر لایا۔ ایک ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی سے ننھا

سامنہ چیرا اور پانی اس میں آہستہ آہستہ ٹپکانے لگا۔ آبِ حیات کے چند قطروں نے حیات کو جلا دی اور آنکھوں کے دریچے کھل گئے۔ زندگی نے اپنے وجود کا اعلان کیا تھا لیکن کوئی احساس ان میں موجود نہ تھا۔

اس دوران وحشی انسان کے بازو کا زخم پھر خون اگلنے لگا تھا چنانچہ اس نے اس کی طرف بھی توجہ دی اور زخم پر بندھی ہوئی پٹی درست کرنے لگا۔ اس طرح خون کی روانی تو رک گئی لیکن چھوٹے چھوٹے قطرے زمین پر ٹپکتے رہے۔ وہ دوبارہ اس ننھے وجود کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس شکل کو دیکھنے سے بازو کے زخم کی تکلیف کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”پانی کی اولاد اب تو ٹھیک ہے۔ اٹھ کر بیٹھ کلیجے! ذرا تجھ سے باتیں کروں اور پوچھوں کہ سیر کا اور وہ بھی ندی کی سیر کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ ایں۔ ابے بولے گا نہیں۔“ اس نے پیار سے بچے کا گال نوچ لیا۔ لیکن زمین پر پڑا بچہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا۔ تب وحشی انسان کی بھنویں سکڑ گئیں۔ اس کی نگاہ بچے کی گردن پر پڑے نشانات پر اٹھ گئی تھی اور پھر وہ ان نشانات پر جھک گیا۔

”اوہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تو کسی کے انتقام کا شکار ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ چچ چچ۔۔۔۔۔۔ لوگ انتقام لیتے ہوئے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہو گا کوئی عورت' دولت یا زمین کا کھیل زمین کے چپے چپے پر یہی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے کھلاڑی ہیں یہ دنیا والے۔۔۔۔۔۔“

اس نے ایک جماہی لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر چونک پڑا۔ ”اب تیری وجہ سے بستی جانا ضروری ہو گیا ہے کلیجے۔ میں ان سسروں کو ساری زندگی ان پہاڑوں میں نچا سکتا ہوں۔ مجال ہیں چھو لیں مجھے۔۔۔۔۔۔ جنگل کی جڑی بوٹیوں سے علاج بھی کر لوں گا اپنا۔ مگر تیری حالت دیکھ کر اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ کوئی ترکیب کرنی ہو گی۔ مگر کیا ترکیب کی جائے، کیا ترکیب ہو سکتی ہے، تو ہی بتا دے چھچھوندر۔“ وہ زمین پر پڑے بچے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔

”دھت تیرے کی۔۔۔۔۔۔ ہنسنا رونا تو اپنا سب کچھ بھول گیا۔ پر کوئی پرواہ نہیں ہم

سب کچھ سکھا دیں گے۔ سب بتا دیں گے تجھے۔۔۔۔۔۔ کیا سمجھا پانی کی اولاد۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس کی ایک ایک ادا سے وحشت ٹپکتی تھی۔



پھر وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ سورج پہاڑیوں سے ابھر رہا تھا۔ پھر جب سورج بلند ہوا تو وہ وحشی صفت انسان کوئی ترکیب سوچ چکا تھا۔ اور اس ترکیب پر اسے خود ہنسی آ رہی تھی۔ پھر اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ سورج کی حرارت نے اس کے بدن کو بھی تقویت بخشی تھی لیکن خوف کی وجہ سے اس کی سمجھ بوجھ' اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ وحشی صفت انسان کے سہارے سے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اس کے حواس بے جان تھے۔ تب وہ اٹھ کر اس درخت کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ تھوڑی دیر قبل بیٹھا تھا۔ درخت کے نیچے کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ اس نے اس سامان میں سے لمبا سا ایک چاقو نکالا اور پھر اپنے بازو کا زخم دیکھنے لگا۔ گولی کا سوراخ صاف نمایاں تھا لیکن گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور ہڈی بچ گئی تھی۔ وہ چند ساعت ہمت کرتا رہا اور پھر اس نے چاقو سے اپنے بازو کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور خون اس کے لباس پر پھیل رہا تھا۔ حلق سے کسی درندے کی سی غراہٹ نکل رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے چاقو ایک طرف ڈال دیا۔ اور پھر لڑکے کی طرف دیکھنے لگا۔

”دیکھ کیا رہا ہے خرگوش! خون کے ایک ایک قطرے کی قیمت وصول کریں گے تجھ سے۔۔۔۔۔۔ بھول مت جانا ہماری بات کو۔“ وہ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔ زخم کی تکلیف سے اس کا چہرہ بہت خوفناک ہو رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے کرتے سے کپڑے کا ایک اور ٹکڑا پھاڑا اور اسے زخم پر کس لیا۔ نجانے کس دل گردے کا انسان تھا۔ یہ سب کچھ عام لوگوں کا کام نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے ندی کے قریب آ کر اپنا چہرہ پانی میں بھگو دیا اور تیز دھار چاقو کو اپنے چہرے پر آزمانے لگا۔ وہ اپنی داڑھی صاف کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا چہرہ صاف ہو سکا۔ بڑے جاندار چہرے کا مالک تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے پانی میں شکل دیکھی اور پھر ہنس پڑا۔

”اب ٹھیک ہو گیا سب کچھ۔۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ میں نے طوفان۔۔۔۔۔۔ ادھر

آ بھیئے......ادھر آ......'' اس نے گھوڑے کو چمکارا اور گھوڑا اس کے نزدیک آ گیا۔

''ہم تو جا رہے ہیں پوت! اب یہ تیرا کام ہے کہ کس طرح ڈیرے پہنچے گا۔ پیچھا مت کرنا سسرے ورنہ پکڑے جائیں گے۔ سمجھ گیا نا...... جا بھاگ جا......'' اس نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ مارا اور گھوڑا آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ تب اس شخص نے اپنی بندوق، چاقو اور دوسری چیزیں پانی میں پھینک دیں پھر بچے کو اٹھا کر کندھے پر اس طرح بٹھایا کہ اس کے پاؤں وحشی صفت انسان کے سینے پر لٹکے ہوئے تھے اور اس کے بعد وہ جنگلوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی چال میں کوئی لغزش نہیں تھی اور وہ بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔

درختوں تک کا فاصلہ اس نے کافی تیزی سے طے کیا اور ان کے قریب پہنچ کر لڑکے کو کندھے سے اتار دیا۔

''بس تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جا چندا! ابھی چلتے ہیں......صرف تھوڑی سی دیر......بس ایک کام اور کر لیں تا کہ ان سالوں کو شبہ نہ ہو۔'' وہ درختوں میں گھس کر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں توڑنے لگا اور تھوڑی دیر میں اس نے ٹہنیوں کا خاصا ڈھیر اکٹھا کر لیا۔ ایک گیلی ٹہنی سے اس نے اس ڈھیر کو درمیان سے باندھا اور لڑکے کے قریب پہنچ کر دوبارہ اسے کاندھے پر بٹھا لیا۔ ٹہنیوں کے ڈھیر کو گھسیٹتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ سفر گوست رفتاری سے ہو رہا تھا لیکن وہ کسی جانی بوجھی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے انداز میں اطمینان تھا۔ درختوں کا سلسلہ عبور کر کے وہ ایک میدان میں پہنچ گیا۔ دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی اور دور دور تک کے مناظر نمایاں تھے۔ ناہموار زمین کے اختتام پر بلندی تھی اور جب وہ ان بلندیوں کو عبور کر رہا تھا تو اس نے پولیس کے بہت سے جوان دیکھے جو گھوڑوں پر سوار اس طرف آ رہے تھے۔ گویا امتحان کا وقت آ گیا تھا۔ پولیس کے جوان بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے اور دوسرے لمحے انہوں نے منتشر ہو کر اس کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ بہت سوں نے بندوقیں بھی تان لیں تھیں۔ وہ ٹھٹک گیا اور اپنی جگہ رک کر انہیں دیکھنے لگا۔ پولیس کے جوان بندوقیں تانے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان میں سے کئی گھوڑوں سے اتر گئے تھے اور انہوں نے اس کا نشانہ لے لیا تھا۔ اس کے

چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت ابھر آئی اور وہ معصوم نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تمہارا خیال تھا تم ہمارے ہاتھوں سے بچ جاؤ گے منگل سنگھ!'' ایک پولیس افسر اس کے نزدیک پہنچ کر گھوڑے سے اترتے ہوئے بولا۔

''جے رام جی کی مہاراج!'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''یہ لڑکا کہاں سے اٹھا لائے؟ کون ہے یہ؟'' پولیس افسر نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''ہمارا بالک ہے مہاراج! گیتی ہے اس کا نام اور ہم اندھیرا ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' پولیس افسر نے غرا کر کہا۔

''بپتا پڑی ہے ہم پر مہاراج! باگھی بستی میں رہویں ہیں۔ روز لکڑیاں لینے آتے ہیں یہاں پر، کبھی ایسا نہیں ہوا۔ باگھ نے حملہ کر دیا ہمارے اوپر اور ہمارے بالک کو اٹھا کر لے جانے لگا۔ پر مہاراج سنتان کے لیے تو جیون ہووے ہے۔ ہم بھی ڈٹ گئے۔ ہاتھ چبا گیا جالم ہمارا پر ہم نے اسے اپنے بالک کو نہ لے جانے دیا۔ یہ دیکھو۔'' اس نے لکڑیوں کا گٹھڑ زمین پر ڈال کر اپنا بازو سامنے کر دیا۔ پولیس افسر کی آنکھوں میں کسی قدر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو ڈاکو منگل سنگھ۔''

''ہم اندھیرا ہیں مہاراج! بھگوان کی سوگند ہم پر بپتا پڑی ہے۔'' وہ رونے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''دیکھ لو۔ باگھ نے ہمارے بالک کو بھی زخمی کر دیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے مہاراج! ہمیں بستی پہنچا دو۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے!'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ پولیس افسر نے پریشانی سے اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھی۔ سارا معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ لکڑیوں کا ڈھیر، زخمی بازو اور پھر لڑکا...... یہ ساری باتیں اس شخص کو سچا ثابت کر رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

''تم میں سے کوئی اسے نہیں پہچانتا۔''

''وہ تو داڑھی والا ہے سر!......اور پھر لڑکا......نہ اس کے پاس ہتھیار ہیں نا گھوڑا......یہ کسی طور منگل سنگھ نہیں ہو سکتا۔''

"پھر یہ گدھا یہاں کیا کر رہا ہے۔" افسر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"باگھی بستی یہاں سے صرف دو کوس دور ہے۔ ممکن ہے یہ سچ کہہ رہا ہو۔"

"منگل سنگھ بھی تو پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو گیا تھا۔" افسر نے کہا اور پھر بولا۔

"اس کا زخم کھول کر دیکھو۔" چنانچہ دو جوان آگے بڑھ آئے۔ اس نے لڑکے کو نیچے اتار دیا اور لڑکا زمین پر بیٹھ گیا۔ جوانوں نے اس کا زخم کھول کر دیکھا۔ افسر نے بھی دیکھا۔ یہ کسی طرح گولی کا زخم نہیں تھا۔ پولیس افسر نے گہری سانس لی۔ "تو تم منگل سنگھ نہیں ہو۔"

"اندھیرا ہے ہمارا نام مہاراج! گھر والی مر چکی ہے ہماری! اس لیے ہم اپنے بالک کو ساتھ لئے ہی آویں ہیں۔ پر آج...... ہے بھگوان!" اندھیرا نے جھک کر لڑکے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے بازو سے خون رسنے لگا۔

"تم نے یہاں کسی آدمی کو تو نہیں دیکھا، گھوڑے پر سوار تھا۔" افسر نے کہا۔

"نہیں مہاراج۔"

"ہوں۔ جگی رام۔ تم اس آدمی کو ساتھ لے جاؤ۔ باگھی کی چوکی جا کر اس کی شناخت کراؤ اور پھر اسے جانے کی اجازت دے دینا۔ اگر شناخت نہ ہو سکے تو اسے چوکی پر ہی رکھا جائے۔ کنول سنگھ! تم اپنا گھوڑا اسے دے دو!" آفیسر نے دوسرے آدمی سے کہا اور اس نے اپنا گھوڑا چھوڑ دیا۔

"چلو گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔" جگی نے کہا اور اندھیرا پولیس افسر کو دعائیں دینے لگا پھر بولا۔

"مہاراج! ہم نے گھوڑے کی سواری کبھی نا ہیں کی۔ ہمیں سوار کرا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔"

"اوہ آؤ یہ مصیبت کہاں گلے پڑ گئی۔ چلو کنول سنگھ اسے گھوڑے پر بٹھا دو اور جگی تم لگام پکڑ لینا۔ ذرا دیر تو لگے گی مگر شناخت کیے بغیر اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہو گا۔"

پولیس والوں نے لڑکے اور اندھیرا کو گھوڑے پر سوار کرا دیا۔ اس نے لکڑی کا گٹھڑ بھی مانگا۔ "ارے بیوقوف اسے کہاں لے جائے گا؟" پولیس افسر دانت پیس کر بولا۔

"روزی ہے ہماری سرکار! شام کو کھانے کو بھی نا ہیں ملے گا۔ رحم کرو سرکار ہمارے

اوپر۔" اندھیرا ہاتھ جوڑ کر بولا۔

لکڑی کا گٹھڑ اس نے اپنے سر پر ہی رکھ لیا تھا۔ جگی نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ اور وہ دوسری طرف اترائی میں چلنے لگے۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ جو شخص اس دیہاتی کو لے کر چلا تھا، اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ خواہ مخواہ یہ کم بخت درمیان میں آ گیا۔ ڈاکو منگل سنگھ کی تلاش میں کافی لطف آ رہا تھا۔ پچھلی رات اسے بستی میں گھیرا گیا تھا۔ اس وقت وہ گروہ کے ساتھ نہیں تھا لیکن کم بخت نے زبردست مقابلہ کیا اور بستی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر پولیس افسر جوگندر سنگھ نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کالی ٹیکری میں ایک بار پھر اسے گھیرا گیا اور اس بار اسے زخمی کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسری بار نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور ان اطراف میں داخل ہو گیا۔ رات ہو جانے کی وجہ سے پولیس اس کا تعاقب جاری نہ رکھ سکی تھی۔ لیکن تگ و دو ساری رات جاری رہی تھی۔ منگل سنگھ کی گرفتاری پر بہت بڑا انعام تھا۔ اس لیے سب جان توڑ کر کوشش کر رہے تھے۔

چلو ٹھیک ہے جگی نے سوچا یہ شخص تو بے ضرر ہے چوکی سے شناخت کرانے کے بعد واپس آنے کی ہدایت تو کی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ وہیں کہیں سو جائے گا۔ رات کی کسل بھی دور ہو جائے گی۔ وہ اطمینان سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک کوس کا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ تب اچانک زبردست ضرب اس کے بدن پر پڑی اور وہ گھوڑے کی پشت سے اچھل کر نیچے آ گرا۔ اندھیرا کے سر پر لدا ہوا لکڑیوں کا گٹھڑ بھی اس کے اوپر ہی آ گرا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اندھیرا نے اپنے گھوڑے سے اس پر چھلانگ لگا دی اور نہایت مہارت سے اس کی بندوق پر ٹھوکر لگائی اور بندوق دور جا گری۔

"شناخت کرانے لے جا رہا تھا ہماری سسرے! موت کو بھول گیا تھا اپنی...... ابے کیا منگل سنگھ اتنا ہی چوہا ہے کہ تم جیسے گیدڑوں کے پھیر میں آ جائے گا۔ کیا کریں تیرا، بول؟"

جگی کی آنکھوں میں خوف کے آثار لرزنے لگے۔ وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"تم......تم......منگل سنگھ ہی ہو؟"

"ہاں۔ہم ہی ہیں تیرے باپ!" وہ بولا اور پھر خوفناک آواز میں ہنسنے لگا۔

"میں......میں تو ایک معمولی سپاہی ہوں منگل سنگھ......حکم کا غلام......میرا کوئی قصور نہیں ہے۔میرا کوئی قصور نہیں ہے۔مجھے معاف کردو۔"

"بزدلی سکھا رہا ہے سسرے!منگل سنگھ معاف کرنے کا گرہی نہیں جانتا۔گولیاں خوب چلائی ہوں گی ساری رات!یہ بھی تو ہوسکتا ہے تیری ہی گولی لگی ہو ہمیں اور ہم تجھے معاف کردیں۔سن رہا ہے پوت!کیا کہہ رہا ہے یہ گیدی!" منگل سنگھ نے گھوڑے کے اوپر بیٹھے لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ٹھوکر جگی کے سر پر رسید کردی۔بڑی طاقتور ٹھوکر تھی۔جگی کا سر پھٹ گیا اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔منگل سنگھ ہنستا ہوا آگے بڑھا۔اس نے سپاہی کی بندوق اٹھائی اور پھر وہیں سے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔گولی جگی کے سر میں گھس گئی تھی۔دوسرا فائر اس نے جگی کے دل کا نشانہ لے کر کیا تھا۔پھر وہ تڑپتے ہوئے سپاہی کے قریب پہنچا اور بے دردی سے اس کے بدن سے کارتوس کی پیٹی اتاری۔پیٹی اپنے بدن پر سجانے کے بعد اس نے بندوق سنبھالی۔اسے اپنے شانے سے بہتے ہوئے خون کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔چند لمحات کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا اور پھر اس نے سمت بدل کر گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔

ویران پہاڑیوں میں شام جھک آئی تھی۔غیر معمولی قوتِ برداشت کا مالک منگل سنگھ مسلسل سفر کرتا رہا تھا۔گھوڑے پر سوار لڑکا نڈھال ہوگیا تھا۔بھوک اور زخموں سے اس کے حواس مختل ہوگئے تھے چنانچہ منگل سنگھ نے اسے خود سے چمٹا لیا تھا۔پھر سورج بالکل غروب ہوگیا۔لیکن منگل سنگھ کی منزل آگئی تھی۔اس وقت وہ ایک پہاڑی کے دامن میں تھا کہ ایک طرف سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔پھر ایک انسانی آواز ابھری اور منگل سنگھ نے بھی ویسی ہی آواز نکالی۔گھڑسوار برق رفتاری کے ساتھ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"سردار کیا آپ زخمی ہیں؟" ایک گھڑسوار نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہاں!مگر پرواہ نہیں ہے۔تم جلدی جاؤ اور وید جی کو بلا لاؤ۔ان سے کہنا کہ سارا سامان لے کر آئیں۔" منگل سنگھ نے کہا اور گھڑسوار تیز رفتاری کے ساتھ ایک پہاڑی دراڑ کی طرف دوڑنے لگے۔دوسرے چند سوار اس کے ساتھ ہی رہے تھے۔غاروں کی عظیم الشان دنیا آباد تھی۔بے شمار لوگ تھے اور انہوں نے اپنی آسائش کے تمام انتظام کر رکھے تھے۔منگل سنگھ ایک لمبی سرنگ سے گزر کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچا اور پھر خود ہی گھوڑے سے اترا۔لڑکے کو دوسرے لوگوں نے اتار لیا تھا۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ منگل سنگھ کون سا معرکہ سر کرکے اور کیا لوٹ کر لایا ہے۔بس اس لڑکے کو تعجب سے دیکھ رہے تھے جواب بے ہوش ہوچکا تھا۔

وید جی آگئے اور تیزی سے منگل سنگھ کی طرف بڑھے لیکن اس نے ہاتھ اٹھایا اور اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے اسے دیکھو وید جی۔میری چنتا مت کرو۔اسے ٹھیک کرو جلدی!" وہ بولا اور وید جی کا رخ بدل گیا۔وہ اپنی کاروائیوں میں مصروف ہوگئے۔لڑکے کی بیماری بھوک اور خوف تھا۔چنانچہ وید جی نے پہلے اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کیں اور جب وہ ہوش میں آگیا تو اسے گرم دودھ پلوایا اور اس کے بعد وہ منگل سنگھ کے زخموں کو دیکھنے لگے۔اتنا خون بہہ جانے کے باوجود یہ دیوہیکل انسان پوری طرح توانا تھا!

"مار مار کر بھرکس نکال دیں گے اس سسر کا۔تو خود اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دینا منو!بول مارے گا گولی اسے!" منگل نے پیار بھری نگاہوں سے منور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر گولی مارنے سے تو انسان مرجاتا ہے۔" منور نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"جیتا رکھے گا تو اسے جس نے تیرا جیون لینے کی کوشش کی تھی۔بوری میں بند کر کے ندی میں پھینک دیا تھا' کیوں، جیتا رکھے گا تو اسے؟"

"کسی کی زندگی لینا گناہ ہے منگل بابا!یہ کام تو خدا کا ہے۔اس نے انسان کو انسان کی زندگی لینے کا حق نہیں دیا۔اگر چچا میاں نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو اللہ میاں انہیں مارے گا۔"

"بڑے کام ہیں اسے ارے پگلے!بہت مصروف رہتا ہے وہ کون کون سے کام

کرے۔ اس سنسار میں تو سب ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہیں۔ اس لیے اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔ خدا کو نجانے کب وقت ملے۔ اس وقت تک کون انتظار کرے گا۔ نرا پاگل ہے تو بھی۔"

"مگر میرے ابا تو کہتے تھے منگل بابا کہ خدا کے کاموں میں انسان کو دخل نہیں دینا چاہیے۔"

"وہ بھی تو انسان کے کاموں میں دخل نہیں دیتا۔ سب کو چھوٹ دے رکھی ہے اس نے۔ جس کا جو من چاہتا ہے کرتا ہے۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ باہر نکل کر دیکھے گا کہ سنسار کیا ہے۔ ابھی جانے دے ان باتوں کو۔ میں آہستہ آہستہ تجھے سکھاؤں گا کہ اس سنسار میں کیسے جیا جاتا ہے۔"

"تم مجھے سکھا دو گے تو جان لوں گا منگل بابا!" منور نے کہا اور منگل ہنس پڑا۔

"ہاں میں تجھے سب کچھ سکھا دوں گا لیکن جو کچھ میں سکھاؤں گا اچھی طرح سیکھ لینا۔ کچھ بھولا تو پھر تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" منگل سنگھ کی غراہٹ بے حد خوفناک تھی۔

"سب کچھ سیکھ لوں گا۔ سب کچھ!" منور نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

منگل سنگھ نے دیہات کے اس معصوم لڑکے کا حلیہ ہی بدل دیا۔ پہاڑوں کی کھلی فضا' ایک سے ایک عمدہ لباس اور اعلیٰ ترین غذاؤں نے منور کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ منگل سنگھ نے اس کی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔ گروہ کے ایک ایک فرد کو بتا دیا تھا کہ آنے والے وقت میں ان کا سردار منور ہوگا۔ اس کی اطاعت کی جائے' اس کا مقام بنایا جائے۔ منور کی ابتدائی تربیت اسے بے رحم بنانے کے لئے کی گئی۔ اس کو پستول اور بندوق چلانا سکھائی گئی۔ خنجر زنی کی مشق کرائی گئی۔ جنگل سے معصوم جانور پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں بے بس کر دیا جاتا تھا اور پھر منور ان پر نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔

جب اس نے پہلے جانور کو ہلاک کیا تو اسے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا تھا لیکن منگل سنگھ کی خوفناک آنکھیں ان کی نگران تھیں۔ اسے منگل سنگھ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ منگل سنگھ جو اپنے لمبے چاقو سے ہر اس شخص کی گردن کاٹ دیتا

تھا جو اس کے احکامات کی سرتابی کرتا تھا۔ منور نے کئی آدمیوں کا حشر اس کے ہاتھوں دیکھا تھا اور یہ منگل سنگھ کے اپنے آدمی تھے۔ چنانچہ منور کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس کی کسی بات سے انکار کرے لیکن معصوم جانوروں کی کربناک چیخیں ساری رات اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ دوسرے دن پھر اسے یہی کام سونپا گیا اور پھر روزانہ.......... رفتہ رفتہ وہ ان جانوروں کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ منگل اسے دھمکی بھی دیتا تھا۔

"اگر میں ان جانوروں کو کھول دوں تو یہ آن کی آن میں تیرا تیا پانچہ کر دیں گے۔ اس لیے کلیجے ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے انہیں ہلاک کر دو۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو دشمن ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں سے تاک کر نشانہ لگائے گا اور تمہارے بدن میں سوراخ ہی سوراخ ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے اس کا بدن داغدار کر دو۔"

منور اب بے تکان گولیاں چلاتا تھا۔ وہ نشانہ بازی میں کمال حاصل کر چکا تھا اور اس وقت اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ پھر ایک شام غاروں میں ایک دلچسپ ڈرامہ ہوا۔ منگل سنگھ کہیں ڈاکہ مار کر آیا تھا۔ بے انتہا مال و اسباب کے ساتھ اس کا ایک آدمی لڑکی بھی لے آیا تھا۔ خود منگل سنگھ دو آدمیوں کو پکڑ کر لایا تھا جنہیں اس نے ایک جگہ قید کر دیا۔

رات کا وقت تھا۔ غاروں کی دیواروں میں مشعلیں جل رہی تھیں۔ شراب لنڈھائی جا رہی تھی۔ ڈاکو جشن منا رہے تھے۔ منور بھی اس جشن میں شریک تھا۔ دفعتاً ایک طرف ہنگامہ ہو گیا۔ دو ڈاکو آپس میں لڑ پڑے تھے۔ منگل کے کانوں میں آواز پہنچی تو اس نے ہاتھ بلند کر دیا اور شور و غوغا رک گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم دونوں آگے آؤ۔" اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور دونوں لڑنے والے آگے آ گئے۔

"کیوں لڑ رہے ہو سسرو! زیادہ چڑھ گئی کیا! میں نے کتنی بار کہا ہے کہ اتنی پیا کرو جتنی ہضم کرلو۔"

"یہ بات نہیں ہے سردار!" ان میں سے ایک بولا۔

"پھر کیا بات ہے؟" منگل انہیں گھورنے لگا۔

"سردار! میں بستی سے ایک لڑکی اٹھا لایا تھا۔" ان میں سے ایک بولا۔

"ہاں پھر؟"

"میں نے اس کے گھر والوں کو مار کر اسے اٹھایا تھا سردار! مگر یہ چھدو اس پر اپنا حق جما رہا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے سردار۔" چھدو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"وجہ بھی بتا دے پوت! کیا وجہ ہے؟" منگل ہنس پڑا۔

"لڑکی چھپ گئی تھی سردار! میں نے اسے دیکھا۔ اسی وقت چھپائی پلہ بھاری ہو گیا اور میں نے گدری سے کہا کہ وہ لڑکی کو سنبھال لے، میں پیچھے جا رہا ہوں۔ گدی لڑکی کو نکال لایا مگر وہ تو میری امانت تھی سردار! اس کا حق کیسے بن گیا؟"

"آ گئی سالوں کے بیچ عورت! بن گئے ایک دوسرے کے دشمن اور اب کیا ہوگا جانے ہے چندو!" وہ منور کی طرف رخ کر کے بولا۔ "دونوں لڑتے رہیں گے اور ایک دوسرے کی دشمنی میں پولیس کے ہاتھ جالگیں گے اور پورے گروہ کی مصیبت آ جائے گی۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ ماں کے خصمو عورت نہ لایا کرو۔ بولو۔ جواب دو۔" منگل سنگھ کا رنگ بدل گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے چہروں پر خوف آ گیا۔

"بھول ہو گئی سردار۔" ان دونوں نے کہا۔

"کیا سزا ہو اس بھول کی خود ہی تجویز کر لو۔"

"معاف کر دو سردار اس جیت کی خوشی میں معاف کر دو۔" دونوں گڑگڑانے لگے اور سردار ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم ہنس پڑا۔

"بڑے عورت باز ہیں سسرے! لاؤ کہاں ہے وہ بس کی گانٹھ! جاؤ لے کر آ وَ۔"

اس نے حکم دیا اور دونوں دوڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خوبصورت لڑکی کو پکڑ لائے جو بری طرح خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"ہوں۔ تو یہ ہے زہر کی پڑیا۔ ہٹوا سے جگہ دو ذرا سی۔ جھگڑا ختم ہونے دو چل بھئی گدی نکال چاقو تو بھی چھیدو...... جلدی کرو سسرو یا میں نکالوں۔" منگل نے لاپرواہی سے کہا۔ دونوں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے لیکن پھر آگے بڑھے اور دوسرے لمحے لڑکی کی دلخراش چیخ گونج اٹھی۔ دونوں کے خنجر اس کے بدن میں اتر گئے تھے۔ اور پھر کیے بعد

دیگرے انہوں نے کئی وار کر کے اسے زندگی کے بوجھ سے نجات دلا دی۔

"اب اسے لے جاؤ حرامیو! آدھی آدھی بانٹ لو تم دونوں۔ اٹھاؤ......" وہ پھر دہاڑا اور دونوں نے لڑکی کی خون آلود لاش اٹھائی اور غار سے باہر نکل گئے۔ ہنگامے جو چند ساعت کے لیے رک گئے تھے۔ دوبارہ جاری ہو گئے۔ لیکن یہ صورت منور پر بھاری گزری۔ حالانکہ وہ ظلم اور بربریت کے ان مناظر کا عادی ہو گیا تھا لیکن نجانے کیوں لڑکی کی موت اس کے ذہن پر اثر انداز ہوئی تھی۔ دوسرا دن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اس بار منگل سنگھ نے ایک ایسے شخص کے ہاں ڈاکہ ڈالا تھا جو اس کا دشمن تھا۔ اس نے اس کی بستی تاراج کر دی تھی اور اپنے دشمن اور اس کے نوجوان بیٹے کو پکڑ لایا تھا چنانچہ دوسری صبح ان دونوں کے لیے قتل گاہ تیار کرائی گئی اور سورج چڑھے ان کی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں باپ بیٹوں کو قتل گاہ میں لے جایا گیا۔ ایسے موقعوں پر منور کو ضرور ساتھ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ منور بھی موجود تھا۔

"رگھو لال چوہان! تم نے دیکھ لیا منگل کی دشمنی کو۔ میں نے تم سے کہا تھا رگھو لال کہ مجھے چھیڑ کر تم نے پوری بستی کی تباہی خریدی ہے۔ جھوٹ تو نہیں کہا تھا؟"

"برا کیا تو نے منگل! دشمنی ہماری تمہاری تھی۔ دوسروں کا کیا دوش تھا؟" رگھو لال نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"دوش ان کا بھی تھا کہ وہ تیری بستی والے کیوں تھے۔ دو چار سے منگل سنگھ کا دل نہیں بھرتا۔ پھر اب کیا خیال ہے تیرا؟"

"کیا تو رحم کرنا جانتا ہے منگل"۔ رگھو لال نے پوچھا

"ارے......رے......رے ایک یہی کام نہیں آتا منگل کو۔ باقی سارے کام جانے ہے مگر تم نے کیوں پوچھا ہے؟"

"میرے بیٹے کو چھوڑ دے۔ میں تجھ سے اپنے لیے رحم نہیں مانگوں گا...... پر اسے ضرور معاف کر دے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ بڑے ارمان سے یہ اپنا بیاہ رچا رہا ہے۔"

"اوہو......تو یہ سہرا باندھے گا کھوپڑی پر...... کیوں رے شادی کرنے جا رہا

ہے؟''

''ہرگز نہیں منگل سنگھ! میں تیری' بھیک دی ہوئی زندگی قبول کبھی نہیں کروں گا اور جب میرے پتا ہی اس سنسار میں نہیں رہیں گے تو میں شادی کر کے کیا کروں گا۔''

''ارے تو بھیک دے ہی کون رہا ہے' کلیجے! پرتم دونوں نے سوچی خوب ہے تم اس کے جیون کی بھیک مانگو وہ تمہارے جیون کی۔ اور منگل سنگھ تو ایسے ہی دھرماتما ہیں کہ دونوں کو بھیک دے دیں واہ!'' منگل سنگھ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ایک کام تو تم کر ہی سکتے ہو منگل سنگھ۔'' رگھو لال پھر بولا۔

''وہ کیا چندا۔'' منگل سنگھ نے پوچھا۔

''پہلے مجھے قتل کر دو تا کہ میں اس کی موت نہ دیکھ سکوں۔'' رگھو لال کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور منگل سنگھ ہنس پڑا۔

''رو رہا ہے بزدل کہیں کا۔ بڑی بات کہی تھی تو نے۔ یاد کر۔ اور بڑی بات کی سزا بھی بڑی ہی ہووے ہے سسرے! اور آج تو میرا شیر پہلا بڑا شکار کرے گا۔ اس طرح اس کی مہورت بھی ہو جائے گی۔ آج ہمارے ہاں رحم نہیں ہوگا۔ رگھو لال! آج کسی کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی۔ رگھو لال! آ جاوے میدان میں!'' اس نے منور کو اشارہ کیا اور منور اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے منگل بابا!'' اس نے پوچھا۔

''لے مار دے ان دونوں کو گولی ہمارے پستول سے۔ بس ان کا جیون ختم ہو گیا۔'' منگل سنگھ نے اپنا پستول نکال کر منور کو دے دیا۔ اور منور کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے منگل سنگھ کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر ان دونوں باپ بیٹوں کی طرف۔ دوسرے لمحے اس کے پستول سے دو گولیاں نکلیں اور رگھو لال کے دل میں پیوست ہو گئیں۔ رگھو لال نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے احسان مند نگاہوں سے منور کو دیکھا اور زمین پر گر پڑا۔ منور نے دوبارہ فائر کیے اور اس بار نوجوان لڑکا ڈھیر ہو گیا۔ لیکن منگل سنگھ غور سے منور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار تاثرات نہیں تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس

کے تاثرات بدلے اور وہ ہنسنے لگا۔

''چلو بھئی جشن کی تیاریاں کرو۔ شیر کے منہ خون لگ گیا ہے آج۔ آج مہندی لگ گئی ہے اپنے منور کے ہاتھوں میں۔ اب مزہ آئے گا ڈاکے مارنے کا۔ چلو جشن مناؤ۔'' اور ڈاکو شور مچانے لگے۔ وہ خوشی سے ناچ رہے تھے۔

''پرتو نے گھائل کر دیا ہے ہمیں چندا! کیا تیرے من میں رحم آ گیا تھا ان سالوں کے لئے؟'' سب کے چلے جانے کے بعد منگل نے منور سے کہا۔

''کیوں منگل بابا؟''

''تو نے پہلے بوڑھے کو کیوں مارا ......کیا تو نے اس کی آخری خواہش مان لی تھی؟''

''نہیں منگل بابا۔ تم نے اس بارے میں تو کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اسے پہلے اس لیے مارا کہ اس نے تم سے بڑی بات کہی تھی۔ اور تمہارا اصل دشمن وہ تھا۔'' منور نے جواب دیا۔

''ابے سچ کہہ رہا ہے کیا......ابے کلیجے...... یہ بات تھی تو ٹھیک ہے۔ میں تو غلط ہی سمجھ بیٹھا تھا۔'' منگل سنگھ خوش ہو کر قہقہے لگانے لگا۔



بستیوں کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ کون کون سے جتن نہ کیے تھے ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران نے زندگیاں قربان کر دی تھیں۔ متعدد سپاہی موت کی آغوش میں جا سوئے اور آج بھی منگل سنگھ کے خلاف پولیس کی مہمات جاری تھیں۔ لیکن وہ اور اس کے ساتھی اس قدر چالاک تھے کہ ہاتھ ہی نہ آئے تھے۔ اس چالاکی سے کام کرتے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قتل و غارت گری کے رسیا۔ جدھر سے گزرتے خون ہی خون پھیل جاتا اور اس کے بعد جو المیے ہوتے وہ تاریخ بن جاتے۔

اور بدبختی کی یہ رات احمد پور پر بھی چھا گئی۔ سرِشام ہی بادل گھر آئے تھے۔ کئی بار ہلکی بونداباندی ہوئی تھی اور بند ہو گئی تھی۔ فضا میں عجیب سا حبس تھا اور دلوں میں انجان سی

بے چینی۔ لیکن رات کے دوسرے پہر یہ بے چینی بے سبب نہ رہی۔ چاروں طرف سے گولیوں کا شور ابل پڑا۔ سوتے ہوئے لوگ پہلے تو اسے تیز اور طوفانی بارش کا شور سمجھے لیکن پھر چاروں طرف سے منگل سنگھ کی جے جے کار ابھری اور دل دھڑکنا بند ہو گئے۔ منگل سنگھ کا نام ان علاقوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جو سنا تھا وہ سامنے آ گیا۔ مکان لوٹے جانے لگے۔ زندگی ختم کی جانے لگی۔ آہ و بکا کی آوازیں ہر گھر سے بلند ہونے لگیں۔

ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان کے برآمدے میں جاء نماز پر بیٹھے ہوئے باریش شخص نے جلدی سے سلام پھیرا۔ گھر کے خوفزدہ لوگ برآمدے میں نکل آئے تھے۔

''جلدی اندر چلیں ماموں جان! ڈاکو منگل سنگھ نے حملہ کیا ہے۔'' ان میں سے ایک شخص نے چیخ کر کہا۔

''میری نماز پوری نہیں ہوئی ہے تم جاؤ۔'' پروقار آواز ابھری۔

''ماموں جان خدا کے لیے...... اندر چلیں۔'' اس بار ایک نسوانی آواز نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ کیونکہ برآمدے کے سامنے کی دیوار سے کوئی اندر کود رہا تھا۔ بلند و بالا قد، سیاہ لباس کے درمیان سفید چہرہ، بڑی بڑی حسین آنکھیں لیکن خون کی وحشت لیے ہوئے۔ ہاتھوں میں موت برسانے والا ہتھیار...... وہ برق رفتاری سے برآمدے میں آ گیا اور ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ سہمی ہوئی آنکھیں خوف سے پھیلی رہ گئی تھیں۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آیا اور باریش شخص نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر بدحواس ہو جانے والوں کی طرف اور پھر اس کی متین آواز ابھری۔

''فرشتہ اجل...... لوٹ مار کی خواہش ہے تو اندر چلے جاؤ اور اپنا مقصد پورا کرو۔ روحیں قبض کرنے آئے ہو تو یہ جاندار تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ جب تک انہیں ہلاک کر دو اور مجھے دو نفل ادا کر لینے دو۔ اگر فریضہ خداوندی کی ادائیگی میں مجھے دیر ہو جائے اور تم اپنے کام سے جلد فارغ ہو جاؤ تو مجھے سجدے کے عالم میں گولی مار دینا کہ میری روح خدا کے حضور جائے گی اور اس سے بڑی سعادت کسی اور کو نہ ملی ہوگی۔ میں اس وقت در معبود پر ہوں اور خدائے قدوس کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ موت کا خوف میرے

وجود کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اللہ اکبر۔'' بزرگ نے نیت باندھی اور نوافل کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔

وہ برآمدے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی خونی آنکھوں میں ایک عالم لرزاں تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے مرحوم باپ صوفی عظمت اللہ کی تصویر روشن ہو گئی تھی۔ وہ بھی تہجد گذار تھے اور دوران نماز کسی سے رغبت نہ رکھتے تھے۔ وہ بھی موت کی جانب سے اسی قدر بے پرواہ تھے۔ عالم نماز میں ان کے چہرے پر بھی یہی تقدس ہوتا تھا۔ وہ بھی ہر خطرے سے اسی طرح بے نیاز ہوتے تھے۔ بستی کا مکان، اپنی دکان اور نجانے کیا کیا اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔

اسی وقت مکان کی دیوار پر اس کے تین ساتھی نظر آئے اور پھر وہ بھی بڑھ بڑھ کر کے اندر کود آئے تب نوجوان نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ''گولی مت چلانا۔'' اور بندوقوں کی نالیں جھک گئیں۔

''کیا اندر کام ہو رہا ہے سردار؟'' آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''جاؤ اپنا کام کرو۔'' اس کی گرجدار آواز ابھری اور تینوں جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے برآمدے میں ساکت و جامد کھڑے لوگوں کے چہروں سے اب بھی خوف عیاں تھا۔ وہ ہر لمحہ موت کو اپنے قریب محسوس کر رہے تھے۔ آنے والوں کے منہ سے وہ سردار کا لفظ سن چکے تھے اور سوچ رہے تھے تو یہ ہے منگل سنگھ۔ لیکن وہ خاموش کیوں ہے۔ کیا نماز ختم ہو جانے کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن وہ ہندو ہے نماز کا احترام کیوں؟

بزرگ نہایت خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے رہے اور کافی دیر گزر گئی۔ باہر کے ہنگامے بدستور جاری تھے۔ پھر ایک تیز سیٹی کی آواز ابھری۔ یہ واپسی کا اشارہ تھا۔ نوجوان نے اسے سنا لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آج وہ جس تقدس کو دیکھ رہا تھا اس تقدس سے اس کی روح کی گہری وابستگی تھی اور وہ یہ منظر نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ سیٹی کی آواز کے بعد ہر شخص کی واپسی لازمی ہوتی تھی اور اس ہنگامے میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوتا تھا لیکن نوجوان ڈاکو نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اطمینان سے کھڑا رہا یہاں تک کہ باہر شور تھم گیا۔ اب آوازیں صرف رونے پیٹنے کی تھیں۔

بزرگ نے دوبارہ سلام پھیرا اور پھر ڈاکو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں بھی تعجب تھا۔

"تم نے اپنا کام شروع نہیں کیا۔" انہوں نے پوچھا اور وہ آگے بڑھ آیا۔ اس نے اپنی بندوق ایک ستون سے ٹکائی اور بزرگ کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنا سینہ کھول دیا۔

"کیا آپ میرے سینے پر پھونک نہیں ماریں گے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا مطلب؟" بزرگ حیرت سے بولے

"آپ...... آپ تو ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔" اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔

"میں......" بزرگ نے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ سب کے سب متعجب کھڑے ہوئے تھے۔

"میرا سینہ کھلا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر سے' آپ کی عبادت کا ایک حصہ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں وہ دعائیں لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے میرا ماضی دے دو۔ ان بابرکت کلمات کی ہوا میرے سینے کو پہنچا دو۔ اس میں بڑی جلن ہے۔ خدا کی قسم بڑی سوزش ہے۔ اس میں طویل عرصے سے جل رہا ہوں۔ میں اس نعمت کو تمہارے گھر سے لے جاؤں گا۔ جلدی کرو' وہ سب جا چکے ہیں جلدی کرو۔" نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

بارش بزرگ خود بھی حیرت زدہ تھے اور نوجوان کے الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کا چوڑا سینہ کھلا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ آنکھوں کے موتی ان بادلوں میں اٹک کر جھلملا رہے تھے۔ تب بزرگ نے آسمان کی جانب دیکھا اور ان کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"بارالہا! میں عاصی اس قابل کہاں کہ ایک بھٹکے ہوئے کو راہ راست پر لا سکوں۔ مگر تیرے کلام میں اتنی طاقت ہے کہ پہاڑوں کو سنگریزہ بنا دے۔ سو اس بابرکت کلام کے سہارے یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ بسم اللہ!" انہوں نے کہا اور نوجوان کے سینے پر پھونک دیا۔

نوجوان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا دیر تک وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ پھر اس نے سینہ بند کر لیا اور آنسو خشک کر کے واپسی کے لئے مڑ گیا۔ تبھی بزرگ کی آواز ابھری۔

"گناہ کی جس آگ کی سوزش سے تڑپ کر تم نے کلام الٰہی کی ٹھنڈک طلب کی تھی، کیا پھر اسی آگ کی جانب جا رہے ہو نوجوان؟" اور نوجوان کے قدم رک گئے۔

"جہنم میں رہنے والے کو اگر جنت کے پاس سے گزرنے کا موقع مل جائے تو جنت اس کا حق تو نہیں بن سکتی۔ میرے لیے اس جہنم کے سوا کوئی پناہ نہیں ہے۔" اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"رحمتِ خداوندی سے مایوسی کفر کی منزل سے جا ملتی ہے۔ گناہ کے بعد توبہ کی رعایت دی گئی ہے۔ کیا تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے..............؟"

"میں ڈاکو ہوں محترم! ایک بے رحم قاتل ہوں۔ اتنے گناہ کیے ہیں میں نے کہ رحمت کی طلب کا تصور میری گردن شرم سے جھکا دیتا ہے۔"

"اور اسے شرم سے جھکی گردنیں پسند آتی ہیں۔ وہ رحیم الرحمٰن ہے اور اس کی رحمت کے خزانے لامحدود ہیں۔ تمہاری طلب پر اگر وہ دینے پر آ جائے تو اس کی رحمت کے خزانے کا ایک ذرہ کائنات کے گناہوں کو ڈھانپ لے، تم کیا حیثیت رکھتے ہو۔ آؤ میں تمہیں توبہ کے راستوں پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ممکن ہے میری یہ کوشش میرے اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں کمی کا باعث اور عاقبت میں میری بہتری کا سامان بن جائے۔" بزرگ کی آواز پر اثر تھی۔ نوجوان آنسو بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا اور پھر اس نے گردن جھکا دی۔ تب بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

"رحمت ایزدی لامحدود ہے اس نے تمہارے دل میں یہ کیفیت بیدار کر کے تمہیں نیکیوں کی طرف بلایا ہے اور جب تم نے نیکیاں اپنا لی ہیں تو آؤ بدی کے اس لبادے کو اتار دو۔ عرفان میاں! کیا تم اس نوجوان کو ایک سادہ لبادہ مہیا کر دو گے؟" اس بار انہوں نے دوسرے لوگوں میں سے کسی کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیوں نہیں ماموں جان!" آواز میں جھجک تھی۔ یہ ڈرامائی صورت حال کسی کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ بھلا ایک ڈاکو اور ڈاکو بھی منگل سنگھ نیکیوں کے راستے پر کس طرح آ سکتا ہے۔ لیکن بزرگ کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔ چنانچہ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تب نوجوان ہی بولا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں گناہوں کی اس یادگار کو یہاں سے دور دھکیل آؤں۔" اس نے بندوق کی جانب اشارہ کیا۔ "باہر میرا گھوڑا بھی موجود ہے۔"

"میں تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دوں گا اس وقت تک جب تک کہ تم اس لباس سے چھٹکارا حاصل نہ کرو۔ عرفان میاں! تم گئے نہیں۔" انہوں نے پھر دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔

"جی ابھی ماموں جان!" وہ اندر دوڑ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنا ایک جوڑا لے کر باہر آ گیا۔ بوڑھے نے نوجوان کو وہ لباس دیا اور اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

"یہ ماموں جان نے کیا کیا؟"

"وہ تو مذہباً بھی ہندو ہے۔"

"اور ڈاکوؤں کا سردار ہے!"

"یہ بھی اس کی کوئی چال تو نہیں ہے۔"

"دادا جان بھی بس جذباتی ہیں۔ بھلا ایک ڈاکو پر اعتبار کیا جا سکتا ہے!"

"دیکھ لینا نانا میاں کسی خطرناک حادثے سے دوچار کریں گے سب کو۔"

"اُفوہ۔ آہستہ بولو اگر دونوں میں کسی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔"

"لیکن پھوپا میاں! اب کیا ہو گا۔ وہ تو ہمارے ساتھ قیام کے لیے بھی تیار ہو گیا ہے۔"

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔" عرفان کی آواز ابھری اور اسی وقت وہ دونوں باہر آ گئے۔ نوجوان نے اپنے ڈاکوؤں کے لباس کی ایک گٹھڑی بنائی ہوئی تھی۔ اس میں اس کا پستول اور خنجر بھی اڑسا ہوا تھا۔ پھر اس نے بندوق اٹھائی اور اسے بھی ساتھ

لے لیا اور پھر دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ عرفان بھی بے اختیار ساتھ ہو لیا تھا۔ دیوار سے ملحق گھوڑا کھڑا ہوا تھا نوجوان نے اپنا سامان گھوڑے پر رکھا، بندوق زین میں ٹھونس دی اور پھر اس نے گھوڑے کو ایک مخصوص انداز میں ہاتھ مارا اور گھوڑا اچھل کر سرپٹ ہو گیا۔ آن کی آن میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شور و غوغا کی آوازیں اب بھی چاروں طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ وہ گھر میں واپس آ گئے۔ تب بزرگ اسے لیے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔

"لوٹ مار شاید ابھی جاری ہے۔" انہوں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ واپس جا چکے ہیں۔" نوجوان نے متانت سے کہا۔

"تم شاید ڈاکو منگل سنگھ ہو۔" اس بار عرفان زبان کھولے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔

"لیکن اندر آنے والوں نے تمہیں سردار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔" عرفان بولا۔

"میں اس کا نائب تھا۔ اس کے بعد ہونے والا سردار۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ٹھہرو عرفان! پہلے مہمان سے ہم اپنا تعارف کرائیں گے۔ پھر ان سے ان کے بارے میں پوچھیں گے۔ تو میاں خاکسار کا نام عبداللہ ہے۔ میں شہر میں رہتا ہوں اور یہ جو تم سے سوالات کر رہے ہیں، میرے بھانجے عرفان ہیں۔ عرفان اسی بستی میں رہتے ہیں اور میں شہر سے ان کے ہاں آیا تھا۔ یہ میرا نواسا اسد ہے اور یہ پوتی شمائل، یہ عرفان کی اہلیہ ہیں اور یہ ان کے دونوں بچے محمود اور عاقل۔ حج کر کے آیا تھا چنانچہ ان لوگوں سے ملنے چلا آیا کیونکہ عرفان بہت مصروف رہتے ہیں۔ تو یہ ہے ہماری تفصیل اور اب تم بھی اپنا نام بتا دو!"

"میرے والدین نے میرا نام منور رکھا تھا لیکن تقدیر نے میرے وجود کو سیاہ کر دیا۔" منور آہستہ سے بولا اور بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"الحمدللہ تم مسلمان ہو۔ مجھے یقین تھا۔ رہی تاریکی کی بات تو نور ہمیشہ نور رہتا

ہے تاریکی کی بدنما چادر کتنی ناپائدار ہے۔ تم اس سے اندازہ لگاؤ کہ وہ آنا فانا آتی ہے اور ماحول کو اپنے مہیب بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے لیکن پھر تارے اس کا طلسم توڑ دیتے ہیں ۔تب ان کی مدد کے لیے چاند نکل آتا ہے اور تاریکی کی چادر تار تار ہو جاتی ہے۔ وہ کونوں کھدروں میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ ساری رات چاند اس پر حاوی رہتا ہے اور پھر اپنے فرائض سورج کے حوالے کر کے خود آرام کرنے چلا جاتا ہے کہ دوسری رات تاریکی سے نبرد آزما ہو جائے۔ یہ نظام قدرت ہے اور تاریکی شکست خوردہ رہتی ہے۔ چنانچہ تمہاری تقدیر کی تاریکی چھٹ گئی ہے اور تم پھر سے منور بن گئے ہو۔ روشنی کے راستے اپناؤ ہم سب تمہارے مددگار ہیں۔ ایک آدھ دن میں ہم یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں تمہیں شہر لے جاؤں گا اپنے ساتھ۔ میرا بیٹا بہت بڑا وکیل ہے میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں مجھے یقین ہے کہ تم ہم لوگوں کے درمیان خوش رہو گے۔ یوں محسوس کرو کہ تم اپنے بچھڑے ہوئے خاندان میں آ گئے ہو۔'' منور نے سر جھکا لیا تھا۔

''اب تم آرام کرو۔ کل ملاقات ہو گی اور بچو! تم سے یہ کہنا فضول ہے کہ اپنے مہمان کی حقیقت کسی سے نہیں بتاؤ گے۔''

''جی'' سب نے جواب دیا۔

منور کے لیے ایک آرام گاہ تجویز کر دی گئی اور سب اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن منور کے ذہن میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ جذبہ تو کبھی کا اس کے سینے میں دم توڑ چکا تھا۔ ان راستوں سے تو وہ بہت دور نکل چکا تھا۔ منگل سنگھ نے اسے اپنے خوابوں کی انتہا بنا لیا تھا۔ وہ اس پر بے پناہ فخر کرتا تھا اس کے ہر کارنامے کو خود سے منسوب کر لیتا تھا۔ کہتا تھا۔

''سالو! منگل سنگھ کے دو روپ ہیں۔ اس کی جوانی منور ہے اور بڑھاپا وہ خود ہے۔ چنانچہ منگل سنگھ کی عمر چالیس سال اور بڑھ گئی ہے۔ ان سالوں کا مقدر ہی خراب ہے جو منگل سنگھ کو ختم کرنے کے لئے دن رات ایک کر چکے ہیں۔ پیدا ہوئے تو منگل کا نام سنا بوڑھے ہوں گے تو یہی حسرت لے کر کہ اسے گرفتار کر لیں۔''

خود منور نے اس زندگی سے علیحدہ ہونے کا تصور نہیں کیا تھا صوفی عظمت اللہ کی

موت کے بعد اس نے چند لمحات کے لئے چچا کا گھرانہ دیکھا تھا جہاں اس کے لیے محبت کا کوئی نقش نہیں تھا۔ اس کے بعد منگل سنگھ کے ڈیرے پر اسے چاہت ملی تو اس نے وہی زندگی سمجھ لی۔ اس سے الگ زندگی کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ لیکن آج کوئی آ گیا تھا۔ وہ جس نے کان سے پکڑ کر اسے آگے جانے سے روک دیا تھا بالکل اس طرح جیسے وہ گولیاں کھیل رہا ہوں اور صوفی عظمت اللہ اسے کان سے پکڑ کر گھر لے آئے ہوں۔

''نہیں بیٹے! اچھے بچے شیشے کی گولیوں سے نہیں کھیلتے۔ اس کھیل کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔''...... وہ بھی تو صوفی عظمت اللہ ہی کی طرح تھے ورنہ وہ ان کے سامنے موم کیوں بن جاتا...... وہ تو ڈاکو منگل سنگھ کی ناک تھا۔ لیکن اب...... اب کیا ہو گا۔ منگل سنگھ اس کے گم ہو جانے کے بعد کیا کرے گا اور آئندہ زندگی...... آئندہ زندگی!

درحقیقت وہ معصوم تھا اس کا ایک بھی قدم اس کی اپنی مرضی سے نہیں اٹھا تھا۔ وہ جو کچھ بن گیا تھا اس میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں تھا۔ دوسری طرف ایک بڑے کمرے میں سب عبداللہ صاحب کے گرد جمع تھے۔ عرفان کہہ رہا تھا۔

''میں آپ کے کسی اقدام پر نکتہ چینی تو نہیں کر سکتا ماموں جان! لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔''

''کیوں بیٹے!'' بزرگ نے شفقت سے پوچھا۔

''وہ ڈاکو ہے؟''

''ہے نہیں 'تھا۔'' بزرگ نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ ماموں جان! کیا وہ ایک دن میں ڈاکو بن گیا ہو گا؟''

''ہرگز نہیں۔''

''پھر وہ ایک دن میں نیکیوں کے راستے پر کس طرح آ سکتا ہے؟''

''وہ ننگی تلوار لے کر گھر میں داخل ہوئے تھے اور قتل کرنے آئے تھے۔ انہیں جو ایمان لا چکے تھے۔ تب کلام الٰہی ان کے کانوں میں پڑا اور اسے سن کر وہ تھم گئے۔ پھر ان کا سینہ نور ایمان سے منور ہو گیا اور انہوں نے کلمہ حق پڑھ لیا۔ مثال موجود ہے۔'' بزرگ نے حلیمی سے جواب دیا۔

"مگر ماموں جان بڑا فرق ہے ان دونوں میں۔" عرفان پریشانی سے بولا۔

"انسانوں میں ضرور فرق ہے لیکن جذبہ ایمان ایک ہی ہے۔ اس سے انکار کرو گے؟"

"وہ سیاہ دل اور سفاک انسان ہے نجانے اس کے ذہن میں کیا اسکیم ہے۔" عرفان بولا۔

"کیا ڈاکو منگل سنگھ اس طرح اسکیمیں بناتا ہے۔ وہ لوٹنے آیا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس طرح پوری بستی میں گولیاں چل رہی تھیں یہاں بھی چلتیں۔ ہم میں سے کچھ خون میں نہا جاتے۔ وہ لوٹ مار کرتے اور یہاں سے چلے جاتے۔ بچو! جو کچھ ہوا ہے میں اس سے مشکوک نہیں ہوں۔ ذات باری پر میرا ایمان ہے۔ تم بھروسہ کرو اس کی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"لیکن ماموں جان ہم اس کے خلوص کو اپنا بھی تو سکتے ہیں۔" عرفان نے پرخیال انداز میں کہا۔

"وہ کس طرح؟" عبداللہ صاحب نے کہا۔

"پولیس ڈاکو منگل سنگھ کی تلاش میں ہے اور وہ یقیناً اس کے ٹھکانوں سے واقف ہوگا۔ وہ منگل سنگھ کو گرفتار کروا دے گا۔"

"لغو اور بے ہودہ خیال ہے۔ تمہیں علم ہے کہ وہ منگل سنگھ کی ناک کا بال ہے اور اس کے آدمیوں نے اسے سردار کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے اس کی حیثیت کا اندازہ کرلو اور یہ حیثیت بلاوجہ بھی نہیں ہوگی۔ اگر اس کے سینے میں جذبہ ایمان جاگ اٹھا ہے تو ہم اس کے اس جذبے کی اتنی بڑی قیمت طلب کریں جو اس کے لیے ناقابل برداشت ہو اور وہ کشمکش کا شکار ہو جائے۔ اس طرح وہ واپس بھی لوٹ سکتا ہے۔ عرفان میاں! میری دعا ہے کہ لوگوں کے جان و مال کا دشمن ختم ہو جائے لیکن منور کو بھول جاؤ۔ اب اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جیسا آپ پسند کریں ماموں جان!" عرفان نے کہا

"ویسے عرفان میاں! محسوس نہ کرنا میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا اور اس کی وجہ

یہ ہے کہ میں ہر قیمت پر منور کی حفاظت چاہتا ہوں۔ ممکن ہے تمہارے ذہن میں کوئی اور جذبہ جاگ اٹھے۔"

"نہیں ماموں جان! آپ کے احکامات سے انحراف کی جرأت نہ کبھی کی ہے اور نہ کرسکوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہم میں سے کوئی اب دوبارہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"میں نے یقین کرلیا۔ لیکن مجھے کل جانے کی اجازت دے دو۔ بس میں جانا چاہتا ہوں۔ یہ میری خواہش ہے۔"



"بالکل بچہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس دنیا میں کچھ نہیں دیکھا ہو۔ ہر چیز سے ناآشنا آنکھوں میں فرشتوں کی سی معصومیت۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ ڈاکے کس طرح ڈالتا تھا۔" شمائل نے کہا۔

"نانا میاں کے پالتو کی بات کررہی ہو۔ میرا مطلب ہے اس بوڑھے بچے کی جو نانا ابو کی نقل ہو بہو اتار لیتا ہے۔" ارشد بولا۔

"کیا مطلب؟" شمائل ہنس کر بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں! نانا میاں نماز پڑھتے ہیں تو وہ بھی نماز پڑھتا ہے، وہ کلام پاک پڑھتے ہیں تو وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔"

"بڑے ذلیل ہو تم ارشد! مذہب کا مذاق اڑا رہے ہو۔" شمائل بولی۔

"تم خود بتاؤ۔ بڑھاپے کے کام جوانی میں کرنے والے کو نقال نہیں کہا جائے گا تو پھر اور کیا کہا جائیگا نہیں۔"

"خیر عبادت نو جوانی ہی میں کرنی چاہیے۔ بڑھاپے کی عبادت بھی کوئی عبادت ہے۔"

"تم کرتی ہو؟"

"کرتی تو نہیں ہوں لیکن......"

"جی لیکن کیا......؟" ارشد حیرت سے بولا۔

"تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ اپنی بات کرو۔" شمائل چڑ کر بولی۔

''میں تو عبادت کرتا ہوں۔ پورے دل سے کرتا ہوں۔ کسی حسن کی دیوی کی پوجا کسی عبادت سے کم ہوتی ہے کیا؟''

''آ گئے نا اوقات پر۔'' شمائل ہنس پڑی۔'' حالانکہ جانتے ہو کہ اس پوجا سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''امید پر دنیا قائم ہے۔ دیکھ لو ہم تو تمہارے پیچھے احمد پور تک گئے لیکن ابھی تقدیر نہیں بنی...... ویسے ایک بات لکھ لو شمائل!''

''وہ کیا......؟''

''آج نہیں تو کل ہمارے بزرگوں کو سوچنا پڑے گا کہ ہم دونوں کی جوڑی عرش سے اتری ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''ممکن ہے۔'' شمائل نے کہا۔

''اس کے بعد تم مجھ سے اجتناب کس طرح کرو گی؟''

''میرا خیال ہے اس کے بعد اجتناب کی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی۔'' شمائل اٹھلا کر بولی۔

''تو شمائل آج کا کام کل پر کیوں اٹھا رکھا جائے۔ بزرگوں کو یہ فیصلہ کرنا ہی ہے۔ ہم ان کے فیصلے کا کیوں انتظار کریں۔ شمائل! یقین کرو میں تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔ میری تنہائیاں تمہارے تصور سے پر ہوتی ہیں۔ تمہارے سامنے آ کر میں کائنات کو بھول جاتا ہوں۔ میری کائنات تم مجھ سے دور نہ رہو مجھے خود میں کھو جانے دو۔ میں...... میں......'' ارشد نے آگے بڑھ کر شمائل کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے اور شمائل مسکرانے لگی۔

''نہیں نہیں مسٹر ارشد! باقی آئندہ۔ ویسے تم بے حد چالاک انسان ہو۔ میں کچھ اور باتیں کر رہی تھی۔ تم نے چالاکی سے اپنا نام داخل کر لیا۔ ہٹاؤ ہاتھ...... خود بھی رسوا ہو گے اور مجھے بھی بدنام کرو گے۔ چھوڑو بھی۔''

''شمائل! میں رسوائی ہی تو چاہتا ہوں۔ یہ رسوائی ہی ہم دونوں کے ملاپ کا باعث بن جائے گی اور ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میرے لیے یہ رسوائی اپنا لو شمائل۔''

''مجھے تمہاری یہ بدحواسی ہی ناپسند ہے ارشد! شادی سے پہلے یہ قربت ممکن نہیں

ہے اور نہ ہی میں اسے پسند کرتی ہوں۔ براہ کرم مجھے چھوڑ دو۔'' شمائل نے سخت لہجے میں کہا اور ارشد نے اسے چھوڑ دیا۔

''میرے ساتھ تمہارا رویہ بہت سخت ہے شمائل!'' وہ اداسی سے بولا۔

''میں نے کہا نا ارشد میں لاکھ ترقی پسند سہی لیکن اپنی حدود میں رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اگر ہم اخلاق کی حدود سے گزر گئے تو خود بھی پشیمان رہیں گے۔''

''حالانکہ میں تمہاری زندگی کا ساتھی ہوں۔ میری قربت سے تمہیں پشیمانی نہیں ہونی چاہیے لیکن خیر تمہاری مرضی............ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری اس بے رخی کو برداشت کر سکوں۔'' ارشد نے کہا اور دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔

''اوہ فروزاں! تم کب آئیں؟'' شمائل ایک شوخ و شنگ لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

''ابھی ابھی...... امی اور خالہ جان بھی آئی ہیں۔ لیکن آپ بڑی مشکوک حالت میں برآمد ہوئی ہیں۔'' فروزاں نے ارشد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ارشد ظہیر عبداللہ کو دیکھ کر سنبھل گیا۔ ورنہ شاید وہ ان لوگوں کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

''اونہہ۔ چھوڑو کیا فضول باتیں لے بیٹھیں۔ آؤ کمرے میں چلیں۔''

''ہائے شمائل! تیرے گھر میں تو قیامت آئی ہوئی ہے۔ اللہ کی پناہ میرے تو حواس کھوئے ہوئے ہیں۔ بتا تو اے کم بخت کون ہے وہ؟''

''لعنت ہے تم پر۔ اب کس کو دیکھ کر حواس کھو گئے تمہارے؟'' شمائل نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ سفید چہرہ، مخمور آنکھیں، جن میں نجانے کیسی سرخی چھائی ہوئی ہے۔ خدا کی قسم! یوں لگتا ہے جیسے بیس خون کر کے آیا ہے لیکن دلوں کے .... کیونکہ اس کا معصوم چہرہ خونیوں کا چہرہ نہیں لگتا۔ بلند و بالا تر............ گورے سینے پر گھنے سیاہ بال......''

''سفید قمیض پتلون...... کیوں؟'' شمائل نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔ اسی کی بات کر رہی ہوں۔''

''کہاں دیکھا تم نے؟''

"باہر برآمدے میں...... پھولوں کا گملا اٹھائے ہوئے تھا۔ خالہ جان آفت کی پرکالہ ہیں۔ ورنہ میں تو وہیں اس سے پوچھ گچھ کر لیتی دل پر ہاتھ رکھے رکھے تم تک آئی ہوں۔"

"مولوی منور!" شائل ہنس پڑی۔

"کیا مطلب؟"

"وہ دادا جان کا اسسٹنٹ ہے اور شاید ان کا ولی عہد بھی۔ دونوں میں عشق چل رہا ہے۔" شائل نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

"کن دونوں میں؟" فروزاں نے چونک کر پوچھا۔

"دادا جان میں اور اس میں۔"

"قتل کر دوں گی تمہارے دادا جان کو...... انہیں اس سے عشق کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے میری موجودگی میں۔" فروزاں نے مصنوعی جوش سے کہا اور شائل قہقہے لگاتی رہی۔

"ہائے شائل تم ہنس رہی ہو۔ تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا شاید۔ خدا کی قسم خوابوں کا شہزادہ لگتا ہے۔ ہر لحاظ سے ایک مکمل مرد۔ گریگوری پیک اس کے سامنے کچھ نہیں۔ مگر ہے کون؟"

"بس یونہی۔"

"یہیں رہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کوئی رشتے دار ہے تمہارا؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"خدا کے لیے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ میں تو مر مٹی ہوں اس پر۔ ارے...... مگر ایک بات تو بتاؤ؟"

"ہوں۔"

"کہیں تم خود تو...... میرا مطلب ہے...... اگر ایسی بات ہے شائل تو...... تو یقین کرو میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ تم نے ہمیشہ میرے اوپر اعتماد کیا ہے۔ کیا میں

نے کبھی تمہارے اعتماد کو دھوکا دیا؟"

"کہاں کی ہانک رہی ہو یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن فروزاں اس کے بارے میں تمہیں سچ نہیں بتا سکتی۔"

"کیوں؟"

"بس میں نے دادا جان سے وعدہ کیا ہے۔"

"فروزاں اور شائل الگ الگ ہیں؟ اگر اقرار کر لو گی تو پھر کچھ نہیں پوچھوں گی۔" فروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن دادا جان سے کیا ہوا وعدہ......"

"تمہیں میری جان کی قسم شائل مجھے بتا دو اور میں تمہاری جان کی قسم کھا رہی ہوں کہ تمہارے وعدے کی لاج رکھوں گی۔" فروزاں بولی۔ شائل چند ساعت کشمکش کا شکار رہی اور پھر اس نے پوری تفصیل فروزاں کو بتا دی۔ فروزاں دنگ رہ گئی تھی۔ "خدا کی پناہ۔ تو اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی ہے۔"

"لیکن اتنا معصوم انسان فروزاں کہ یقین نہیں آتا۔ ہر چیز سے اجنبی۔ بھٹکا بھٹکا سا۔ جیسے کسی کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔"

"ہائے کتنا پرکشش ہے۔ کتنا رومینٹک کیا کروں شائل! بتاؤ اس کے لیے کیا کروں!"

"تفصیل جان کر بھی اسے پسند کرتی ہو؟"

"ارے یہ تو اور بھی حسین بات ہے۔ غور تو کرو۔ وہ برائیاں چھوڑ کر نیکیوں کی طرف آیا ہے۔"

"اور تم اسے پھر برائیوں کی جانب لے جانا چاہتی ہو؟" شائل نے ہنس کر کہا۔

"اتنی بری ہوں میں؟" فروزاں برا مان گئی اور شائل اسے منانے لگی لیکن فروزاں روٹھی رہی۔

"ایک شرط پر مانوں گی۔" وہ بولی۔

"بکو بابا...... بکو۔"

"اسے یہاں بلاؤ۔"

"خدا کی قسم۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ آج تک میں اس سے مخاطب نہیں ہوئی۔ ہمت ہی نہیں پڑتی۔ جو روپ اس کا دیکھ چکی ہوں بہت .... بے حد خوفناک تھا۔"

"جانے وہ ڈاکے کیسے ڈالتا ہوگا۔ اسے دیکھ کر تو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے کو جی چاہتا ہے۔" فروزاں آنکھیں بند کر کے بولی اور شمائل بھی ایک لمحے کے لیے اس کے تصور میں کھو گئی۔ فروزاں کی آنکھیں بند تھیں اور شمائل چشم تصور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ چونک پڑی۔ فروزاں ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ وہ مردانہ حسن کا شاہکار ہے۔ ایک پراسرار شخصیت کا مالک۔ لیکن اب تک میں نے اس کی طرف توجہ کیوں نہیں کی تھی۔ شمائل کو اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ فروزاں اس کے بارے میں نجانے کیا کیا کہتی رہی۔ شمائل نے ٹھیک سے سنا بھی نہیں تھا۔ وہ تو تصور کی آنکھ سے مسلسل منور کو دیکھے جا رہی تھی ۔اس کی ہر جنبش پر کشش تھی۔ اس کی ہر ادا بے مثال تھی۔

فروزاں شام تک شمائل کے ساتھ رہی اور مختلف بہانوں سے منور کے سامنے آتی رہی۔ لیکن منور نے شاید ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ متین چہرے اور پر رعب آواز والے نوجوان کی ان اداؤں نے شمائل کو بے خود کر دیا۔ پھر فروزاں کے جانے کے بعد ایک بار......صرف ایک بار اتفاق سے ارشاد اور منور یکجا ہو گئے۔ فرق نمایاں تھا۔ اس کا رنگ کشمیری سیب کی مانند تھا اور ارشد سوکھا سہا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی تھی اور ارشد کی آنکھوں میں مکاری۔ اس کا قد بالا تھا۔ جبکہ ارشد کا سر اس کے کاندھوں کو چھوتا تھا۔ اس کا اور ارشد کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ شمائل خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

ظہیر صاحب کافی جدت پسند تھے۔ زمانے کی قدروں کے ساتھ ساتھ چلنے کے عادی۔ جبکہ ان کے والد عبداللہ درویش صفت تھے۔ اور ایک طرح سے تارک الدنیا۔ بچوں سے انہیں الفت تھی۔ اس لیے ان کی وجہ سے کبھی کبھی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال لیتے تھے ورنہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ ویسے ان کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی بات آخری بات ہوتی تھی اور اس کے آگے کسی کی دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ منور ان کا چہیتا تھا۔ انہوں نے یہاں آ کر صرف اتنا کہا تھا کہ منور ان کا بچہ ہے۔

اس سے زیادہ کسی کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ منور کو گھر میں وہی حیثیت دی گئی تھی جو دوسرے بچوں کو حاصل تھی لیکن وہ سادہ لوح تھا اور دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ گھر میں اسے مولوی منور کہا جانے لگا تھا لیکن اسے کسی کا کچھ کہنا سننا برا نہیں لگتا تھا۔ جیسے وہ ہر احساس سے عاری ہو۔



فروزاں نے اب یہ گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ بلا ناغہ آ جاتی تھی۔ کبھی کسی بہانے، کبھی کسی بہانے......لیکن آنے کا مقصد منور ہی ہوتا تھا۔ شمائل دل ہی دل میں اس کی آمد سے کڑھنے لگی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے فروزاں اس کا حق چھیننا چاہتی ہو لیکن ابھی تک بگڑی اس لیے نہیں تھی کہ منور کی کوئی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔ اس نے تو شاید ایک بار بھی فروزاں کو نہیں دیکھا تھا۔

"شمائل! تم ہی کچھ کرو۔ میں تو تھک گئی۔" ایک شام فروزاں نے کہا۔

"اس سے بات نہیں کی؟"

"ایک لمحے کے لیے جو ہاتھ آیا ہو۔ میں نے کئی بار اسے اشارے کیے ہیں۔ زبانی بھی بہت کچھ کہا ہے۔ عجیب احمق ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"میرے لیے اس سے بات کرو۔"

"اس نے آج تک مجھ سے بھی بات نہیں کی فروزاں! یقین کرو میں اس سلسلے میں بالکل مجبور ہوں۔" شمائل نے صاف کہہ دیا۔

"بڑی خود غرض ہو شمائل! اتنا سا کام نہیں کر سکتیں۔"

"براہ کرم فروزاں مجھ سے یہ فضول باتیں مت کیا کرو۔ میں اس سے یہ کہوں گی کہ تم فروزاں سے عشق کرو۔" شمائل کا لہجہ خشک ہو گیا۔

"کبھی نہیں بولوں گی تجھ سے اور آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔"

"آج کل تم میرے لیے آتی بھی کب ہو۔ سچ بات کہوں گی تو برا مان جاؤ گی۔" شمائل نے کہا اور فروزاں ناراض ہو کر چلی گئی۔ شمائل نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن ایک

بات حقیقت تھی۔ منور نے واقعی آج تک اس سے گفتگو نہیں کی تھی۔ کئی بار شمائل نے اسے مخاطب کیا تھا لیکن جو بات کہی خاموشی سے سنتا رہا۔ گردن ہلائی اور چلا گیا۔ کبھی نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ کیا اس کی نگاہوں میں میری بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ شمائل نے سوچا پھر اس نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ اس نے منور کے لباس میں، اس کی ضروریات کی چیزوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ بے شمار تحائف خریدے اس کے لیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایک نیاز مندانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ جاتی تھی اور بس۔

تب ایک شام اس نے منور کو روک لیا۔

''سنو منور!'' اور وہ ٹھٹک گیا لیکن نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''میری طرف دیکھو۔''

''کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''کم بخت کے لہجے میں اتنی خود اعتمادی ہے کہ دوسرا انسان خود کو اس سے ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔'' شمائل نے سوچا۔

''ہاں۔''

''فرمائیے۔''

''تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' شمائل نے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

''اس ماحول سے تمہارا دل نہیں اکتاتا؟''

''نہیں۔''

''کافی عرصہ ہو گیا تمہیں اپنی دنیا چھوڑے۔ اب اس دنیا کو چھوڑ کر یہ دنیا اپناؤ۔ میں بلکہ شاید کوئی بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ دادا جان درویش منش ہیں لیکن ہمارے دلوں میں تمہارے لیے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں۔''

''میں ماضی بھول چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''حال کو تو مت بھولو۔ یہاں انسان بستے ہیں خود کو انسانوں میں محسوس کرو۔ باہر

نکلو۔ دنیا دیکھو۔ بہت کچھ ہے اس دنیا میں۔ یہاں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے۔ گلرنگ فضا، مست کر دینے والی فضا میں پھول کھلتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ تم لوگوں کی چاہت سے دور نہیں ہو خود کو اپنوں میں محسوس کرو۔''

''آپ لوگ میرے لیے بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں آپ سب کے لیے جان دے سکتا ہوں۔''

''سب کی نہیں میری بات کرو منور! میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں۔ شاید اس وقت سے جب اس رات میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ میں محسوس نہیں کر سکی تھی منور! لیکن آج...... آج مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ اب میں صبر نہیں کر سکتی منور! اور اب جبکہ میں نے اپنی زبان کھول لی ہے تو تمہیں میری لاج رکھنا ہوگی۔ سمجھے منور! تمہیں میری محبت کا جواب محبت سے دینا ہوگا۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے بدستور سپاٹ آواز میں کہا۔

''میں...... میں تم سے شادی کروں گی۔ میں تمہاری آغوش میں آنا چاہتی ہوں منور! میں......'' شمائل کو نجانے کیا ہو گیا۔ اس نے منور کے دونوں شانے پکڑ لیے اور اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ تب منور سکون سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آہستگی سے خود کو شمائل سے الگ کر دیا۔

''شاید اس گھر میں یہ پہلا کام ہے جو میں یہاں کے فرد کے حکم سے نہیں کر سکوں گا۔ میں نے یہاں پناہ لی ہے اور عبداللہ صاحب نے مجھے گناہ و ثواب کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ آپ جو چاہتی ہیں وہ گناہ ہے۔ افسوس میں گناہ میں آپ کا شریک نہیں ہو سکتا۔ آپ آئندہ یہ خیال اپنے ذہن میں نہ لائیں۔''

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم سے کہا ہے منور! اور میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں میری لاج رکھنا ہوگی۔'' شمائل غرائی۔

''میں آپ کی اس نادانی کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' وہ بولا۔

''میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی منور! تم جو ہو میں جانتی ہوں۔ تمہارے ہاتھوں میں آج بھی خون کی بو رچی ہوئی ہے اگر اپنا وقار چاہتے ہو تو ایک خون اور کر دو۔ منور! میری

گردن دبا دو۔ ورنہ بہت کچھ کھو بیٹھو گے۔ اتنا کچھ کھو بیٹھو گے کہ کبھی نہ پاؤ گے۔ میں عورت ہوں۔ مجھ سے بڑا دشمن تمہیں روئے زمین پر نہ ملے گا۔''

''میں دشمنوں کو خاطر میں لانے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہارا سب کچھ برباد کر دوں گی منور! وہ سزا جو تمہیں قانون نہیں دے سکا، وہ میں دوں گی۔ تم مسلسل میری توہین کیے جا رہے ہو۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا منور کہ تم مجھے اس حقارت سے ٹھکرا دو گے تو خدا کی قسم میں کبھی تم سے اپنے دل کا راز نہ کہتی۔ ساری عمر خاموش رہتی لیکن اب .... یہ راز زبان پر آ چکا ہے تو میں .... میں اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہوں۔ میں آج رات تمہارے پاس آؤں گی اور .... اور تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گے ورنہ کل صبح ...... کل صبح ......'' شائل پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

''میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ خود کو قابو میں رکھیں ورنہ نقصان آپ کا ہو گا۔'' منور نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شائل اپنی انگلیاں چبانے لگی اور ان انگلیوں میں سے خون رسنے لگا۔ لیکن اسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بلاشبہ وحشت میں وہ منگل سنگھ سے کم نہیں تھی۔

اور رات کے پچھلے پہر جب تمام آرام گاہیں تاریک ہو گئیں تھی۔ وہ منور کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔ منور جاگ رہا تھا۔

''کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ انداز میں وہی لاپرواہی تھی۔

''کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

''یہی کہ آپ کو سمجھاؤں۔ میں اس گھر کے کسی فرد کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی مناسب حکم ہوتا تو آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہوتی۔ لیکن .... آپ .... یقین کریں شائل کہ ساری زندگی ....''

''کچھ نہیں سنوں گی منور! ...... کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میرے سامنے آؤ ..... مجھے

آغوش میں لو...... مجھے...... مجھے......''

''میرا خیال تھا آپ کی دیوانگی کچھ کم ہو گئی ہو گی۔'' وہ بولا۔

''تم عورت کو نہیں جانتے منور لیکن جان جاؤ گے۔'' وہ غرائی۔

''کچھ بھی ہو عبداللہ صاحب کا اعتماد مجروح نہ ہو گا۔ میں ہر خسارے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ اپنی انا، اپنی نسوانیت سب کچھ داؤ پر لگا کر تمہارے پاس آئی تھی۔ قصور تمہارا ہے۔ میری دیوانگی کی آگ کو اپنی محبت سے سرد کر دیتے پر تم آج بھی ڈاکو ہو۔ وحشی اور مغرور۔ لیکن آج میں تمہارا غرور توڑ دوں گی۔ تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے منور! تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے۔'' وہ طوفان کی مانند کمرے میں نکل آئی۔ اس کا وجود شعلوں کی زد میں تھا۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ارشد کے دروازے پر رکی اور اس نے ہولے ہولے کئی بار دستک دی اور ارشد نے دروازہ کھول دیا۔

''شائل۔'' اس کے منہ تحیر زدہ آواز نکلی اور شائل نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ارشاد عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں شائل کے چہرے کی تمتماہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔

''ارشد۔'' شائل کی آواز تیز سانسوں کے درمیان ابھری۔

''ہاں جان۔''

''میں خود کو تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں۔ بولو مجھے قبول کرو گے۔ میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کر دوں گی۔''

''شائل۔'' ارشد کی آواز سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

''ہاں ارشد! لیکن تمہیں ایک ڈرامہ کرنا ہو گا۔ میرے ساتھ مل کر۔ بولو کرو گے؟''

''جان نچھاور کر دوں گا جانِ من! تم صرف ڈرامے کی بات کر رہی ہو۔ بات کیا ہے؟''

''میں آج اس مغرور ڈاکو کے چیتھڑے اڑانا چاہتی ہوں۔ میں نہ صرف اسے اس

گھر میں رسوا کرنا چاہتی ہوں بلکہ............ بلکہ اسے گرفتار کروانے کی خواہشمند بھی ہوں۔ سمجھے اور اس کے لئے اس پر آبروریزی کا الزام لگاؤں گی۔ یہ ثبوت اس کے خلاف ہوگا اور تم ......" اس کی آواز سرگوشیوں میں ڈوب گئی اور ارشد کے ہونٹوں پر شیطنت ابھر آئی۔

"تم جس طرح چاہوگی سب کچھ اسی طرح ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

دوسری صبح تمام لوگ ناشتے کی میز پر پہنچ گئے لیکن شائل نہیں پہنچی تھی۔ تب ظہیر صاحب نے ملازمہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"دیکھو کیا کررہی ہے بلا کر لاؤ۔" ظہیر صاحب نے کہا اور ملازمہ چلی گئی لیکن چند ساعت کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"بی بی............ صاحب............ چھوٹی بی بی............ چھوٹی بی بی......!" اس کی دہشت بھری آواز ابھری اور سب اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

"کیا بات ہے؟" ظہیر صاحب بدحواسی سے بولے اور پھر ملازمہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر شائل کے کمرے کی طرف دوڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور اندر داخل ہوکر انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر انہیں چکر آ گیا۔ شائل کے ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر لباس کا ایک تار بھی نہیں تھا جگہ جگہ خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ یا تو وہ مرچکی تھی یا بے ہوش تھی۔ ظہیر صاحب نے دوسرے لمحے خود کو سنبھالا اور دروازے پر آ جمے۔ تمام لوگ پہنچ رہے تھے۔

"رک جاؤ۔ تم لوگ وہیں رک جاؤ۔" انہوں نے ڈوبتے الفاظ میں کہا اور اپنی بیگم کو اندر بلا کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بیگم کی حالت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے ظہیر صاحب نے اسے سنبھالا اور دونوں نے مل کر شائل کے منہ سے کپڑا نکالا، اس کے ہاتھ کھولے اور اسے لباس پہنایا۔ اس کی سانسیں اعتدال پر تھیں۔

"ڈاکٹر کو......ڈاکٹر کو بلاؤ۔" بیگم نے لرزتی آواز میں کہا۔

"نہیں بیگم نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ لیکن اس گھر میں ......اس کے ساتھ یہ سب کچھ کس نے کیا اور باہر جو لوگ کھڑے ہیں انہیں کیا بتاؤں۔ آہ......کچھ چھپانا ناممکن ہے۔ بلالو سب کو بلالو۔"

اور چند ساعت بعد شائل کے گرد تمام لوگ جمع تھے۔ اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کی جارہی تھیں۔ ظہیر صاحب نے کمرے کی پچوایشن اور شائل کی حالت کے بارے میں سب کو بتا دیا تھا اور سب خاموش رہ گئے تھے۔ ہاں ابھی تک دادا جان کو اطلاع نہیں ملی تھی۔ وہ گھر کے باہر دوسرے حصے میں رہا کرتے تھے اور منور بھی ان سے چند گز دور کمرے میں تھا۔ وہ لوگ عام طور سے گھر والوں کے مشاغل میں شریک نہیں رہتے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد شائل کو ہوش آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور پھر اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔

"ڈاکو......ڈاکو......آہ ڈاکو......" اور پھر وہ مسلسل ڈاکو ڈاکو چیختی رہی۔ سب اسے تسلیاں دینے لگے تھے۔

"ڈاکو......" ظہیر صاحب نے تعجب سے کہا۔

"کیا گھر میں ڈاکہ بھی پڑا ہے؟"

"ماموں جان۔" ارشد کی گھمبیر آواز ابھری۔

"براہ کرم اس طرف آیئے میرے ساتھ براہ کرم۔" اور ظہیر صاحب دوسروں کے قریب سے ہٹ گئے۔ پھر اس نے کہا۔

"ماموں جان ہم سب اپنی شرافت اور نیکیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں ان چیخوں اور تکرار کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"دادا جان! ہمارے لیے جس قدر قابل احترام ہیں، اس کے تحت ہماری مجرمانہ خاموشی قابل معافی ہے۔ ان سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ منور کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ لیکن آج......جو کچھ ہوا ہے وہ غیر متوقع تھا ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

"منور؟" ظہیر صاحب چونک پڑے۔

"ہاں۔ وہ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ ڈاکو منگل سنگھ کا نائب۔" اور ارشد نے انہیں شروع سے آج تک کی تفصیل بتا دی۔ ظہیر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے تمام لوگوں کو شائل کے کمرے سے نکال دیا اور شائل کو دلاسہ دینے لگے۔

"تمہارے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی...... شائل! بتاؤ یہ زیادتی کس نے کی؟"

"منور...... ڈاکو منور......" شائل نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لینے لگی۔ ظہیر صاحب سلگتا وجود لے کر کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ خاموشی سے باہر نکل آئے۔ ان کا رخ دادا جان کی رہائش گاہ کی جانب تھا۔ ارشد ان کے پیچھے ہو لیا۔ دادا جان منور کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ظہیر صاحب آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے اور منور پر پل پڑے۔ انہوں نے اسے گھسیٹ کر نیچے گرایا اور پھر اس کے سینے پر چڑھ کر اسے پوری قوت سے مارنے لگے۔

"ارے ارے ارے۔" دادا جان کے منہ سے صرف یہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھے اور اپنے کمزور ہاتھوں سے ظہیر صاحب کو منور پر سے اٹھانے لگے۔ منور بے چارہ خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے، نکسیر پھوٹ گئی اور خون بہنے لگا تھا۔

"ظہیر۔ ہٹ جا ظہیر! ورنہ...... ورنہ......!" دادا جان چیخے اور اسی وقت منور نے زمین پر دونوں ہاتھ لگائے اور ظہیر صاحب کو لئے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی تھی۔ اس نے ظہیر صاحب کے ہاتھ پکڑ لیے اور ظہیر صاحب کو اپنی کلائیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ منور ایک دیو کی مانند ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"عبداللہ صاحب کی بات سنو۔" اس کی آواز میں گرج تھی۔

"کیا بات ہے ظہیر، کیا جنون چڑھا ہے تجھے، پاگل ہوا ہے کیا؟"

"ابا میاں! ابا میاں! آپ کی نیک نفسی نے ہمیں تاریک کر دیا۔ اس نے...... اس

نے شائل کی آبروریزی کی ہے اس نے...... اس نے...... حق نمک ادا کیا ہے۔"

"بکواس...... غلط...... بالکل غلط۔" دادا میاں چیخے۔ منور نے ظہیر صاحب کی کلائیاں چھوڑ دی تھیں۔ پھر پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے کا خون صاف کرنے لگا تھا۔

"پوچھیے اس سے...... پوچھیے' ابا میاں اس سے...... آپ کا احترام ہمیں لے ڈوبا۔"

"منور...... منور...... بول...... یہ کیا کہہ رہا ہے۔ جواب دے منور۔" دادا میاں پلٹے اور منور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خدا سے پوچھیے عبداللہ صاحب! میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ خدا بے وجود نہیں ہے۔ میں نہیں بولوں گا۔ خدا سے پوچھیے...... بس خدا ہی جواب دے گا۔" منور کی آواز میں پھر غراہٹ بلند ہو گئی۔

"یہاں سے نکل جا ظہیر۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے تو شائل سے پوچھ۔ اصلی مجرم کو تلاش کر منور بے گناہ ہے۔ باہر نکل جا۔"

"میں اگر باہر نکل گیا ابا جان تو اس گھر کی عزت کا جنازہ بھی نکل جائے گا۔ سمجھے آپ۔"

"کچھ بھی ہو جائے منور بے گناہ ہے۔ میں جانتا ہوں خدا جانتا ہے۔" دادا جان غضب ناک آواز میں بولے۔

"اچھی بات ہے فیصلہ ہو کر رہے گا۔" ظہیر صاحب پر بھی جنون سوار ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ وہ باہر سے بند کر گئے تھے۔ پھر پولیس آئی اور منور کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ہسپتال سے شائل کی بھی رپورٹ حاصل کی گئی۔ شائل نے بیان دیا کہ منور دھوکے سے اس کے کمرے میں گھس آیا تھا اور وہ اس قوی ہیکل ڈاکو سے نہ نمٹ سکی۔ ارشد نے بیان دیا کہ منور منگل سنگھ کا نائب تھا۔ اس نے پوری تفصیل بتا دی اور پورا گھر مسائل کا شکار ہو گیا۔

جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اسے پورا ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس کے پورے بدن پر لاتعداد زخم تھے۔ عجیب ہنگامے جاری تھے۔ اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا جا چکا

تھا۔آبروریزی کا مقدمہ تو قائم ہی تھا لیکن زخم اس لیے لگائے گئے تھے کہ وہ منگل سنگھ کے ٹھکانے بتا دے۔نجانے کہاں کہاں سے پولیس افسر آئے اور اس سے منگل سنگھ کا پتہ پوچھنے کے لئے اس پر مشق ستم کرتے رہے لیکن اسے منگل سنگھ کے شانے سے بہتا ہوا خون یاد تھا اس کے الفاظ یاد تھے۔

''ایک ایک قطرے کی قیمت وصول کریں گے تجھ سے سسرے! ایک ایک قطرے کی۔'' اور وہ اس خون کی قیمت ادا کر رہا تھا۔ ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا منگل سنگھ کے بارے میں اس کے منہ سے۔شہر کے تمام اخبارات کا موضوع وہی تھا۔ظہیر صاحب کا گھرانہ بدنام ہو کر رہ گیا تھا۔ پولیس نے ان لوگوں کو بھی خوب ہی پریشان کیا تھا۔ بہرحال ابھی تک پولیس اس سے منگل سنگھ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکتی تھی۔

تب ایک شام کچھ نئے قیدی جیل میں آئے اور انہیں بند کر دیا گیا۔رات کے آخری پہر اچانک جیل میں خوفناک دھماکے ہونے لگے۔ ہینڈ گرینڈ اور اسٹین گنوں کا استعمال ہو رہا تھا۔منور بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔دفعتہً اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ اندر گھس آئے۔

''آؤ منور۔'' ایک آواز ابھری اور یہ آواز منور کے لیے اجنبی تھی۔''سوچنے کا وقت نہیں ہے آؤ۔'' کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔کئی جگہ ان لوگوں نے گولیاں چلائی تھیں اور پھر وہ ایک دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ جسے بموں سے توڑا گیا تھا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔منور کو اس گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔منور کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور اسے لے جانے والے کون ہیں۔ جس عمارت میں اسے لے جایا گیا تھا وہ بہت خوبصورت تھی۔ چمکدار شفاف فرش......طول وطویل عمارت......اس عمارت کے ایک کمرے میں لے جا کر اسے چھوڑ دیا گیا۔پھر ایک ڈاکٹر آیا اور اس نے منور کے زخموں کو دیکھ کر مرہم پٹی کی اور اسے دوا انجکشن بھی لگائے۔

''اب تم آرام سے سو جاؤ۔تمہیں نیند آ جائے گی۔'' اور منور کو نیند آ گئی۔

خوب گہری نیند سویا وہ اور دوسری صبح جب وہ جاگا تو اسے ایک شکل نظر آئی۔سفید

لباس میں ملبوس سفید صورت۔سادہ سے نقوش اور بڑی بڑی ہموار آنکھوں والی جو اسے جاگتے دیکھ کر مسکرا پڑی تھی۔

''کیسے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک۔لیکن تم......''

''نرس ہوں۔تمہاری خدمت پر مامور کی گئی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نرس!'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''اوہ نہیں ڈاکٹر نے ہدایت کی ہے کہ تمہیں اٹھنے نہ دیا جائے۔ٹھہرو، میں تمہارے ہاتھ منہ دھونے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر ایک طرف چلی گئی۔منور بے تاثر سی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔نرس برتن لیے واپس آ گئی اور پھر اس نے کپڑا گیلا کر کے منور کا چہرہ صاف کیا، اسے کلی کرائی اور اس کے بعد پھلوں کا رس لے آئی۔

''اسے پی لو۔ یہ تمہارا ناشتہ ہے۔'' نجانے کیوں منور کو یہ پیار بھرا تحکمانہ انداز بہت اچھا لگا۔اس کی کسی اجنبی حس کو سکون مل رہا تھا۔وہ بچوں کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کرتا رہا اور نرس مسکراتی رہی۔دوپہر کو اس نے کھانا بھی منور کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ جو سادہ سی چیزوں پر مشتمل تھا۔پھر ڈاکٹر نے آ کر اسے دیکھا اور ایک اور انجکشن دے کر چلا گیا۔نرس بھی اس کے پاس موجود تھی۔اس دوران اس نے کوئی غیر ضروری گفتگو نہیں کی تھی۔وہ انوکھی لذت محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی اس پر۔دن گزرا، رات آ گئی پھر دوسرا دن اور دوسری رات اس دوران نرس اور ڈاکٹر کے علاوہ کوئی اور اس کے پاس نہیں آیا تھا۔نرس اس کی پوری دیکھ بھال کر رہی تھی۔

تیسرے دن اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔جیل کی اذیتوں کے زخم خشک ہونے لگے تو پہلی بار اس نے نرس سے پوچھا۔''مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟''

''ابھی تو شاید کافی دنوں تک۔اول تو تمہارے زخم خشک ہونا ضروری ہیں۔پھر پولیس چپے چپے پر تمہیں تلاش کر رہی ہے۔''

''میرے ہمدرد کون ہیں یہ بات مجھے ابھی تک نہیں معلوم ہو سکی۔''

''تم نے پوچھی ہی نہیں تھی۔''

"بتانا پسند کرو گی؟"

"کیوں نہیں۔ کشنو جی! اکثر تمہاری خیریت پوچھتے رہتے ہیں۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ تم سے ملاقات کے لئے نہیں آئے۔"

"کشنو جی کون ہیں؟"

"اس گروہ کے سربراہ۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"گروہ؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ارے ہاں۔ تمہیں تو گروہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جس طرح منگل سنگھ کا گروہ ہے۔ اسی طرح کشنو جی کا بھی گروہ ہے۔ دونوں کا ایک ہی کام ہے۔"

"اوہ۔ تو کیا وہ بھی ڈاکے ڈالتے ہیں؟"

"گھوڑوں پر بیٹھ کر بستیاں نہیں لوٹتے۔ شہر میں بینک لوٹے جاتے ہیں۔ اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ ہوتی ہے۔ بلیک میلنگ بھی کی جاتی ہے۔ اور نشہ آور ادوایات بھی فروخت کی جاتی ہیں۔ کشنو جی! کا گروہ یہ کام کرتا ہے۔"

"اور مجھے جیل سے نکال کر کیوں لایا گیا ہے؟" منور نے گھبرا کر پوچھا۔

"منگل سنگھ کی درخواست پر۔ منگل سنگھ تمہاری تلاش میں یہاں آئے تھے۔ اور سردار سرداروں کے دوست ہوتے ہیں۔ کشنو جی نے ان کی خواہش پر جیل توڑی تھی لیکن چونکہ شہر میں پولیس چوکس ہے۔ اس لیے ابھی تک تمہیں یہاں سے نکالا نہیں جا سکتا۔"

"منگل سنگھ کہاں ہیں؟"

"واپس چلے گئے ہیں لیکن حالات ٹھیک ہوتے ہی تمہیں لینے آئیں گے۔"

"میں ...... میں اب منگل سنگھ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں اب اس قابل نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! میں نہیں جاؤں گا مجھے اب ان ساری باتوں سے نفرت ہے۔ میں اب منگل سنگھ کے لیے بیکار ہوں۔ میں اب ڈاکے نہیں ڈالوں گا۔"

"کیوں؟" نرس نے تعجب سے پوچھا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ آہ۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ میں تو ایک دیہاتی لڑکا ہوں۔ میں صوفی عظمت اللہ کا بیٹا ہوں۔ میں تو مجبوریوں کا شکار ہو گیا تھا ورنہ...... مجھے لوٹ مار اور

وحشت و بربریت سے نفرت ہے۔ آہ اب میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ منگل سنگھ کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ وہ اب میرے لیے بیکار کوشش کر رہا ہے۔ میں ...... میں ...... جو کچھ کر چکا ہوں اس کا کفارہ ساری زندگی نہیں ادا کر سکتا۔ آہ۔ نرس میری مدد کرو۔ خدا کے لیے میری مدد کرو مجھے اب ان وحشیوں کے درمیان نہ جانے دو۔"

"لیکن تم نے منگل سنگھ کو بچانے کے لیے اتنے زخم کھائے ہیں۔"

"وہ ایک قرض تھا۔ ان احسانات کا قرض جو منگل سنگھ نے مجھ پر کیے تھے۔ اگر وہ میری گردن کاٹ ڈالتے تب بھی میں منگل سنگھ کے بارے میں نہ بتاتا۔ لیکن ذاتی طور پر اب میں منگل سنگھ کے کام کا بھی نہیں ہوں۔"

نرس کے ذہن میں گرج ہو رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ ایک گولا سا اس کے حلق میں آ رہا تھا۔ بمشکل اس نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔ "تو اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے خاموشی سے یہاں سے نکل جانے دو۔ زمین کے کسی گوشے میں جا کر موت کا انتظار کروں گا لیکن اب کسی قیمت پر میں وحشت کی زندگی میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

"میں تمہاری مدد کروں گی منور! لیکن پولیس..........."

"میں خود کو تقدیر کے حوالے کر دوں گا۔ تقدیر میرے لیے جو فیصلہ کرے۔"

"تب پھر وقت کا انتظار کرو۔" نرس کی آواز ابھری۔

"وعدہ نرس؟"

"ہاں وعدہ۔" نرس کی آواز میں ایک انوکھا عزم تھا۔



رات کے تین بجے تھے جب وہ اسٹیشن پہنچے۔ نرس منور کو عمارت کی عقبی کھڑکی سے اتار کر باہر لائی تھی۔ اس کے پاس ایک لباس بھی تھا جو اس نے منور کو پہننے کے لیے دیا تھا۔ ایک تاریک گوشے میں منور نے وہ لباس پہن لیا۔ نرس نے اپنے ہاتھوں سے اسے دیہاتی قسم کی پگڑی پہنائی اور پھر وہ وہاں سے چل پڑے۔ روشنی میں منور نے نرس کو بغور دیکھا۔ اب تک اس نے اس کے لباس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بھی ایک دیہاتی لباس میں ملبوس تھی۔ بڑی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ پونے چار بجے ٹرین آئی اور نرس اس کے ساتھ

ہی کمپارٹمنٹ میں سوار ہوگئی۔ دونوں ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ عام طور سے لوگ سو رہے تھے۔ جو جاگ رہے تھے وہ بھی اونگھ ضرور رہے تھے۔ ریل چل پڑی تو منور نے تعجب سے نرس کو دیکھا۔

"تم کہاں جارہی ہو؟" اس نے پہلی بار سوال کیا۔

"فی الوقت تمہارے ساتھ' لیکن بےفکر رہو میں تمہارے اوپر بار نہیں بنوں گی۔"

"تم نے اپنے گروہ کے ساتھ غداری کی ہے نا...... میں جانتا ہوں میری وجہ سے وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے۔"

"ہاں لیکن تمہیں بچانا ضروری تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"میری وجہ سے تم نے یہ مصیبت مول لی ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں منور! تمہاری وجہ سے تو میرے دل میں ایمان جاگا ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو میرے ذہن میں برائیوں سے بچنے کا خیال آیا ہے۔ ورنہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تم نے آج تک میرا نام نہیں پوچھا۔ میں خود بتاتی ہوں۔ میرا نام نگہت ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی میں رہتی تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد زندگی بوجھ بن گئی اور چھوٹے بہن بھائی اور ماں کی کفالت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بڑی کوشش کی ہم نے کہ بستی ہی میں کوئی سہارا پیدا ہوجائے لیکن کوئی سبیل نہ ہوسکی۔ پھر کچھ جاننے والوں کی مدد سے یہاں آگئی۔ خیال تھا کہ کسی گھر میں نوکری کروں گی اور ماں اور بہن بھائی کی کفالت کروں گی۔ نوکریاں بہت ملیں لیکن عزت داؤ پر لگ جاتی تھی۔ کہاں کہاں سے نوکری چھوڑتی۔ پھر کچھ برے لوگوں کے ہاتھ لگ گئی۔ یہاں عزت خطرے میں نہیں تھی لیکن دوسری برائیاں تھیں۔ غنیمت جانی اور آہستہ آہستہ گروہ میں مقبول ہوگئی۔ کشنو جی کو میرے اوپر بھروسہ ہوگیا اور اہم کام میرے سپرد کیے جاتے تھے۔ اب ماں آرام سے رہتی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی سکون سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ معقول رقم بھیجتی ہوں انہیں ہر ماہ۔ لیکن تمہارے عزم نے دل دکھا دیا۔ میں بھی تو بروں کے ساتھ ہوں۔ وہ ہر گناہ کرتے ہیں چنانچہ تمہارے ساتھ میں نے بھی انہیں چھوڑ دیا۔ اب اپنی ماں کے ساتھ رہوں گی۔ برا وقت ٹل گیا ہے۔ بستی ہی میں کچھ کروں گی۔ اب اتنی مشکلات نہ ہوں گی۔ اب میں تمہیں بھی

پیشکش کرتی ہوں منور! کہاں بھٹکتے پھرو گے۔ میرے ساتھ چلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہارے لیے دردِسر نہ بنوں گی۔"

منور نے گردن جھکا دی۔ نگہت بھی اس کی طرح زمانہ کا شکار تھی۔ وہ بھی قابل رحم لڑکی تھی۔ ایک اور سہارا مل رہا تھا۔ کیا یہ مناسب رہے گا، کیوں نہ اس سہارے کو قبول کرلیا جائے! میں ان لوگوں کی مدد کروں گا۔ میں انہیں زمانے کا شکار ہونے سے بچاؤں گا۔ ممکن ہے خدا میری کسی نیکی کے عوض میرے گناہوں کو معاف کردے۔

چھوٹی سی بستی کا چھوٹا سا مکان آسودگی کا مظہر تھا۔ نگہت کی بوڑھی ماں نہال ہوگئی تھی۔ ان کے بہن بھائی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ انہوں نے اسے کسی اپنے ہی کی مانند قبول کرلیا تھا۔ بڑی اپنائیت تھی ان سب کے انداز میں۔ منور کو یہاں بے حد سکون ملا۔ نگہت یکسر بدل گئی تھی۔ اب اس کے اندر ایک مشرقی لڑکی کی حیاء نظر آتی تھی۔ منور سے گفتگو کرتے وقت وہ نیچی نگاہ رکھتی تھی۔ کئی بار منور نے ان نیچی نگاہوں کو محسوس کیا تھا اور اسے نگہت کی یہ مشرقیت پسند آئی تھی۔ نگہت کے کسی بھی انداز سے کوئی ہلکا پن نمایاں نہیں تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد نگہت کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کچھ کرنا چاہیے۔ ورنہ جو کچھ ہے ختم ہوجائے گا اور اس کے بعد...... منور نے ایک دو بار یہ گفتگو سنی اور سوچ میں ڈوب گیا۔

بستی سے کچھ میل دور ایک تیل کا کارخانہ تھا۔ بستی کے بہت سے نوجوانوں کو وہاں سے روزگار مل چکا تھا۔ چنانچہ منور وہاں کوشش کرنے لگا...... اور چندروز کے بعد اسے کارخانے میں نوکری مل گئی۔ جس دن اسے نوکری ملی وہ خوشی سے کھل گیا اور پھر اس شام اس نے نگہت کی ماں سے' جسے اب وہ وہ خود بھی امی کہتا تھا۔ کہا:

"مجھے نوکری مل گئی ہے امی اب آپ لوگوں کو گھر کے بارے میں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کہاں نوکری مل گئی ہے؟"

"تیل صاف کرنے کے کارخانے میں۔ یہاں سے بہت سے لوگ جاتے ہیں۔ میں صبح کو جاؤں گا اور شام کو واپس آجایا کروں گا۔"

"خدا نے تمہیں اس محبت اور اپنائیت کا اجر دے گا بیٹے! لیکن...... اچھا نہیں لگے گا کہ تم محنت کرو اور ہم کھائیں۔ کیا اس کارخانے میں نگہت کے لیے کوئی جگہ نہیں نکل سکتی؟"

"میں موجود ہوں امی تو نگہت کو نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ فیروز بڑا ہو جائے گا تو ہم دونوں کمایا کریں گے۔" اس نے کہا اور اس کے ان الفاظ پر امی سسک سسک کر رو پڑیں۔ اس اپنائیت پر ان کا دل بھر آیا تھا۔

چنانچہ منور نوکری پر جانے لگا۔ اسے اس بستی میں تین ماہ ہو چکے تھے اور اب اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے زندگی کی آخری منزل مل گئی ہو۔ پھر ایک دن امی نے دبی زبان سے کہا۔

"جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں بیٹے وہ مجھے تمہاری نگاہوں میں رسوا کر سکتا ہے۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ ان الفاظ میں ایک ماں کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ نگہت جوان ہے اور میری آرزو ہے کہ وہ بھی...... وہ بھی زندگی کی اس منزل میں قدم رکھے جو ہر لڑکی کا حق ہوتی ہے۔ میری نگاہوں میں تم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ کیا تم نگہت کو اپنی ذات کے لیے منتخب کر سکتے ہو؟ کیا تم اس سے شادی کر سکتے ہو منور!"

منور دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا۔ اب سوچا اور محسوس کیا کہ اس کے زندگی کی راہ میں اگر نگہت شریک سفر ہو تو کیا حرج ہے۔ اس چھوٹے سے خاندان کے سوا اس دنیا میں اور کیا رہ گیا ہے؟ چنانچہ دوسرے دن اس نے امی کے سامنے اقرار کر لیا۔

"میرا آپ کے سوا اور کون ہے امی! میں ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔"

اس رات امی تمام رات شکرانے کے نفل پڑھتی رہی تھیں۔ نگہت کئی بار اس کے سامنے آئی اور منور نے اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ محسوس کئے۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے چپکی ہوئی تھی لیکن منور اس سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ خود اس کے دل کے ویرانے اب نگہت سے آباد ہو گئے تھے۔

امی ہلکے پھلکے انداز میں نگہت کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ سب ہی لوگ خوش تھے۔

ایک شام جب منور گھر میں داخل ہوا تو کوئی اس کے لیے چشم براہ نہیں تھا۔ ہاں برآمدے میں ننھے فیروز کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ آگے معصوم فرحت سر بریدہ موجود تھی اور اندر کمرے میں امی اور نگہت کی لاشیں موجود تھیں۔ منور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کمرے کے تاریک گوشوں سے پانچ آدمی باہر نکل آئے۔ سب سے آگے ایک لمبے بالوں والا جوان آدمی تھا۔ جس کی خونخوار آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"میرا نام کشنو ہے جوان! اور کشنو سے غداری کرنے والے کبھی نہیں جیتے۔ یہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کی تباہی بھی لے آئی۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں چھپ سکتی تھی؟"

کشنو نے حقارت سے نگہت کی لاش کی طرف دیکھا اور منور کی آنکھوں میں آگ جلنے لگی۔ اس کے اندر وحشت جاگ رہی تھی۔ اس کی سوئی ہوئی آگ کو کرید دیا گیا تھا۔

"مگر تو نے منگل سنگھ سے غداری کیوں کی؟ وہ تو تجھے بہت چاہتا ہے۔ پاگل ہو رہا ہے تیرے لیے۔ پرانی دوستی چھوڑ دی اس نے تیرے لیے اور مجھ سے دشمنی پر آمادہ ہو گیا۔ ایک مہینے کی آخری مہلت دی ہے اس نے مجھے کہ تجھے ڈھونڈ نکالوں۔ ورنہ...... خیر...... تو مل ہی گیا۔ میرے ساتھ چل منور! عورتوں کی تیرے لئے کیا کمی۔ لائن لگا دوں گا۔ چل میرے یار!...... ایک لونڈیا کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔"

"کشنو۔" منور کے منہ سے دہاڑ نکلی اور دوسرے لمحے اس نے کشنو کو اٹھا کر دیوار سے دے مارا۔ کشنو کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو منور اس کی طرف پھر لپکا۔ لیکن اسی وقت کشنو کے چاروں ساتھی اس پر ٹوٹ پڑے۔ منور وحشی ہو رہا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک کی گردن پکڑ لی اور اس وقت تک دباتا رہا جب تک اس کی آنکھیں اور زبان باہر نہ نکل آئیں۔ دوسرے تین آدمی اسے بری طرح مار رہے تھے لیکن وہ اپنے آدمی کو نہ بچا سکے اور جب وہ مر گیا تو منور دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا وحشی وجود اب کسی انسان کے بس کا نہیں تھا۔ کشنو اپنا سر پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی

طرف کھسک رہا تھا اور اس کے تینوں ساتھی زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ پھر ان میں ایک اور کم ہو گیا۔ منور نے پہلے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں اور پھر اس کے چاروں ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔ باقی دو بھاگ جانے کی فکر میں تھے لیکن منور نے انہیں نکلنے نہ دیا۔ اس نے دونوں کی گردنیں دبوچ لیں اور انہیں اس وقت تک دیوار سے مارتا رہا۔ جب تک ان کے بھیجے نہ نکل پڑے۔ تب وہ کشنو کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کشنو نکل چکا تھا۔

"خدا کی قسم کشنو میں تجھے زمین کی گہرائیوں میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" منور دروازے کی طرف لپکا لیکن کشنو کا اب وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔

"نہیں چھوڑوں گا کشنو! کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" منور کے حلق سے دہاڑیں نکل رہی تھیں۔ وہ دوبارہ اندر آ گیا اور اس نے نگہت کے لاش نزدیک بیٹھ کر اس کا سر اٹھایا اور گود میں رکھ لیا۔ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

کشنو کا گروہ معمولی نہیں تھا لیکن وہ اندھیرے کے اس تیر کو کس طرح روکتے جو رات کی تاریکیوں اور دن کے اجالوں میں نمودار ہوتا تھا اور قتل و غارت گری کر کے اس طرح نکل جاتا تھا جیسے صابن سے تار۔ گروہ میں ابتری پھیل گئی تھی۔ اب تک تیس آدمی ہلاک ہو چکے تھے۔ اور کشنو کے لوگ گروہ چھوڑ کر محفوظ مقامات پر بھاگ گئے تھے۔ خود کشنو کے حواس گم تھے۔ اس پر دوطرفہ مصیبت نازل ہوئی تھی۔ ایک طرف منگل سنگھ تھا دوسری طرف اس کی جان کا دشمن منور! منگل سنگھ سے اس کی جھڑپ بھی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ منگل سنگھ کسی طرح منور کو روکے ورنہ وہ پولیس سے مدد لے گا۔ بہرحال وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ اس کے سارے کاروبار بند پڑے تھے اور ایک عجیب سا ہراس پھیلا ہوا تھا۔ زندگی کشنو پر عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر پولیس کی پناہ میں پہنچ گیا۔ اس نے مناسب ردوبدل کر کے تمام الزامات منگل سنگھ پر ڈال کر پوری کہانی پولیس افسران کے گوش گزار کر دی۔ اعلیٰ افسران سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ اس سے کہا گیا کہ اس کی پوری حفاظت کی جائے گی بشرطیکہ وہ منگل سنگھ کو گرفتار کرا دے اور

کشنو نے پولیس کو منگل سنگھ کے اڈے کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اعلیٰ پیمانے پر پولیس کی کئی جماعتیں تیار ہو کر منگل سنگھ کو گرفتار کرنے چل پڑیں۔ اخبارات میں منور کی پوری کہانی چھپ رہی تھی اور جو اس کہانی کے کسی منظر سے وابستہ تھے، اسے پڑھ کر انگشت بدنداں تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو موت کے خونی ہاتھ اپنی گردن کے گرد محسوس کر رہے تھے اور اس خوف کا شکار ہو گئے تھے کہ اب جب منور اپنی پرانی زندگی میں واپس لوٹ گیا ہے تو کشنو کے بعد ان کی باری بھی آئے گی۔

منور کی گرفتاری کے لیے پولیس دن رات سرگرداں تھی لیکن ابھی تک نام ونشان نہ پا سکی تھی۔ ہاں اس دوران منور نے کشنو کے گروہ کے چند اور افراد کو قتل کر دیا تھا اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہا تھا۔ ان حالات سے کشنو بری طرح نروس ہو گیا۔ حالانکہ بذات خود وہ بھی دلیر انسان تھا لیکن منور کی درندگی سے وہ لرز گیا تھا اور پھر اس سے واسطہ بھی پڑ چکا تھا۔ سر میں بارہ ٹانکے لگے ہوئے تھے اور ابھی تک حالت درست نہیں ہوئی تھی۔ نجانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ پولیس اس کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔ اسے خود ہی اپنا بندوبست کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس شہر کی نواحی بستی میں وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اس گھر کے بارے میں صرف چند ہی لوگوں کو معلوم تھا اور کشنو کو یقین تھا کہ منور یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ یہاں آنے کی اطلاع بھی کسی کو نہیں تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کشنو کی پناہ گاہ کہاں پر ہے۔

پندرہ دن گزر گئے۔ کشنو کی حالت بہتر ہوتی گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چند ماہ گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالے گا۔ وہ اس پر عمل پیرا تھا لیکن سولہویں دن کی شام کے جھٹپٹے میں جب اس کی ماں بھگوان کے چرنوں میں بیٹھی پوجا کر رہی تھی اور وہ کھڑکی میں کھڑا آسمان پر چھانے والے اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اچانک عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ منور یہاں نہیں پہنچ سکتا، یہ صرف اس کا وہم ہے لیکن منور وہم نہیں حقیقت تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خون کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

"منور!" نجانے کس طرح اس کی آواز نکلی۔

میں نے قسم کھائی تھی کشنو کہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے مجھ سے جینے کا آخری سہارا بھی چھین لیا۔ میں نے کبھی برائی پسند نہیں کی تھی۔ میرا دل تو برائی کو قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ جو کچھ کیا دوسروں نے کیا۔ انسان اپنی مجبوریاں کہاں تک ٹالے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ سکتا کشنو!" منور نے اپنا لمبا چاقو کھول لیا اور کشنو کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی اور جب منور نے اسے نیچے گرایا تو وہ کسی بے جان پتلے کی طرح گر پڑا۔ اس کے اعضاء جواب دے گئے تھے لیکن اسی وقت عقب سے ایک بپھری ہوئی آواز سنائی دی۔

"ٹھہرو...... پاپی...... ٹھہرو...... خبردار چاقو اس کے بدن کو لگایا تو میں...... میں اپنی آنکھیں جلالوں گی۔ میں اپنی......" اور منور پلٹ پڑا۔ سفید دھوتی باندھے ایک معمر عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تھال تھا جس میں گھی کے چراغ جل رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" منور کی سرد غراہٹ ابھری۔

"ماں ہوں اس کی اور جب تک ماں زندہ ہے اس کا پوت نہیں مر سکتا، سمجھے۔ تم اسے نہیں مار سکتے۔ ارے پاپی۔ کسی ماں کے دل سے پوچھ۔ کسی ماں کی آنکھ سے دیکھ۔ وہ زمین پر گرا مجھے کیسا لگ رہا ہے۔ من چاہ رہا ہے کہ اپنے دانتوں سے تیرا کلیجہ چبا جاؤں۔ ہٹ جا چھوڑ دے کیا بگاڑا ہے اس نے تیرا؟"

"کاش...... کاش میری بھی کوئی ماں ہوتی۔ وہ تمہیں اس بات کا جواب دیتی کہ اس نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ کیا نہیں بگاڑا اس نے میرا۔ میری ساری کائنات چھین لی اس نے...... سب کچھ چھین لیا ہے مجھ سے۔"

"جس نے چھینا ہے تجھ سے تیرا سنسار تو بدلہ اس سے لے۔ میرا سنسار کیوں چھین رہا ہے تو؟ ماں کے سامنے بیٹے پر چاقو لیے کھڑا ہے۔ گھاؤ اسے نہیں لگے گا پاپی! گھاؤ تو مجھے لگے گا۔ مروں گی تو میں۔ اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہا ہے؟ یہ دیکھ میں تو اس کی آرتی اتارنے آئی تھی۔ ابھی بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کر میں نے اس کے جیون کی دعائیں مانگی ہیں۔ میری دعائیں پوری ہونے دے۔ اگر تو ہندو ہے تو بھگوان کے

لیے۔ مسلمان ہے تو خدا کے لیے اور اگر کچھ نہیں ہے تو اس کے لیے جسے تو نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا ہو۔ اور اگر کوئی ایسی ہستی بھی نہیں ہے تو اس ماں کے لیے جس کی انگلی پکڑ کر تو نے یہ سنسار دیکھا۔ مجھے میرے بیٹے کا جیون دے دے۔ اسے چھوڑ دے۔ چاقو بند کر لے اس کے پاس سے ہٹ جا...... ہٹ جا اس کے پاس سے نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔"

منور اس عورت کو دیکھتا رہا پھر اس نے کشنو کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز میں بولا۔ "ماں...... ماں کہاں ملتی ہے؟ اگر مل سکے تو مجھے بھی ایک ماں لا دو۔ میں نے ماں کی شکل آج پہلی بار دیکھی ہے۔ بڑی اچھی شکل ہے یہ۔ خدا کی قسم مجھے بڑی ہی پیاری لگی ہے۔ خدا نے مجھ سے میرا باپ بھی چھین لیا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ ہوتا لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کشنو تو مجھ سے برتر ہے کیونکہ تیری ماں موجود ہے اور اگر میں تجھے ماروں گا تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گی ماں...... ان چراغوں سے...... ہیں نا۔ یہ کیسی پیاری بات ہے۔ تو میرا کلیجہ ضرور چبا لے ماں۔ کیونکہ تیرے بیٹے کا کلیجہ چبانے کے لیے میری ماں نہیں ہے۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔" پھر وہ آہستہ آہستہ عورت کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں پیار تھا۔ "تیری آنکھیں ہمیشہ سلامت رہیں ماں! کون دیوانہ ماتا کے اس سمندر میں آگ لگائے گا، کس کا دل ہے اتنا بڑا!!" وہ اسے قریب سے دیکھنے لگا۔ "میں اسے نہیں ماروں گا۔ مار بھی نہیں سکتا کیونکہ تو اس کی محافظ ہے۔ اچھا ماں خدا کرے تیرا بیٹا ہمیشہ زندہ رہے میں تیری دعا میں شریک ہوں۔" وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

"یہ کون تھا کشنو، یہ کون تھا میرے بچے؟" عورت جلدی سے زمین پر گرے کشنو کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن کشنو کے ذہن و دل میں تو ایک طوفان برپا تھا۔ وہ آج ایک نئے حادثے سے دوچار ہوا تھا۔ کوئی جواب نہ دے سکا وہ اپنی ماں کو۔

❁ ‹‹‹ ❁ ‹‹‹ ❁

بڑی سحر انگیز کہانی تھی منور کی ۔ انسان کی عظمت کی کہانی تھی یہ۔ وہ برے جو تھوڑے سے فائدے کے لیے اپنی زندگی کے بہت بڑے نقصان سے دو چار ہو جاتے ہیں۔ مولوی قدرت علی اور اس کے بعد دوسرے لاتعداد کردار لیکن یہ حقیقت ہے کہ بڑائی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ منور نے آگے کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا۔

”اور اس کے بعد میں نجانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ تم یقین کرو دوست! اگر خود کشی حرام نہ ہوتی تو میں ضرور زندگی کھو دیتا۔ مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ طویل عرصے تک مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کے بعد نجانے کیوں دماغ میں یہ بات سمائی کہ ماحول بدل دیا جائے۔ حالات بدل لیے جائیں۔ کسی ایسی جگہ نکل جایا جائے جہاں ماضی کی کوئی یاد نہ پہنچ سکے۔ حالانکہ یادیں تو اپنے اندر بستی ہیں۔ بھلا یادوں سے کون پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ میں انہی یادوں کو لے کر اس جہاز سے سفر کر رہا تھا۔ زندگی نجانے کیوں یہاں تک لے آئی۔ برف کے ان خوفناک ویرانوں میں آ کر بھی میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ زندگی سے پنجہ کشی کی جائے۔ دیکھو تو سہی زندگی اور موت کی یہ محاذ آرائی کب تک جاری رہے گی؟ زندگی جب تک مجھے لیے لیے پھرے گی، میں زندہ رہوں گا اور موت جب بھی آئی، اسے خوشی سے گلے لگا لوں گا۔“

منور تو اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کہانی کی ترتیب کر لی تھی۔ صوفی عظمت اللہ سے واقعات کا آغاز ہوتا تھا جو اپنی بستی کے ایک نیک اور دیندار آدمی تھے، اور بات ختم ہوتی تھی یہاں تک۔ واقعی کہانیاں تو اپنی ترتیب الگ سے رکھتی ہیں لیکن کسی بھی کہانی کا اختتام انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی اور منور اب

اختتام کی تلاش میں تھا۔ اس دوران دوسرے بہت سے لوگوں سے بھی گہری شناسائیاں ہو چکی تھی۔ منور میرے خاصا قریب آ گیا تھا۔ ہمارا دوسرا اچھا دوست آئزر تھا۔ ایک دیسی عیسائی! جس نے اپنی زندگی کے بہت سے سال کچھ مہم جوؤں کی زندگی کے ساتھ گزارے تھے۔ ہم لوگ اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کو محفوظ کر کے ایک گوشے میں سمٹے ہوئے بیٹھے تھے کہ آئزر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دوستو! کیا داستان چل رہی ہے؟“

”کوئی داستان نہیں، برف کے ان ویرانوں میں بھلا کسی داستان کا آغاز کیسے ہو سکتا ہے؟“

”میں بہت دنوں سے ایک کھوج میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت جب ڈاکٹر حیات اپنی لیڈری چمکا رہا تھا اور لوگوں کو ایک انوکھی داستان سنا رہا تھا جس میں زندگی کا کہیں ذکر نہیں تھا، اس وقت بھی میں اس کی بیوقوفی سے متاثر نہیں تھا۔ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ برف سے میرا گہرا تعلق رہا ہے اور بعض علاقوں میں عظیم الشان برفانی راستوں سے گزرا ہوں۔ روس کا جما ہوا سمندر بھی میرے پیروں کے نیچے رہا ہے اور مجھے اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات حاصل ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم ان سارے گروہوں کو لے کر کسی لمبے سفر پر نہیں نکل سکتے لیکن میں اس برفانی دنیا میں اس جگہ منجمد ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اب کوئی تحریک شروع کی جائے۔ ہم کم از کم زندگی نہیں تو موت کی تلاش میں تو نکلیں گے۔ بتاؤ، زندگی کی تلاش تو سب ہی کرتے ہیں کیوں نہ موت تلاش کی جائے!“

”بات تو ٹھیک ہے۔ یہاں بھی ہم بیٹھ کر موت کا انتظار ہی تو کر رہے ہیں۔ اگر ہم زندگی کی تلاش کریں تو وہ بھی غلط تو نہیں ہوگا۔ یا یوں سمجھ لو کہ بقول آئزر کے کیوں نہ ہم موت کی تلاش میں نکلیں۔“

”تو پھر بہتر یہ ہے کہ صرف ہم تین آدمی اس سلسلے میں کوشش کرتے ہیں۔“

”کیوں منور کیا کہتے ہو؟“ جواب میں منور ہنس دیا پھر بولا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ بس اس کے یہ الفاظ کافی تھے۔ میں، آئزر اور منور

تینوں یہاں سے نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہر چند کہ بے شمار افراد یہاں موجود تھے لیکن ڈاکٹر حیات کی موت کے بعد وہ سب ایک دوسرے کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔ بلکہ اگر کوئی کسی طرح کی تجویز دینے کی کوشش کرتا تو دوسرے ایسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیا کرتے تھے اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھے۔ بہرحال ہم ڈاکٹر آئزر کے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ ہم سے کہے کہ ہم روانگی کے لیے تیار ہیں۔



سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ یہاں کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جہاز سے جو تھوڑا بہت سامان نکال کر اپنے اپنے قبضے میں کر لیا تھا، اس پر بھی کسی پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی اور آئزر نے انہی چیزوں سے اپنا کام چلایا تھا۔ جو چیز رسیوں کی شکل میں بٹ سکتی تھی اسے رسیوں کی شکل میں بٹ لیا گیا تھا۔ کچھ خاص قسم کے تھیلے بھی بنائے تھے جو جہاز کی سیٹوں کے پھٹے ہوئے کینوس کے تھے یا ایسے جو وہاں سے حاصل کر لیے گئے تھے۔ کچھ تھوڑے تھوڑے تختے جنہیں ان رسیوں کی مدد سے پیروں میں باندھ لیا گیا تھا۔ یہ تختے خوب چوڑے تھے اور پھسلنے میں مدد دے سکتے تھے۔ بہرحال ایک ایسی صبح جو سورج سے محروم تھی اور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، ہم لوگوں نے اپنے اس سفر کا آغاز کر دیا۔ میں، منور اور آئزر اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ برف پر پھسلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نو آبادی سے دور نکل آئے جو جہاز کے حادثے کی وجہ سے یہاں آباد ہو گئی تھی۔ دل میں بڑا دکھ تھا ان تمام لوگوں کو چھوڑتے ہوئے جن میں سے کوئی کسی کا شناسا نہیں تھا لیکن سب نے ایک ساتھ جہاز پر سفر کیا تھا اور جب مصیبت آئی تھی تو سب ایک دوسرے کے ہمدرد ہو گئے تھے اور پھر اس کے بعد جو زندگی یہاں گزری تھی۔ لگتا تھا کہ ایک طویل عرصہ یہاں گزر گیا ہے اور ہم لوگ صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ وہی خاص طرح کا انسانی تصور جو انسان کے دل میں رہتا ہے۔ برف سے مچھلیوں کا حصول بے چارہ ڈاکٹر حیات بتا گیا تھا اور ہم بھی چونکہ اس کام میں مصروف رہے تھے اس لیے مچھلیاں حاصل کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ ہم انہیں اپنے تھیلے میں محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ ہمارے دو دن تو

خیریت سے گزر گئے لیکن تیسرے دن برف کے ایک زبردست طوفان سے واسطہ پڑا جس سے آگے بڑھنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم لوگ گہری برف میں دھنس گئے۔ جب یہ طوفان تھما تو برف کے بڑے بڑے تودے ہمارے گرد پڑے ہوئے تھے۔ لکڑی کے وہ ٹکڑے جو ہم نے اپنی کہنیوں سے باندھ رکھے تھے، پھاوڑوں کا کام دینے لگے اور ہم نے شدید جسمانی محنت کر کے برف کو اپنے چاروں طرف سے ہٹایا اور دوبارہ سفر کرنے لگے۔ ہمارے راستے کی سب سے بڑی مصیبت وہ بڑے بڑے گڑھے تھے جن کے اوپر برف کائی کے مانند جمی رہتی تھی اور جونہی اس پر بوجھ پڑتا، یہ برف پھٹ جاتی اور انسان اس گڑھے میں گر کر ہمیشہ کی نیند سو جاتا۔ یہ جان لیوا برفانی گڑھے قدم قدم پر موجود تھے لیکن یہاں آئزر کی تجربے کاری کام آ رہی تھی اور نہ صرف وہ خود کو بلکہ ہمیں بھی ان سے بچاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تیسرے دن شام کے پانچ بجے کے قریب اچانک ہی سرد ہواؤں کا طوفان ہمارے اطراف میں پھیل گیا۔ سرد ہوائیں اتنی شدید تھیں کہ ہم نے اپنے جسم کے گرد جو چیتھڑے لپیٹ رکھے تھے وہ بالکل بے مقصد ہو گئے۔ ہم نے جس حد تک ہو سکتا تھا اپنے بدن کے سارے حصوں کو کس کر باندھ لیا تھا۔ بہرحال ان سرد ہواؤں نے ہمارے جسم کے خون کو جمانا شروع کر دیا۔ خاص طور پر یہ ہوائیں آنکھوں پر بہت برا اثر ڈال رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں کی بینائی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس حالت میں آئزر کی مہارت بھی کام نہیں آ رہی تھی۔ برفانی گڑھوں کو عبور کرنا ایک ناممکن عمل تھا۔ چنانچہ آگے کے سفر کا ارادہ ملتوی کر کے ہم نے ان تھیلوں میں گھس کر جان بچائی جو موٹے موٹے واٹر پروف کپڑے کے تھے۔ ہم جن علاقوں میں سفر کر رہے تھے وہ ایسے تھے جہاں انسان تو کیا، انسانی تصور نے بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ بہرحال ہم گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ آئزر نے اپنی ڈیوٹی سب سے آگے لگائی تھی اور وہ برفانی گڑھوں کا جائزہ لے لے کر ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک ماہر آدمی تھا اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ آئزر کے پیچھے پیچھے منور تھا اور سب سے پیچھے میں اپنی زندگی کا سب سے ہولناک سفر کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ کہانی لکھنا بے حد آسان ہے۔ ہولناک سے ہولناک منظر اپنے گھر کی میز پر بیٹھ کر لکھ دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس

کے ایک بٹا پانچ سے بھی واسطہ پڑ جائے تو زندگی کا مزہ آ جاتا ہے۔ بہر حال اس دن موسم خوشگوار اور صاف تھا اور ہم ایک کسی قدر نرم برفانی میدان میں پھیلتے جا رہے تھے۔ آئزر کے کہنے کے مطابق اس برفانی میدان میں برفانی گڑھوں کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم کسی حادثے اور رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے لیکن ہم نہیں جانتے تھے کہ ایک لرزہ خیز واقعہ ہمارا منتظر ہے اور بات وہی قدرت کی آ جاتی ہے۔ کہ قدرت جسے زندہ رکھنا چاہے یا جسے ختم کرے۔ ہماری ترتیب بدلتی رہتی تھی اور ہم لوگوں کے فاصلے ایک دوسرے سے اچھے خاصے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اتنے نہیں کہ ایک دوسرے کے اشارے یا آوازیں نہ سن سکیں۔ ہم آگے جا رہے تھے کہ اچانک ایک جگہ سے ایک پرشور آواز کے ساتھ برف پھٹی اور اس میں سے پانی نکلنے لگا۔ یہ یقیناً کوئی برفانی گڑھا تھا۔ اس وقت ترتیب یوں تھی کہ آئزر تو معمول کے مطابق سب سے آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے اور منور سب سے پیچھے۔ میں اور آئزر تو اس گڑھے سے آگے نکل چکے تھے لیکن منور ابھی پیچھے تھا۔ ہم نے پلٹ کر پرشور آواز کے ساتھ پھٹنے والی برف کو دیکھا تھا اور اسی وقت آئزر حلق پھاڑ کر چیخا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا تھا۔

''رک جاؤ، وہیں رک جاؤ۔'' اور فوراً ہی ہم لوگ مزید آگے بڑھ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے دیکھا کہ منور اس گڑھے میں گر کر غائب ہو گیا ہے۔ یہ وقت ایسا نازک اور خطرناک تھا کہ خود ہماری اپنی زندگیاں بھی شدید خطرے میں تھیں۔ برفانی گڑھا لمحہ بہ لمحہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس کے نیچے پانی کا دباؤ اور بڑھ جاتا اور جس مقام پر ہم کھڑے تھے وہاں بھی اچانک گڑھا نکل آتا۔ چنانچہ کوئی ترکیب نہیں تھی کہ ہم منور کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکتے اور خیریت بھی کیا تھی۔ ہمیں پتہ تھا کہ اس طرح سے پھٹ جانے والی برف کے نیچے کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک غم کے ساتھ ہم دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے پورے وجود لرز رہے تھے، اور خاص طور سے میں جو منور کی پوری کہانی سن چکا تھا اور اس کی کہانی کا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔ ہم واقعی موت کی تلاش میں نکلے تھے اور منور موت کو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ تو برفانی گڑھا اپنی جگہ رک گیا تھا۔ ہمارے

ضمیر ہمیں ملامت کر رہے تھے کہ ہم نے اپنے دوست کو اس حال میں چھوڑ کر جانا پسند کیا۔ آئزر ایک بہادر انسان تھا۔ اس نے کہا۔

''کیا کہتے ہو؟ ہم منور کا جائزہ لیں ہو سکتا ہے وہ زندہ بچ جائے۔''

''آؤ......'' میں نے پوری ہمت کے ساتھ کہا۔ واقعی اپنے آپ پر شرم آ رہی تھیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اگر منور مر گیا ہے تو ہم اسے بچا تو نہیں سکتے۔ لیکن ہم اس طرح اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تو اپنے ضمیر کی خلش کو کبھی نہ روک سکیں گے۔ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی رسیوں کا ایک سرا آئزر نے اپنی کمر میں اور دوسرا میری کمر میں باندھا اور پھر ہم دونوں زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل ایک ایک انچ رینگتے ہوئے، اس گڑھے کے کنارے تک پہنچے۔ یہ ایک انتہائی خوفناک کام تھا۔ ہم بالکل نہیں کہہ سکتے تھے کہ برف کی کائی کس جگہ اس قدر نرم ہو کہ ہمیں نگل لے لیکن ہم اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکے۔ آخر کار ہم اس گڑھے کے کنارے بالکل پہنچ گئے اور گڑھے میں نظر ڈال کر ہمارے سر چکرا گئے۔ یہ گڑھا ہمارے اندازے کے مطابق ڈیڑھ دو سو فٹ گہرا تھا اور اس کی تہہ میں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہاں ایک آدمی کیا اگر ایک ہزار آدمی بھی گرتے تو ان کا سراغ نہ ملتا۔ تاہم آئزر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا اور منور کو آوازیں دینے لگا۔ مگر یہ آوازیں برفانی گڑھے میں ایک بھیانک گونج پیدا کر کے گڑھے میں ہی گم ہو جاتیں۔ صرف ایک بار ایک چیخ کی سی شکل میں آواز سنائی دی تھی۔ ہم وہاں تین گھنٹے تک رکے رہے اور آخر کار مایوس ہو گئے۔ آئزر ایک دردمند اور اچھا انسان تھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ بہر حال اس کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم لوگ خود بھی زندہ رہیں گے یا نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نجانے کتنے دن اس طرح گزر گئے ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ہم کم از کم پندرہ دن تک چلتے رہے تھے۔ حالانکہ میں نے کبھی زندگی میں اس قسم کی مشقت کا کام نہیں کیا تھا۔ لیکن قدرت انسان کے جسم میں وہ تمام قوتیں بھر دیتی ہے جو اسے مشکلات سے گزار دیتی ہیں۔ منور بیچارہ زندگی کھو بیٹھا تھا اور میرے اپنے ایمان کے مطابق اس کی زندگی بس یہیں تک تھی۔ غرض یہ کہ ہم دونوں سفر کرتے رہے پھر آئزر کی ہمت بھی جواب دینے لگی۔ وہ خاصا ہٹا کٹا اور ورزشی جسم کا

مالک تھا لیکن ناقابل برداشت سردی، بھوک، ٹھنڈک اور تھکن اس پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ اس کے سینے میں درد اٹھا تھا اور آخر کار اس نے سسک سسک کر ایک دن جان دے دی۔ اب میں اس ہیبت ناک دنیا میں تنہا رہ گیا جہاں ہولناک سناٹوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نگاہوں کی آخری حد تک برف ہی برف دکھائی دیتی تھی۔ میری حیثیت ایک حقیر اور ذلیل کیڑے کی تھی۔ آئزر کی موت کو بھی کافی دن گزر گئے لیکن میں مسلسل سفر کر رہا تھا۔ نجانے یہ سفر کب تک جاری رہے گا۔ مجھے لگتا تھا کہ زندگی بس اسی طرح ختم ہو جائے گی۔ پھر ایک دن میرے پیروں میں بھی شدید درد ہونے لگا اور اس طرح میں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں سے اپنے جوتے اتارے اور یہ دیکھ کر میری روح سمٹ کر کلیجے میں آ گئی کہ جوتوں کے ساتھ ہی دونوں ایڑیوں کی گلی ہوئی کھال بھی میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ ایک لمحے تک میں پتھر کے بت کی مانند ان ایڑیوں کو تکتا رہا اور سوچنے لگا کہ اب کیا مجھے آگے کا سفر کرنا چاہیے۔ بہرحال زندگی بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے میں نے وہ دھجیاں ایک بار پھر اپنے پیروں پر باندھیں جن پر نئی کھال آ رہی تھی۔ پھر جوتے اور مضبوطی سے باندھے اور پھر گرتا پڑتا اپنی نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا۔ موت میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ تھکن اور بھوک سے نڈھال ہو کر میں ستانے کے لیے ہر آدھے گھنٹے کے بعد برف پر لیٹ جاتا اور کوئی نادیدہ قوت مجھے آگے بڑھنے پر اکساتی۔ بہرحال پھر اس دن زندگی ایک عجیب و غریب کیفیت سے دو چار ہوئی۔ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ برف کی زمین پھٹی اور میں گہری تاریکی میں گرتا چلا گیا۔ پھر ایک جھٹکا سا لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی گڑھے میں لٹک گیا ہوں۔ یہ حادثہ اتنی برق رفتاری سے پیش آیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے میرے سارے حواس جواب دے گئے تھے۔ پھر جب ہوش و حواس کسی حد تک درست ہوئے تو میں نے اپنے اندر کے انسان کو تلاش کیا اور مجھے پتہ چلا کہ یہ شخص ہر قیمت پر جینا چاہتا ہے۔ میں جینے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ پھر میں نے یہ غور کیا کہ میں گڑھے میں کیسے لٹکا ہوا ہوں تو اندازہ ہوا کہ میری کمر کے گرد بندھے ہوئے رسے کے ساتھ ساتھ ایک تختہ بھی تھا جو اس گڑھے میں پھنس گیا تھا۔ اس شدت کی سردی میں موت کی دہشت سے میرے چہرے کا

کھلا ہوا حصہ پسینے سے تر تھا۔ میں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ رسے کی لمبائی چودہ فٹ کے قریب تھی، اس لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ گڑھا جس میں، میں لٹکا ہوا ہوں، چودہ فٹ کی گہرائی میں ہے۔ اس قسم کے نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی ہمت کرنی تھی۔ میں آسانی سے جان دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک ایک انچ کر کے میں اس رسے کے اوپر چڑھنے لگا اور آخر کار گڑھے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ میرا سانس پھول رہا تھا اور جسم کے روئیں روئیں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال میں گڑھے کے کنارے پہنچنے کے بعد اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور اس کے بعد شاید قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ میں اوپر پہنچنے کے بعد چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ میری آنکھوں کی دھندلاہٹوں میں کوئی چیز متحرک نظر آئی اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ برفانی تودے تھے جن کے درمیان مجھے برف پر پھسلنے والی روائتی کتا گاڑی نظر آ رہی تھی۔ کتا گاڑی میں چند افراد موجود تھے جنہیں میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے جسم کی پوری قوت صرف کر کے اپنے ہاتھ ہلائے اور زور سے چیخا اور اچانک کتا گاڑی کا رخ میری طرف ہو گیا۔ کیا ہی عجیب و غریب چیز ہوتا ہے یہ انسان بھی! مجھے جب یہ احساس ہوا کہ مجھے دیکھ لیا گیا ہے' تو اچانک ہی مجھے زور کا چکر آیا اور اس کے بعد میں وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔



دو افراد کی زندگیاں میرے سامنے ختم ہو گئیں تھیں۔ اصولی طور پر تو اس ہولناک ویرانے میں اس حادثے کے بعد میرے اندر بھی زندگی کی رمق نہیں رہنی چاہیے تھی لیکن بہر حال یہ کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے کیونکہ زندگی لینا اور دینا قدرت کا معاملہ ہے اور بھلا قدرت کے معاملات میں مداخلت کیسے کی جا سکتی ہے۔ میں ہوش میں آ گیا اور جب زندگی کا یقین ہوا اور سانسوں کی آمد و رفت کا احساس ہوا تو جو سب سے پہلی چیز مجھے اپنی ذات پر مسلط نظر آئی، وہ ایک عجیب سی چیز تھی۔ میں نے اسے اپنی مٹھیوں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ تو مٹی کے سے کچھ ٹکڑے ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن چہرے پر بھی کچھ تھا۔ ایک عجیب سی مٹی جیسے کسی دلدل کی مٹی انسانی جسم پر خشک ہو گئی ہو۔ چہرے پر ہاتھ پہنچانے کے لئے نجانے مجھے کیا کیا اپنے اوپر سے ہٹانا پڑا۔ میں نے اپنے چہرے پر سے بھی مٹی ہٹائی، آنکھوں کو کھولا اور آنکھوں کو کھول کر میں نے گہرے کالے رنگ کی مٹی کو اپنے پورے جسم پر پایا۔ میرا سارا جسم اس مٹی سے چھپا ہوا تھا۔ باہر کا ماحول میری نگاہوں میں واضح ہو گیا۔ روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اوپر لکڑی کے کنڈوں کی چھت تھی جس میں نجانے کیا کیا چیزیں لٹکی ہوئی تھیں۔ سب کی سب عجیب۔ چھت کے قریب ایک گول ڈھکن سا تھا جسے اوپر سے اٹھایا جا سکتا تھا۔ بہر حال بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایسی عجیب و غریب جگہ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ جگہ کافی کشادہ تھی اور اس میں گھاس پھوس کے ڈھیر زیادہ نظر آ رہے تھے لیکن ماحول کافی گرم تھا۔ آگ جلانے کے لیے خاص قسم کے آتش دان بنے ہوئے تھے۔ جن سے آگ زیادہ پھیلنے کا خطرہ نہیں رہتا تھا۔ ان میں چمنیاں بھی تھیں جو اوپر چھت میں جا

کر گم ہو جاتی تھیں۔ چھت بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس کی بلندی آٹھ فٹ ہو گی۔ گول سوراخ کے نیچے دو سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور یہ گول سوراخ دروازے کی جگہ استعمال کیا جاتا رہا ہو گا۔ گزرے ہوئے واقعات ذہن میں آئے تو میرے دل و دماغ کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ایک پر اسرار اور ہولناک کہانی' ایک انوکھا ایڈونچر زندگی سے منسلک ہوا تھا۔ درحقیقت اگر کبھی زندگی کی کہانی لکھنے کا موقع ملے تو یہ بھی ایک دلکش کہانی ہو گی۔ بہر حال میں نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور اپنے بدن سے اس مٹی کو ہٹانے لگا۔ عجیب و غریب اور گھناؤنی چیز تھی یہ۔ اس سے ہلکی ہلکی بدبو بھی اٹھ رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا۔ یہ بات تو واضح تھی کہ اس جگہ انسان ہی رہتے ہوں گے اور برف کے اس ویرانے میں سے مجھے انسان ہی اٹھا کر لائے ہوں گے لیکن یہ مقام کون سا ہے۔ بہر حال میں نے اپنے بدن کو کافی حد تک صاف کر لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم کافی ہلکا اور گرم ہو۔ ہلکی ہلکی درد اب بھی میرے جسم میں موجود تھی، خاص طور سے پیروں میں جن کی ایڑیاں گل گئیں تھیں۔ اچانک ہی وہ ڈھکن اوپر کی جانب کھلا اور اس میں سے ایک ایک کر کے دو آدمی ٹپک پڑے۔ میں نے کسی قدر سہمی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ موٹی موٹی کھالوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ یہ کھالیں غالباً ریچھ کی تھیں۔ ان کے پیروں پر چمڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہی پٹیاں ان کے پورے جسم کو ڈھکے ہوئے تھیں۔ سر پر بہت ہی مختلف انداز کی ٹوپی تھی۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے مخصوص قسم کے ڈنڈے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان کے کھلے ہوئے چہرے گہرے سرخ تھے۔ بالکل خون کے رنگ کے۔ میرے ذہن میں اب بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کے باشندے ہیں۔ پھر ان دونوں نے مجھے دیکھا اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ مگر وہ باتیں میرے لیے ناقابل فہم تھیں۔ آخر کار ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس کی گہری براؤن آنکھوں میں مجھے ہمدردی اور محبت کے آثار نظر آئے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے لگے کہ میں نے ان کی بات سمجھی ہے یا نہیں پھر انہیں یہ احساس ہو گیا کہ میں ان کی زبان سے ناواقف ہوں تو ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور دونوں آگے

بڑھ آئے۔ انہوں نے بڑی نرمی سے میرے بازوؤں پر ہاتھ رکھے اور مجھے لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور دیوار پر لٹکی ہوئی ایک موٹی سی کھال اتار کر لے آیا۔ اس کھال کو چمڑے ہی کی پٹیوں سے سیا بھی گیا تھا اور وہ ایک بے ڈھنگے کوٹ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اس کھال سے ڈھک دیا اور اس کے بعد میرے پیروں پر بھی ویسی پٹیاں باندھنے لگے۔ بڑی تقویت ہوئی تھی ان چیزوں سے اور یوں لگا تھا جیسے جسم میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ پھر ان میں سے ایک سوکھے ہوئے چمڑے کا ایک برتن لے آیا اور اس میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک گاڑھی اور سرخ چیز میرے ہاتھوں اور چہرے پر ملنا شروع کر دی۔ اس میں غالباً کسی تیل کی آمیزش بھی تھی۔ میں نے خاموشی سے یہ تمام کام کرائے۔ اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ میرے لیے کوئی برا احساس نہیں رکھتے اور انہوں نے میری جان بچائی ہے۔ یہ اندازہ ہونے کے بعد ظاہر ہے ان سے ہر قسم کا تعاون میرے لیے ضروری تھا۔ اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ دونوں ہی اس سیڑھی پر چڑھ کر باہر نکل گئے اور میں انہیں دیکھتا رہا۔ سوراخ پھر بند ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یاالٰہی یہ قصہ کیا ہے۔ کیا ہے یہ سب کچھ' یہ لوگ کون ہیں؟ منور اور آئزر میرے سامنے زندگی سے محروم ہو چکے تھے اور میں نجانے کون سی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ اپنے تمام تر حواس جمع کر کے میں نے سوچا کہ یہ سب کچھ کیا ہو سکتا ہے۔ ایک ادیب بے شمار کہانیاں لکھتا ہے۔ نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ یہ سب دماغی اختراع ہوتی ہے۔ حقیقتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تو بہت دیر تک ذہن میں ہی نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماضی کا ایک ایک نقش ذہن میں ابھر رہا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات کی ایک فلم تھی جو دماغ کے پروجیکٹر پر چل رہی تھی۔ زندگی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ تباہ ہونے والے جہاز کے مسافر نجانے اب کیسی کیسی کہانیوں کی ترتیب کریں گے۔ یقینی طور پر کچھ وقت کے بعد وہ بھی اس برف کے جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے' اور زندگی اور موت کے کھیل میں شریک ہو جائیں گے یہ کھیل تو ازل سے ہوتا چلا آیا ہے اور اب تک جاری رہے گا۔ لیکن کبھی کبھی یہ کھیل کتنا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

احساسات کا لامتناہی سمندر میرے ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سوچ کے جزیرے میں چاروں طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ میں خاموش پڑا الجھتا رہا اور جب وحشت حد سے بڑھ گئی تو میں نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے جو لباس دیا گیا تھا اس سے میرے جسم میں اچھی خاصی گرمی پیدا ہو گئی تھی اور میں اب بڑی بہتر کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں صحیح طور پر اندازہ ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔ نجانے کیوں ایک عجیب سا احساس دل میں جنم لے رہا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ روشنی آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔ گویا شام جھک آئی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد رات ہو جائے گی۔ خدایا میرے حواس چھین لے۔ میں اس وقت تک بے ہوش پڑا رہوں جب تک حقیقتیں مجھ پر عیاں نہ ہو جائیں۔ بہرحال پھر ماحول بالکل تاریک ہو گیا۔ سردی کے بارے میں مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ بہت شدید ہے اور اگر یہ لباس میرے جسم پر نہ ہو تو ایک لمحے سکون نہ آئے۔ تاریک رات میں میری وحشت اور ابھر آئی۔ پتہ نہیں کون کون کن حالات سے گزرا ہو۔ رات بالکل خاموش اور سنسان تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میرے حواس جاگ رہے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کے بارے میں سوچا جو مجھے چھوڑنے کے بعد یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب ان کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ چہرہ کچھ اجنبی اجنبی سا ہے۔ برف جیسی سفید رنگت کے مالک یہ لوگ جن کے رخسار اور ہونٹ بے پناہ سرخ تھے۔ ناک کا اوپری سرا بھی بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھا۔ یہ کون سی نسل کے باشندے ہو سکتے ہیں۔ پتہ نہیں برف کے ان ویرانوں سے گزر کر میں کہاں پہنچا ہوں اور کن لوگوں کے درمیان ہوں۔ ان کی زبانیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اگر وہ ہر طرح سے اجنبی لوگ ہوئے تو اس کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے لیے نقصان کا باعث بن جائیں۔ میری اپنی ہی بے شمار کہانیاں جن کا مجھے عملی طور پر کوئی تجربہ نہ تھا، میرے ذہن آ گئیں اور خوف کی لہریں میرے بدن میں سرائیت کرنے لگیں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی اس احساس کو جھٹک دیا۔ زندگی یوں بھی کون سی ایسی دلکش تھی کہ اب اس خوف کو اور ذہن پر مسلط کر لیا جائے۔ البتہ ایک عجیب سی بے چینی، ایک عجیب سا احساس ساری رات میرے ذہن پر مسلط رہا اور پھر شاید نیند کو

مجھ پر رحم آ گیا۔ نیند میری آنکھوں میں آئی تو اس نے مجھے دنیا کی ہر مشکل سے بے خبر کر دیا۔ لیکن انوکھی نیند تھی یہ۔ شاید بہت ہی طویل یا پھر شاید ان دنوں میرے احساسات بہت دور چلے گئے تھے اور میں کوئی صحیح بات نہیں سوچ سکتا تھا۔ جاگنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں طویل عرصے تک سوتا رہا ہوں لیکن سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس نیند کا عالم اتنا گہرا تھا کہ میں اس تبدیلی کا اندازہ بھی نہیں کر سکا جو ماحول میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت میں جاگا تو اس پر اسرار جھونپڑی میں نہیں تھا بلکہ جس جگہ تھا وہ کوئی پہاڑی غار ہی معلوم ہو رہی تھی۔ کافی دور غار کی چھت نظر آ رہی تھی جو ناہموار اور ناتراشیدہ تھی۔ یقیناً یہ قدرتی غار انسانی ہاتھوں کا کارنامہ نہیں تھا۔ بدن کے نیچے نرم گھاس بچھی ہوئی تھی اور یہ گھاس میری انگلیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ تب میں نے گردن ہلائی۔ جس طرف میں نے رخ بدل کر دیکھا تھا وہاں پتھروں کی چٹانوں کو چوکور تراشا گیا تھا اور ان تراشی ہوئی چٹانوں پر عجیب وغریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان عجیب وغریب چیزوں میں انسانی کھوپڑیاں، جانوروں کے ڈھانچے اور عجیب وغریب، سیاہ وسفید رنگوں کے پتھر بھی موجود تھے۔ بہر حال یہ سب بہت کچھ عجیب تھا۔ میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا تو میری نگاہ کچھ افراد پر پڑی جو خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹھنے کا انداز بھی بڑا عجیب تھا اور ایک انتہائی پر اسرار اور خوفناک ماحول مجھے نظر آ رہا تھا۔ بہت دیر تک میں خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا پھر انہیں آواز دی۔

''سنو، میری بات سنو۔'' وہ لوگ چونک پڑے انہوں نے میری طرف دیکھا پھر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بھی اسی نسل کے لوگ ہیں لیکن ان سے ذرا مختلف! وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا۔

''تم کون ہو اور میں کہاں ہوں؟ تھوڑی دیر پہلے میں جس جگہ تھا میں وہاں سے کیسے آ گیا؟'' لیکن ان میں سے کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے مایوسی سے گردن ہلا دی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ بھی میری زبان سے ناواقف ہیں۔ پھر ان میں سے ایک شخص نیچے جھکا اور میرے چہرے کے نزدیک اپنا چہرہ لا کر اشارے سے

میرے بدن کے بارے میں پوچھا۔ چند لمحات تک تو میں اس اشارے کو نہ سمجھ سکا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ میری خیریت معلوم کر رہے ہیں تو میں نے گردن ہلا دی اور اس شخص کے چہرے پر بھی اطمینان کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے میرے پیٹ پر ہاتھ مار کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے میری بھوک اور پیاس کے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تو واقعی شدید بھوکا ہوں۔ ان لوگوں نے میرے لیے باقی تمام انتظامات تو کیے تھے لیکن مجھے کچھ کھلایا، پلایا نہیں تھا۔ نجانے کیوں؟ البتہ جب میں نے ان سے اس بات کا اظہار کیا کہ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے تو اس شخص کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے اور وہ تیزی سے اس طرف بڑھا جہاں ہڈیاں اور کھوپڑیاں چنی ہوئی تھیں۔ باقی لوگ میرے سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ہڈیوں کی طرف بڑھنے والے نے ایک پیالہ نما چیز نکالی اور پھر مجھے ان ہڈیوں کا مصرف معلوم ہوا۔ نجانے کون کون سے جانوروں کی ہڈیاں تھیں لیکن انہیں شیشیوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا اور ان میں سیال بھرے ہوئے تھے۔ بوڑھا شخص شیشیوں میں سے مختلف سیال نکال کر اس پیالے میں ڈالنے لگا اور پھر پیالہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میرے نزدیک آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور اس کے ساتھی نے میری دونوں آنکھوں پر انگلیاں رکھ دیں۔ گویا وہ مجھ سے آنکھیں بند کرنے کیلئے کہہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھوں سے میرا منہ کھولا اور اس کا اشارہ سمجھ کر میں نے خود ہی اپنا منہ کھول دیا۔ جو شے میرے حلق میں گئی۔ وہ بدمزہ تو نہیں تھی لیکن اسکے ذائقے میں ایک کھٹی سی ناگوار کیفیت تھی۔ بہر حال وہ عجیب شے پی کر ایسا لگا جیسے میں نے آب حیات پی لیا ہو۔ چند گھونٹ پینے کے بعد ہی پیالہ خالی ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اسکے بعد اس نے میری آنکھوں پر سے انگلیاں ہٹا دیں۔ پھر انہوں نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا لیکن میں اپنے بدن کی تکلیف اچانک ہی ختم ہو جانے پر شدید حیران ہو گیا تھا۔ واقعی یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے زندگی کا رس پلا دیا گیا ہو۔ میں ان لوگوں کے درمیان تماشا بنا رہا۔ لیکن مسئلہ یہی تھا کہ ان کی زبان میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تک میرے ساتھ رہے اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ وہاں سے چلے گئے

تھے۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک شخص غار کے دہانے سے اندر داخل ہوا۔ اس کا جسم کپڑے کی رنگین پٹیوں اور موتیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک لوہے کی چھڑی تھی۔ عجیب وغریب حالت کا مالک نظر آ رہا تھا یہ شخص اور اس کی آنکھوں ایک عجیب سی تیز چمک تھی جو ناقابل فہم تھی۔ اس کے پیچھے ہی وہ تمام لوگ ادب سے گردن جھکائے نظر آ رہے تھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان کیلئے کوئی بہت ہی بڑی شخصیت ہے۔ آنے والوں میں سے دو آدمی لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹول لے کر آئے تھے۔ اسٹول بھی عجیب سا ہی تھا۔ سفید رنگ کی لکڑی جو قدرتی سفید رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اس کے اوپری حصے کو گول کاٹا ہوا تھا اور نیچے اس میں تین لکڑیاں لگا دی گئیں تھیں۔ انہوں نے وہ اسٹول سامنے رکھا اور بوڑھا شخص اس پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کی نگاہوں سے شعاعیں سے اٹھ رہی ہوں اور پھر میرے کانوں میں اس شخص کی آواز ابھری۔ ایک بوڑھی آواز جو لرزتی ہوئی تھی لیکن اس میں ایک عجیب سا رعب تھا۔ میں تعجب سے اچھل پڑا جب مجھے یہ آواز اپنی زبان میں سنائی دی۔ اس نے سوال کیا۔

''کون ہو تم؟'' میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ ہماری زبان سے واقف ہے یا صرف یہ میرا واہمہ ہے۔ لیکن جب دوسری بار یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے تو مجھے اپنا یہ خیال ترک کرنا پڑا کہ یہ کوئی وہم ہے۔ بوڑھا کسی پراسرار ذریعے سے میری زبان بول رہا تھا۔

''انسان ہوں لیکن تمہاری دنیا کا نہیں۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ ایک حادثے کا شکار ہو کر۔''

''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ کون سی دنیا ہے وہ؟''

''ہو سکتا ہے تم اس دنیا سے واقف نہ ہو۔ بہت دور، برفانی میدانوں کے اس پار، اس سے بھی کہیں آگے۔''

جواب میں بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ بھی وہی دنیا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو کسی اور سیارے پر محسوس کر رہے ہو؟''

بوڑھے کے ان الفاظ پر مجھے بھی بڑی ہنسی آئی اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ میں اسے

بالکل غیر مہذب اور انوکھی دنیا کا انسان سمجھ رہا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہماری دنیا کے بارے میں اور سیاروں کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے معاف کرنا۔ اصل میں جن حالات سے میں گزرا ہوں، ان سے میری دماغی کیفیت بھی درست نہیں رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب شخصیت محسوس کر رہا ہوں اور پھر یہاں جس عالم میں، میں نے آنکھ کھولی ہے۔ وہ بھی میرے لیے بڑا تعجب خیز رہا ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ناصر شاہ۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا نام شی وش ہے۔ شی وش! اور یہاں کے لوگ مجھے اپنا روحانی رہنما مانتے ہیں۔ ویسے میں تمہاری اس مہذب دنیا میں بارہ سال رہ چکا ہوں۔ اس کے پس منظر میں جو کہانی ہے وہ یوں سمجھ لو کہ ایک پراسرار امانت ہے جو کسی کو اس راز سے آگاہ کرنے سے روکتی ہے۔ مطلب یہی ہے میرا کہ تمہاری زبان اور تمہارے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں بلکہ یوں کہو کہ تمہاری دنیا کی بے شمار زبانیں میں بول سکتا ہوں جو علاقائی طور پر بولی جاتی ہیں لیکن ان کا اظہار میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''معزز رہنما! مجھے تمہاری باتیں سن کر بے پناہ خوشی ہوئی ہے کیونکہ میں نے اب تک جن چند افراد سے رابطہ کیا ہے ان کے بارے میں مجھے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ وہ ہماری زبان نہیں جانتے۔ یہ تو ایک بڑی ہی اچھی بات ہے کہ میری ملاقات تم سے ہو گئی۔ معزز شی وش، کیا میں تمہاری اس دنیا کے بارے میں معلوم کر سکتا ہوں؟''

''دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سی آبادیاں ہیں۔ انہی میں سائبیریا کی آبادی بھی ہے جو برفانی آبادی کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسکیمو لینڈ بھی ایک جگہ ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اگر تمہیں اسکیمو لینڈ کی زندگی کا کچھ علم ہے تو تم یہ بات جانتے ہو گے کہ برف میں موجود آبادیاں زمین کے نیچے میرا مطلب ہے برفانی میدانوں کے نیچے ایگلو بنا کر رہتی ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ دنیا کے بے شمار حصے ایسے ہیں جن کے بارے میں ابھی تک انسان کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہماری یہ سرزمین جسے ہم ذی آنا کا نام دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک حصہ ہے۔ یعنی برفانی علاقوں میں یہ زمین ہے اور ہم ذی آنا کے

باشندے ان ایگلوؤں میں رہتے ہیں۔ لیکن سائبیریا اور دوسرے اسکیمولینڈ وغیرہ کے علاقے کے برفانی لوگ صرف اپنی رہائش گاہوں کے لیے ایگلو بناتے ہیں جبکہ ہم نے اپنی سرزمین ذی آنا میں دور دور تک پہاڑیاں کاٹ کر یا پھر ایسے قدرتی ذرائع سے پیدا ہو جانے والے غاروں اور وسیع وعریض پہاڑی میدانوں کو اپنی زندگی کا مرکز بنایا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہماری چھت برفانی میدان ہیں اور ہم اس چھت کے نیچے یہ نئی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں جو ذی آنا کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہم نے یہاں ایسے درخت اور پودے لگائے ہیں جو ہوا اور سورج کی گرمی کے بغیر پھلتے پھولتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ یہ اجنبی دنیا ہم نے اپنی انتہائی کوشش سے باہر کے لوگوں سے محفوظ رکھی ہے اور اس طرح برف کے ان ویرانوں میں ہماری زندگی پھیلی ہوئی ہے لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ تمہاری دنیا کے لوگ یہاں تک نہیں آپاتے۔ ہاں، ہم وحشی جانور بھی نہیں ہیں کہ اگر بھولے بھٹکے لوگ ادھر آ بھی جائیں تو ہم انہیں یہاں سے مار بھگائیں یا بلاوجہ ان کے دشمن بن جائیں۔ بے شک اگر یہاں کوئی گروہ آ جائے یا چند افراد آ جائیں۔ تو ہم انہیں ہر طرح کی امداد دے کر ان کی اپنی دنیا میں روانہ کر دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو پھر تم خود سوچو کہ انسانی عمل کیا ہوتا ہے۔ برائی کے جواب میں برائی تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے اور ہم مکمل طور پر انسان ہی ہیں۔“

”بزرگ شی وش! تم لوگوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں کہ میں صرف ایک ادیب ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں اور زندگی گزارتا ہوں۔ نہ میرے اندر انسانوں سے دشمنی ہے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ میرا وہ جہاز جس میں، میں سفر کر رہا تھا۔ تباہ ہو کر برف کے ویرانوں میں گر پڑا اور اس کے بعد ہمارے لیے زندگی محدود ہو گئی۔ بے شمار افراد ان ویرانوں میں بھٹک رہے ہیں۔ میں نجانے کن کٹھنائیوں سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں اور اس وقت جب میں بے ہوش ہو کر گر چکا تھا اچانک ہی مجھے تم لوگوں کی امداد حاصل ہوئی۔ میں زندگی سے محروم ہو جاتا لیکن یقین کرو مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں جس مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اس کے عقائد یوں ہیں کہ ہم آخر کار زندگی سے رشتہ کاٹ کر موت کی

آغوش میں جا سوئیں گے اور ہمارے لیے اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اگر زندگی ہے تو پھر مختلف طریقوں سے ہم زندہ رہیں گے جیسے اب۔“

شی وش پھر ہنس پڑا اس نے کہا۔ ”تم بڑی دلچسپ باتیں کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا ہم ان تصورات اور خیالات سے دور ہیں؟ نہیں میرے دوست! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بھی مذہب ہے۔ دیوی دیوتا ہیں۔ زندگی اور موت کا تصور ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ تم ہمیں اجنبی دنیا کا اجنبی انسان نہ سمجھو۔ ہم سب جانے پہچانے لوگ ہیں۔ بہرحال میں تمہیں اپنی اس دنیا میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ تمہاری حالت بہتر ہو جائے اور تم یہاں سے جانا چاہو تو ہم تمہاری واپسی کے لیے تمہاری مدد کریں گے لیکن ہم تمہیں یہ بتا دیں کہ بہت سے ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں جن سے ہمیں شدید نقصان پہنچا ہے اور یہ نقصان پہنچانے والے باہر کی دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔ انسانی رشتوں کا قانون ہم بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن اگر کوئی ہمیں نقصان پہنچائے تو تم خود بتاؤ۔ انسان انسان ہی ہوتا ہے، فرشتہ نہیں۔“

”میں......اس طرح کا انسان نہیں ہوں اور یہ بات تم لوگ خود اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خود تمہارے علاقے تک نہیں آیا ہوں۔ بلکہ میرے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا اور تم خود مجھے یہاں تک لائے ہو۔“

”ہاں۔ لیکن ہم نے تمہارے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ تم شدید سردی کے شکار تھے۔ ہم نے تمہارے جسم پر وہ جڑی بوٹیاں منجمد کر دیں جو تمہارے بدن سے سردی کے شدید اثرات نکال دیں۔ ہم نے تمہارے چہرے اور جسم کے کھلے ہوئے حصے پر اپنے کتوں کو ذبح کر کے ان کا خون ملا تاکہ تمہارے چہرے کی کھال گل نہ جائے۔“

”تم نے یہ احسان کیا ہے مجھ پر اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔“

بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی پھر اس نے کہا۔ ”پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تم سے اپنے اس احسان کا صلہ قبول کر لیں۔ خیر جب تک تم ہمارے خلاف کوئی ایسا عمل نہیں کرتے جو ہمیں تکلیف پہنچائے، اپنے آپ کو ہمارا دوست سمجھو۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

"بہت بہت شکریہ! میں تمہارے لیے کسی بھی طور نقصان دہ نہیں بنوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اب باقی تمام لوگ بھی تم سے دوستوں کی طرح ملیں گے۔ جہاں تک ہماری زبان کا تعلق ہے تو تھوڑا سا انتظار کرو۔ ہمارے پاس ایسے ذرائع ہیں جن سے تم ہماری زبان سے بھی آشنا ہو جاؤ گے۔ اب مجھے اجازت دو۔ تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر جا رہا ہوں۔ دوست ہو، دوستی کا ثبوت دینا اور کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو ہمارے لیے الجھن کا باعث ہو اور اس کے بعد تمہارے لیے۔" بوڑھے کے الفاظ میں ڈھکی چھپی دھمکی بھی تھی۔ لیکن وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میں اسے دل سے تسلیم کرتا تھا۔ ظاہر ہے اگر کسی کو نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہیں نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچے گا اور اس بات کے بارے میں وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ بہرحال خاصا عجیب وغریب ماحول تھا یہ۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے ان ہولناک کیفیتوں سے نجات مل گئی تھی۔ برف کے اس سرد جہنم میں جہاز کے حادثے سے شکار ہونے والے بے شمار لوگ موجود تھے لیکن ظاہر ہے ہم سب مسافر تھے۔ ہماری شناسائیاں پہلے سے تو نہیں تھیں اور جتنی شناسائیاں ہو گئی تھیں، وہ بھی ایک طرح سے بے مقصد ہی تھیں۔ بہت سے رنگوں اور بہت سی نسلوں کے لوگ تھے۔ بے شک منوران میں ایک ایسی شخصیت تھی جس سے میرا دل لگا تھا۔ سب سے بڑی چیز اس کی حیرت ناک کہانی تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا لیکن تقدیر نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ کاش! وہ بھی ساتھ ہوتا۔

اب یہاں اس پر اسرار ماحول میں کم از کم زندگی کی تھوڑی سی امید تو ہو گئی تھی۔ سوچنے کے لیے سب کچھ تھا۔ بہرحال یہ بوڑھا ان لوگوں کے لیے بڑی حیثیت کا مالک تھا چنانچہ کچھ دیر کے بعد میرے لیے کھانے پینے کا سامان بھی آ گیا جو بے شک اجنبی تھا لیکن ظاہر ہے یہ لوگ اسی پر زندگی گزارتے تھے۔ میرے لیے بھی یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ آسمان سے تارے توڑ کر کون کسی کے لیے لا سکتا ہے۔ لیکن اسکیمو کی زندگی میرے لیے بڑی دلچسپ اور دلکش تھی۔ بات وہی آ جاتی ہے۔ برف کی دنیا میں رہنے والوں کی کہانیاں میں نے بھی لکھی تھیں لیکن اندرونی حقیقتوں سے ناواقف رہ کر۔ بس جہاں تک دماغ کی رسائی تھی میں ان کی کہانیاں بھی لکھتا رہا تھا۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو انسان کو دوسری

سوجھتی ہے۔ میرے پاس دو کہانیاں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ ایک جہاز کے حادثے کے بعد پیش آنے والے وہ تمام انسانی واقعات۔ کیسی کیسی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں تھیں اس تھوڑے سے عرصے میں اور لوگوں نے ان برف آبوں میں بھی اپنے مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ خلوص دل سے اجتماعی طور سے وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے، دوسرے ہی مسئلے شروع ہو گئے تھے اور وہ مسئلے اب بھی جاری ہوں گے۔ بیچاری لڑکیاں بھی تھیں وہاں۔ سب کی سب غیر محفوظ، لیکن حادثہ اسی کو کہتے ہیں۔ اپنے اپنے شاندار گھروں کو چھوڑ کر زندگی کے مختلف مسائل کے حل کی تلاش میں نکلنے والے ایک ایسے مسئلے سے دوچار ہو گئے تھے جس کا حل بظاہر ان کے پاس نہیں تھا۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ بات صرف میری اپنی ذات کے مسئلوں تک رہ گئی تھی پھر میں نے یہاں کی زندگی کے بارے میں سوچا۔ سویڈن، ناروے اور دوسرے شہروں میں برف کی زندگی بڑے عجیب وغریب انداز میں پائی جاتی ہے۔ ڈنمارک اور اس کے آس پاس کے علاقے اسکیمو لینڈ جن کی کہانیاں بڑی دلچسپ اور دلکش ہوتی ہیں۔ برف کے نیچے بنے ہوئے ایگلو جن میں سے ایک کا نظارہ میں خود کر چکا تھا لیکن یہ حیران کن دنیا ذرا مختلف تھی۔ وسیع وعریض، عظیم الشان اور ہر طرح کی مشکلوں سے بظاہر پاک لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ مشکلیں ہوتی ہوں گی ان لوگوں کے لیے بھی۔ میں نے یہ سوچا کہ ان کے پاس لباس بھی ہیں۔ زیادہ تر برفانی ریچھ اور دوسرے برف کے جانوروں کی کھالیں جیسے لومڑی، لگڑ بھگے وغیرہ ان کے جسموں پر تھیں لیکن بعض ایسے جانوروں کی کھالیں بھی ان کے جسموں پر نظر آتی تھیں جو خشک جنگلوں میں پائے جاتے ہیں یعنی وہ برفانی جانور نہیں ہوتے۔ یہ کھالیں اس کے علاوہ ان کے پاس برتن لکڑی یہ سب کہاں سے آئے۔ انہوں نے اپنے لئے زیر زمین رہائش گاہیں جو بنائی ہیں۔ ان کی تعمیر میں لکڑی کا اچھا خاصا استعمال تھا۔ کہیں نہ کہیں سے تو وہ یہ چیزیں لاتے ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا رابطہ کسی نہ کسی شکل میں باہر کی دنیا سے ہے۔ کم از کم کسی دور کی دنیا سے نہیں تو ایسے جنگلوں سے ضرور جہاں سے وہ یہ اشیاء حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کے امکانات ہیں کہ ایسے جنگلوں تک جانا نصیب ہو جائے۔ بہرحال میں ایک

پراسرار اور سنسنی خیز کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر جب میں نے اپنے آپ کو تندرست و توانا پایا۔ تو پہلی کوشش میں نے یہ کی کہ اپنی اس رہائش گاہ سے باہر نکلوں اور قرب و جوار کے ماحول کو دیکھوں۔ میں باہر نکلا اور اس کے بعد مجھ پر حیرتوں کے جو پہاڑ ٹوٹے وہ ناقابل یقین تھے۔ بوڑھے شی وش نے مجھے برف کی اس دنیا کے بارے میں بتایا تھا لیکن اس کے الفاظ میرے لیے بڑے ناقابل یقین سے ہو رہے تھے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ہم نے برف کے نیچے اپنی دنیا اپنے ہاتھوں سے تراشی ہے۔ یہ بات قابل یقین نظر نہیں آتی تھی لیکن جو عظیم الشان دنیا یہاں پھیلی ہوئی تھی اسے دیکھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ زمین کی تراش میں چھوٹے چھوٹے گول سوراخ بنے ہوئے تھے۔ یہ قدرتی سوراخ بے شک نہیں تھے بلکہ وہ دروازے تھے جو انہوں نے اپنی اپنی رہائش گاہوں میں تراشے تھے لیکن یہ رہائش گاہیں غاروں کی شکل میں تھیں اور میں نے جس غار سے باہر قدم نکالے تھے، اسکے اندر کی دیواریں بھی انسانی تراش کی معلوم نہیں ہوئی تھیں بلکہ ایسا ہی لگتا تھا جیسے قدرتی غاروں میں ٹھکانے بنا لیے گئے ہوں بہرحال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شی وش کا مفہوم کچھ اور ہی ہو۔ باہر نکلنے کے بعد میں نے ان لوگوں کی زندگی کو بکھرے ہوئے دیکھا۔ ایک باقاعدہ زیرِ زمین دنیا نظر آ رہی تھی۔ کہیں یہی زمین کا دوسرا طبق تو نہیں ہے۔ ہو بھی سکتا ہے کہ یہ لوگ اسے یہ نام نہ دے سکیں گے یا اس کے بارے میں کچھ جانتے نہ ہوں لیکن شی وش کے الفاظ بھی میرے لیے ذرا الجھا دینے والے تھے اس نے کہا تھا کہ وہ میری مہذب دنیا میں رہ چکا ہے اور برف کے ان علاقوں میں انہوں نے اپنے لیے یہ ایگلو تراشے ہیں تاکہ یہاں زندگی گزار سکیں۔ بہرحال یہ اتنی زیادہ تجسس کی بات نہیں تھی۔ یہ تو میرے لیے ایک تیسری کہانی کا آغاز تھا۔ ممکن ہے یہاں ایک اور کہانی میری منتظر ہو۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا اور دوسرے یا تیسرے دن میں نے اپنے جسم میں کافی توانائی محسوس کی پھر ایک صبح ایک نئی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ میں ایسے ہی ٹہلتا ہوا کافی دور نکل گیا تھا اور بہت دور دور تک کے علاقے دیکھتا پھر رہا تھا۔ زندگی اسی انداز میں یہاں بکھری ہوئی تھی۔ جیسے زمینی زندگی ہوتی ہے۔ اوپر کی چھت میں مجھے جا بجا سوراخ نظر آتے تھے لیکن ایسے سوراخ جن تک پہنچنے کے لیے ایک باقاعدہ راستہ منتخب کرنا پڑتا تھا اور

رسی کی سیڑھی کے ذریعے اوپر تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ویسے میں نے محسوس کیا تھا کہ بہت کم لوگ اوپر جاتے ہیں یا پھر ممکن ہے کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے وہ لوگ اپنی زندگی کی ضرورتوں کو تلاش کرنے کے لیے ہر وقت آتے جاتے رہتے ہوں۔ بے شک میں اس جگہ کا مکمل جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اس عجیب و غریب آبادی کے مختلف گوشے سنسان پڑے تھے۔ بعض جگہیں تو ایسی تھیں کہ دیکھ کر یقین نہ آئے۔ میں بھی ایسی ہی ایک جگہ کی طرف چل پڑا۔ یہ بھی پتھروں کے درمیان تراشی ہوئی جگہ تھی۔ ہم اسے ایک درے کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ درہ بہت دور تک چلا گیا تھا اور اس میں صرف اتنی جگہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ دو آدمی برابر چل کر وہاں سے گزر سکیں۔ یہاں کی زمین ناہموار تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ درہ کسی زلزلے کی وجہ سے زمین پھٹ جانے سے بنا ہے یا پھر بقول بوڑھے شی وش کے اسے بھی انسانی ہاتھوں نے تراشا ہے لیکن درے کا اختتام ایک چوکور سوراخ پر ہوا تھا اور یہ ذرا اجنبی سی بات تھی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اس پراسرار دنیا کی ہر چیز دیکھنے کی تمنا میرے دل میں تھی اور چونکہ یہ لوگ مہمان نواز تھے اور انہوں نے اب تک مجھے کسی ایسی مشکل سے دوچار نہیں کیا تھا جو میرے لیے پریشان کن ہو، اس لیے اس ویران اور اجنبی دنیا میں مجھے بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنی دانست میں کہانیاں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ عام رہائش گاہوں کی نسبت اس چوکور دروازے کو دیکھ کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس کے اندر جا کر دیکھوں کہ اندر کیا ہے۔ بہرحال میں اندر پہنچ گیا۔ چوکور دروازے کے دوسری طرف ایک عظیم الشان غار تھا اور اس غار میں، میں نے بہت سی مشعلیں دیواروں میں اڑسی ہوئی دیکھیں جو بجھی ہوئی تھیں لیکن انہیں جلانے کیلیے مخصوص قسم کے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ غار اندر سے نیم تاریک تھا۔ اسے بغور دیکھنے کے لیے میں نے ایک مشعل روشن کی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ایک ہلکی سی سرسراہٹ ابھری ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا تو غار کے بیچوں بیچ ایک انسانی ہیولا نظر آیا' رفتہ رفتہ میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو میں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھنے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرا سانس رک سا گیا۔

پراسرار' ناقابل یقین حیرت انگیز، سمجھ نہ آنے والی۔ وہ تقریباً ساڑھے پانچ فٹ قد کی مالک ایک خوبصورت سی لڑکی تھی جو غار کے بیچوں بیچ کھڑی مسکرا رہی تھی لیکن میں نے اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں محسوس کی تھی۔ وہ بالکل اسی انداز میں خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ میں آہستہ سے اس کے قریب پہنچا اور پھر میں نے کہا۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم، اور یہاں اس طرح کیوں کھڑی ہوئی ہو؟'' میرے ان الفاظ کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا' یا نہیں آیا یہ بات میں نہیں جانتا تھا لیکن اس کے انداز میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ وہ سادہ سے نقوش کی مالک ایک حسین لڑکی تھی اور میں اس کی مسکراہٹ پر غور کر رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کا انداز بہت عجیب تھا جسم انتہائی مناسب اور کسی جانور کی ہلکی سی کھال میں لپٹا ہوا۔ ماتھے پر جانور ہی کی کھال کی پٹی باندھے ہوئے، سر میں کسی خوبصورت پرندے کا پر اڑسا ہوا تھا۔ گہری اور بڑی سیاہ آنکھیں' ہلکے سانولے رنگ کے ساتھ بہت عجیب سی لگ رہی تھیں اور میں اس بے باکی پر غور کر رہا تھا جو اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر پلکیں بھی نہیں جھپکائی تھیں۔

''لڑکی میں جانتا ہوں تم میری بات نہیں سمجھ پائی ہو گی۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں اس انداز میں کیوں کھڑی ہوئی ہو؟'' دوبارہ بھی مجھے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور دوسرے لمحے میرے جسم کو ایسا شدید جھٹکا لگا کہ ایک لمحے کے لیے میری سٹی ہی گم ہو گئی۔ اس کا بازو پتھر کی مانند تھا۔ وہ انسانی جسم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر زور سے گرفت کی اور دوبارہ مجھے وہی احساس ہوا۔ وہ

پتھر کی عورت تھی یعنی کوئی حسین مجسمہ۔ وہ زندہ نہیں تھی اور اسی لیے اس کے جسم میں جنبش بھی نہیں تھی۔ آہ۔ کمال ہے۔ کمال ہے۔ برف کی اس دنیا میں اگر کسی فنکار نے یہ مجسمہ تراشا ہے تو میں اسے فنکار نہیں جادوگر کہہ سکتا ہوں۔ فنونِ لطیفہ سے مجھ سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا ہے۔ مصور' سنگتراش' شاعر ادیب یہ سب ایک ہی سمت سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے نازک جذبات کو وہ کہیں الفاظ کی شکل دیتے ہیں، کہیں رنگ و برش اور کہیں پتھروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ جس نے بھی یہ شاعری کی ہے بڑا ہی باکمال انسان ہو گا۔ پتھر کی شاعری' تو بہت ہی مشکل ہوتی ہے اور اس نے یہ مشکل شاعری کی تھی۔ میں نے غور سے پتھر کے اس مجسمے کو دیکھا۔ لڑکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بڑی دلآویز تھی۔ اس کے ہونٹ غیر قدرتی رنگوں سے پاک تھے لیکن ان کی سرخی ناقابلِ یقین تھی اور تانبے جیسی رنگت پر یہ سرخی بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔ مسکراتے ہونٹوں کے نیچے جو دانت جھانک رہے تھے وہ بالکل موتیوں کے مانند تھے۔ اتنے سفید اور چمکدار کے دیکھنے میں نہ آ سکیں اور پھر یہ مسکراہٹ اتنی دلکش تھی کہ اتنے دنوں کی ذہنی کوفت ایک دم دور ہو گئی۔ حالانکہ وہ ایک مجسمہ تھا صرف مجسمہ۔ اور نجانے کب تک میں اس مجسمے کو دیکھتا رہا اور میرے ذہن پر عجیب سے خیالات چھاتے رہے۔ یہ تو واقعی ایک طلسم گاہ ہے، ایک انوکھا طلسم کدہ جہاں نجانے کیا کیا اسرار بکھرے ہوئے ہیں۔ بہت دیر تک میں اس غار کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں مجھے اور کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی سوائے اس مجسمے کے لیکن اس سنگی مجسمے نے کچھ اس طرح دل و دماغ پر اثر کیا تھا کہ میں نے کئی گھنٹے وہاں گزار دیئے اور نجانے کیوں میرے دل میں یہ آرزو ابھرتی رہی کہ یہ سنگی مجسمہ انسانی شکل اختیار کر لے، میں اس سے باتیں کروں۔ پھر میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی، اپنا خوب مذاق اڑایا کہ ادیب ہر جگہ تم ایسی ہی بے تکی پراسرار کہانیاں تلاش کرتے پھرتے ہو جو تم صفحات پر بکھیر سکو۔ حقیقت کی زندگی بالکل مختلف ہے اس مہم جوئی کا مزا چکھ رہے ہو نا۔ اپنے کاغذات پر تم نے پتہ نہیں مہم جوئی کی کیسی کیسی داستانیں لکھ ماری ہیں۔ اصل داستان سے واسطہ پڑا ہے تو اپنا حلیہ دیکھ لو۔ میں ہنستا ہوا اس غار سے باہر نکل آیا۔ یہ ہنسی اپنے آپ پر تھی۔ برف کی چھت کے نیچے اس عجیب و غریب دنیا میں رہتے ہوئے بار ہا میرے دل میں خیال آیا کہ اب

کوئی ایسا عمل ہونا چاہیے جس سے مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملے۔ یہاں کے لوگ بہت نرم خو اور اپنے آپ سے واسطہ رکھنے والے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بوڑھے شی وش کے علاوہ وہ افراد جو پہلے مجھے ملے تھے، اور کسی نے ابھی تک میری جانب توجہ نہیں دی تھی۔ انہی میں سے دو آدمی میرے لیے کھانا وغیرہ لے کر آیا کرتے تھے اور ان چیزوں کو دیکھ کر میں حیران رہ جاتا تھا۔ کھانے میں خاص طور پر جب دودھ کی اشیا میرے سامنے آتیں تو میں سوچتا کہ یہ لوگ غالباً کچھ اور پراسرار ذرائع رکھتے ہیں۔ یہ دودھ کہاں سے آتا ہے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ یہ لوگ ہماری زبان نہیں جانتے تھے۔ ورنہ میں ان سے اس کے بارے میں سوال ضرور کرتا۔ بس خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ باقی کچھ اور بھی چیزیں وہ لے کر آیا کرتے تھے جو میرے لیے ناقابل فہم تھیں لیکن لذت میں بے مثال ہوتی تھیں اور میں اب اطمینان سے ان چیزوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً اس غار والے واقعے کے بعد یہ تیسرا دن تھا جب میں اپنے غار سے باہر نکلا۔ اس دوران بوڑھا شی وش بھی میرے پاس نہیں آیا تھا اور میری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ باہر نکل کر میں بہت دیر گھومتا پھرا۔ دن اور رات کا ایک تصور تھا اور میں اس وقت واپس اپنے غار میں آیا جب رات ہو چکی تھی۔ ان لوگوں میں سے ایک آدمی میری اس رہائش گاہ میں مشعل روشن کر گیا تھا۔ غالباً وہ لوگ بھی مطمئن تھے کہ میں ایک تکلیف دہ مہمان نہیں ہوں۔ مشعل کی پیلی اور مدقوق روشنی میں، میں نے کھانے کے برتن دیکھے اور اس کے بعد کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یہی روزانہ کا معمول تھا۔ ہلکا پھلکا سا نفیس کھانا کھانے کے بعد میں اپنے بستر پر جا لیٹا۔ دفعتاً ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مشعل کی روشنی کے علاوہ بھی میری اس رہائش گاہ میں ایک اور مدھم سی روشنی پھوٹی ہو اور یہ روشنی اس سوراخ سے آئی تھی جو بائیں سمت بنا ہوا تھا اور ایک دوسرے چھوٹے سے غار کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ اس غار میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ سوراخ کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا بند غار تھا۔ اگر میری دنیا میں ہوتا تو اسے ایک چھوٹا سا اسٹور کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال میں نے اس طرف چونک کر دیکھا اور دوسرے لمحے مجھے پر حیرت کا ایک شدید دورہ پڑا کہ شدت حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ دھوکہ نہیں تھا،

یہ یقینی طور پر کوئی فریب نہیں تھا۔ فریب نظر ایک الگ چیز ہوتی ہے لیکن اگر کوئی مجسم ہو کر سامنے آ جائے تو ناقابل یقین ہوتا ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا اور وہ آہستہ سے چلتی ہوئی میرے سامنے آ گئی۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ بالکل نہیں۔ یہ وہی تھی جسے میں نے غار میں دیکھا تھا۔ پتھر کے مجسمے کی شکل میں۔ میرے نزدیک آ کر اس نے ایک ہاتھ پھیلایا اور پھر آدھی جھک گئی۔ جھکنے کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم ہنس پڑی جیسے سیپ سے موتی نکل کر بکھر گئے ہوں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کون ہو............کون ہو تم............کیا نام ہے تمہارا؟“

”پرشیانہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”مم............مگر تم تو پتھر کا ایک مجسمہ تھیں۔“ میں نے کہا اور وہ پھر ہنس پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے الفاظ کو بخوبی سمجھ رہی ہو اور اس بات کا تو پہلے پتا چل گیا تھا جب میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تھا اور اس نے جواب میں اپنا نام بتایا تھا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ پھر اس نے اپنی انگلی میرے سینے پر رکھی اور آہستہ سے بولی۔

”ناصر۔ ناصر۔“

”ہاں۔ مگر تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟“

”میں سب کچھ جانتی ہوں۔“ وہ بولی اور میں حیرت سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ دوسری شخصیت تھی جو مجھ سے میری زبان میں بول رہی تھی لیکن اسے شخصیت کیسے کہا جا سکتا تھا۔ میں تو اسے پتھر کے مجسمے کی شکل میں دیکھ چکا تھا اور اس وقت مجھے قطعی کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ سب کچھ کیا ہے۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔ ”مجھے سچ بتاؤ کیا تم وہاں اس غار میں مجھے پتھر کے مجسمے کی شکل میں ملی تھی۔ وہ تم ہی تھیں؟“

جواب میں وہ ہنس پڑی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ”میں شی وش کی بیٹی ہوں اور اس نے مجھے اپنے بہت سے علوم سکھائے ہیں۔ میں اسی کی طرح تمہاری زبان سمجھ سکتی ہوں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے پتھر کے مجسمے کی شکل میں کیسے ملی

تھیں؟"

"کیسے ہی نہیں وہ تو میں خود پتھر بن گئی تھی یہ دیکھنے کے لیے کہ تم مجھے دیکھ کر کیا محسوس کرتے ہو اور کیا سوچتے ہو۔"

"پتھر بن گئیں تھیں؟"

"ہاں۔"

"مگر کیسے؟"

"اب ساری باتیں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کچھ راز میرے اپنے پاس بھی رہنے دو۔"

"تم بہت عجیب ہو پرشیانہ بہت ہی عجیب۔ لیکن بہرحال مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی اور خاص طور پر یہ جان کر کہ تم میری زبان سمجھ سکتی ہو۔"

"بڑی خوشی ہوئی ہے مجھے بھی تم سے مل کر۔ بابا نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ بابا مجھے تمہیں دیکھنے کی اجازت دے تو اس پر بابا نے کہا کہ تھوڑا سا وقت گزار لوں وہ مجھے اجازت دے دے گا۔ ذرا مہمان کے مزاج کو سمجھ لیا جائے۔"

"تمہارا بابا شی وش مجھ سے دوبارہ تو نہیں ملا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بابا کو نہیں جانتے وہ بہت بڑا جادوگر ہے اور اس کے جادو کے سامنے کوئی جادو کارگر نہیں ہوتا۔ ذی آنا میں لوگ اسے سب سے بڑا جادوگر مانتے ہیں۔"

"بہرحال بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہم وہ تمام تر باتیں دریافت کر رہے ہیں جن سے تم ہمارے ماحول کو پوری طرح سمجھ سکو اور اس میں شامل ہو جاؤ۔"

"مگر میں تو اجنبی دنیا کا انسان ہوں۔ ظاہر ہے مجھے اپنی اجنبی دنیا میں واپس جانا ہے۔ یہ تمام باتیں سیکھ کر میں کیا کروں گا۔ میں تو بس کچھ عرصے کے بعد تمہارے بابا سے یہی کہنے والا ہوں کہ وہ میرے اوپر یہ احسان کرے کہ مجھے میری دنیا میں پہنچا دے۔"

"شاید ایسا نہ ہو کیونکہ تم نے جب بابا سے پوچھا تھا کہ تم ان کی کیا خدمت کر سکتے ہو اور کس طرح اس کا احسان اتار سکتے ہو تو بابا نے کہا تھا کہ وہ تمہیں اس کا موقع دے گا لیکن کچھ عرصے کے بعد۔"

"لیکن میں اس ماحول میں رہ کر کیا کروں گا؟"

"اس کا جواب تو تمہیں ہارلیس ہی دے گا۔ ہارلیس ہمارا رہنما ہے۔ ہمارا سردار ہے۔ وہی تمہیں اس بات کا جواب دے گا۔"

"اوہ۔ مگر تمہارا سردار کہاں ہے؟"

"تمہیں اس کے سامنے پیش کیا جائے گا لیکن اس وقت جب تم ہماری زبان سمجھنا شروع کر دو گے۔"

"مگر میں تمہاری زبان کیسے سمجھ سکوں گا؟"

"یہ ذمہ داری بابا نے مجھے دی ہے۔"

"اوہ۔ تو تم مجھے اپنی زبان سکھاؤ گی؟"

"ہاں۔"

"مگر ایسا کیسے ہوگا؟"

"ہو جائے گا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔" پرشیانہ نے آنکھیں بند کر کے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی پھر کہنے لگی۔ "میں روزانہ تمہارے پاس آؤں گی اور اپنی زبان کے کچھ الفاظ تمہیں سکھاؤں گی اور اس بات کا اطمینان رکھو کہ یہ الفاظ میں تمہارے ذہن میں بٹھا دوں گی۔"

"ٹھیک۔ بڑی خوشی کی بات ہے تم میری بہت اچھی دوست بن جاؤ گی۔"

"ہاں، میں تمہاری دوست ہوں۔ ویسے تم اس بات پر یقین کرو کہ پورا قبیلہ تمہاری آمد سے خوش ہے اور ہم لوگ تم سے بہت سی توقعات وابستہ کر چکے ہیں۔"

"کیسی توقعات؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ بات بھی تمہیں سردار ہی بتائے گا۔" اس نے کہا اور پھر ہنس پڑی۔

"واہ۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک طرف تم اپنے آپ کو میرا دوست کہتی ہو اور

دوسری طرف کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو تمہیں معلوم ہیں لیکن تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔''

''مگر اس میں اعتماد نہ ہونے کی کیا بات ہے۔''

''اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہوتا تو تم مجھ سے کوئی بات نہ چھپاتیں۔''

''تم یقین کرو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپا رہی۔'' پرشیانہ نے جواب دیا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا مجھے کہ میں تمہارے لیے بڑی حیثیت کیوں رکھتا ہوں۔''

''میں خود نہیں جانتی اس بارے میں۔''

''تو پھر تم نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے؟''

''اس لیے کہ میرے بابا نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

''شی وش نے؟''

''ہاں۔ وہی تو میرے بابا ہیں۔ انہوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی تھی کہ ایک شخص جو برف کے ویرانے عبور کر کے ہماری اس برفانی دنیا میں آئے گا، وہ ہمارے لیے بڑی برکتوں کا درجہ رکھتا ہے اور ہمیں دیوتاؤں کی طرح اس کی عزت کرنی چاہیے اور پرشیانہ، تم اس اجنبی کو مقامی زبان سکھاؤ گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ الفاظ ہیں جن کی بناء پر میں نے تم سے کہا اور یقینی طور پر سردار نے لوگوں کو بتایا ہوا تھا کہ وہ اجنبی آ چکا ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس لیے قبیلہ خوش ہے۔ اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی اور پھر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں نے پرشیانہ کی طرف دیکھا اس کی شوخ آنکھوں میں مسکراہٹیں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

''تم کیا سوچنے لگے؟''

''کوئی خاص بات نہیں بس میں تمہاری باتوں پر غور کر رہا تھا۔''

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ بابا نے جس طرح تمہارے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نجانے تم کیسے ہو گے۔ لیکن تم تو بالکل ہم جیسے ہی ہو۔ باتیں بھی ہماری ہی طرح کرتے ہو اور تمہارے اور اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دوسروں سے مختلف ہو۔''

''پتہ نہیں کیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجھے اپنی زبان کیسے سکھاؤ گی؟''

''ابھی سے شروع ہو جائیں۔''

''کیا حرج ہے۔'' میں نے کہا۔ میرے دل میں یہ تصور تھا کہ ان کی زبان سیکھنے کے بعد مجھے برف کی اس پراسرار دنیا کے بارے میں اور بھی بہت سی معلومات حاصل ہوں گی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''اب تم ایسا کرو جو کچھ یہاں موجود ہے اس کے بارے میں سوالات کرو۔ میں تمہیں ان کے جواب دوں گی اور یہ بتاؤں گی کہ کون سی چیز کو کیا کہا جاتا ہے۔'' یہ کھیل میرے لیے بھی دلچسپ تھا۔ ویسے اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی اور اس کے بعد دنیا کے دوسرے علوم کی کتابیں پڑھنے سے مجھے کافی دلچسپی تھی لیکن اس پراسرار دنیا کی پراسرار زبان میرے لیے بڑی دلکشی کا باعث تھی چنانچہ بہت دیر تک میں اس کا دماغ کھاتا رہا اور اس نے کئی الفاظ مجھے سکھائے۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

''اب میں جاؤں؟''

''کل آؤ گی؟'' میں نے اس کی زبان میں سوال کیا اور وہ اچھل پڑی۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''ہاں میں کل آؤں گی۔''

''کس وقت؟''

''جب سورج نکلے گا۔'' اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ چلی گئی اور میں گہری سانس لے کر ان تیمار دار بوڑھوں کو دیکھنے لگا جوان ہڈیوں اور کھوپڑیوں میں مصروف تھے۔ یقینی طور پر یہ شی وش کے وہ ساتھی تھے جو اس کے ساتھ مل کر دوائیں تیار کیا کرتے تھے۔ بہرطور میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا اور آخری فیصلہ یہی کیا کہ میری زندگی جس طرح پابہ زنجیر ہو کر رہ گئی ہے اس کے بعد یہی دیکھنا رہ گیا ہے کہ یہاں سے کب نکلنا نصیب ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذرا سی باعث حیرت تھی کہ وہ لوگ میرے بارے میں کوئی خاص تصور رکھتے تھے۔ جیسا کہ لڑکی نے کہا کہ قبیلے کے لوگ میرے لیے بڑی خوشیاں منا رہے ہیں۔ میں نے اپنی کئی ایڈونچر کہانیوں میں اسطرح کے

تھا۔ بہرحال وہ بوڑھا جس سے میری باتیں ہوئیں تھیں، بہت ہی حیرانی کا اظہار کر رہا تھا۔ جب سورج چھپا تو غار کے دروازے سے آنے والی روشنی مدہم پڑ گئی اور دروازے پر شی وش نظر آیا۔ اس کے چہرے اور بالوں کی رنگت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر بہت زیادہ ہے لیکن بڑی اعلیٰ صحت تھی اس کی اور وہ بڑے خوبصورت انداز میں قدم رکھتا ہوا میرے پاس پہنچا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''واہ۔ تم نے اتنی جلدی کتنی عمدگی سے ہماری زبان سیکھ لی ہے۔''

''سکھانے والی جو شخصیت ہے اس کے بارے میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں شی وش۔''

''ہاں بولو۔''

''وہ مجھے ایک غار میں نظر آئی تھی اور اس وقت اس کا سارا وجود پتھر کا وجود تھا۔''

شی وش کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ کچھ دکھی سا ہو گیا تھا۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے پھر کہا۔ ''اگر کوئی ایسی بات ہے جو تم نہیں بتانا چاہتے میرے معزز میزبان، تو میں تمہیں اس کے لیے بالکل مجبور نہیں کروں گا۔ یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہوگی جسے بتانے میں تم الجھن محسوس کر رہے ہو۔ لیکن میں تمہیں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ غم انگیز کہانی، تم میری زبانی نہیں بلکہ سردار ہارلیس کی زبانی سنو۔ جو تمہارے آنے سے بہت خوش ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ شاید تم اس کے بیٹے کو اس جگہ سے رہا کرا کر لے آؤ گے جہاں اسے قید کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑی غمناک کہانی ہے لیکن اب جبکہ تم نے یہ سوال کر لیا ہے تو مجھ پر لازم ہو گیا ہے کہ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں۔''

میرا دل چاہا کہ میں زبردست قہقہے لگاؤں۔ کہانیاں' کہانیاں' کہانیاں' ہر قدم پر ہر موڑ پر ایک کہانی۔ آہ۔ کاش! مجھے زندگی مل جائے اور میں ان کہانیوں کو تحریر کر کے تحریر کی دنیا میں تہلکہ مچا دوں۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معزز شی وش! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

''نہیں۔ میں نے کہا نا اب جبکہ تم نے یہ سوال کر ہی لیا ہے تو پھر مجھ پر فرض عائد ہو گیا ہے۔ لیکن میرے ساتھ چلنا ہوگا تمہیں۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا تمہارے ساتھ چلنا مناسب ہے اور تم مجھے یقینی طور پر کسی چیز سے آگاہ کرنا چاہتے ہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔''

''آؤ۔ پہلے وہیں آؤ جہاں سے تم نے اپنے اس تجسس کا آغاز کیا ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیا دکھانے پر آمادہ ہے۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد اسی جگہ پہنچ گیا جہاں میں نے وہ عجیب و غریب غار دیکھا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ پرشیانہ تو اب میرے لیے ایک دلچسپ اور دلکش وجود بن گئی تھی۔ اس وقت میں نے اسے غار کے اندر دیکھا تو وہ ویسے ہی سنگی مجسمے کی حیثیت سے کھڑی تھی۔ میری حیرت عروج پر پہنچ گئی۔ میں نے کہا۔

''یہ اس وقت پرشیانہ کی کیا کیفیت ہے؟''

''جاؤ اسے چھو کر دیکھو۔'' شی وش بولا اور میں بے اختیار اس جانب چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد میں پرشیانہ کے قریب تھا۔ پرشیانہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اسی طرح تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شرارت سے مسکرا رہی ہو اور کہہ رہی ہو کہ دیکھو۔ ہم سب مل کر تمہیں کیسے بیوقوف بنا رہے ہیں۔ لیکن بہرحال میں نے اسے چھو کر دیکھا اور اس بار میں نے اپنی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ سو فیصدی پتھر کے ایک بت کی مانند تھی۔ اس میں بے شک زندگی دوڑتی محسوس ہوتی تھی لیکن ہر چیز پتھر کی تھی۔ اس کی آنکھیں جن میں، میں نے انگلیاں پھیر کر دیکھا، اس کے ہونٹ، رخسار، گردن .... میں نے حیران نگاہوں سے بوڑھے شی وش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

''آؤ۔'' لیکن اس بار وہ جس طرف بڑھا وہ میرے لیے اور حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اس کے ساتھ قدم اٹھائے۔ وہ غار کی ایک دیوار کے پاس پہنچا اور پھر اس نے کوئی عمل کیا جس سے غار کی دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا۔ میں اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو میں نے دو نوجوانوں کو دیکھا جو اسی طرح ساکت و جامد کھڑے ہوئے

تھے۔ ان میں سے ایک قوی ہیکل جسم کا مالک اور بڑے پر رعب چہرے والا تھا دوسرا ایک شوخ سی شکل کا نوجوان تھا جو مقامی لباس پہنے ہوئے تھا لیکن اس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

''کیا یہ دونوں مجسمے بھی پتھر کے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔ اب یہ پتھر کے ہیں۔''

''یہ کون ہیں؟''

''یہ سردار ہارلیس کا بیٹا زیراس ہے اور دوسرا جو شوخ سی شکل کا ہے اس کا نام روتھن ہے۔ اب اس کہانی کے تینوں کردار تم نے دیکھ لیے' وہ لڑکی غالباً اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میری بیٹی پرشیانہ ہے۔ آؤ...... میں تمہیں کچھ اور لوگوں سے ملواؤں۔'' اس نے کہا اور اس غار سے باہر نکل کر داہنے ہاتھ پر ایک دروازے کے اندر داخل ہو گیا اور پھر اس نے ایک ایسا منظر میرے سامنے پیش کیا جو ناقابل یقین تھا۔ وہاں وہی دونوں نوجوان زندہ حالت میں موجود تھے اور ان کے برابر ہی پرشیانہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسی اور اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ بوڑھے نے کہا۔ ''پرشیانہ ادھر آؤ۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے سے چند فاصلے پر آ کھڑی ہوئی۔ بوڑھے نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور جدید دنیا کے اجنبی! تم نے واقعی ان تمام شریفانہ جذبوں کا اظہار کیا ہے جو اچھے نوجوانوں کے اندر ہوتے ہیں۔ تم نے اسے چھو کر تو نہیں دیکھا ابھی تک۔''

''نہیں بزرگ! میں کسی کی عزت کو اپنی ہی عزت سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ حق تو حاصل نہیں تھا۔''

''ہاں۔ اسی بنیاد پر میں تمہیں ایک شریف نوجوان تصور کرتا ہوں لیکن آؤ۔ میں تمہیں پرشیانہ کو چھونے کی دعوت دیتا ہوں۔''

''کیا......؟''

''ہاں۔ آؤ......... تم اس کے سنگی بت کو چھو کر دیکھ چکے ہو۔''

''وہ صرف حیرت کا ایک جذبہ تھا لیکن یہ اس وقت......''

''میں تم سے کہتا ہوں۔ آگے بڑھو۔ پرشیانہ یہ شخص اپنی شرافت کی وجہ سے آگے نہیں بڑھے گا۔ تم خود اسے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' پرشیانہ میری جانب بڑھی اور میں کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا لیکن حیرتوں کا سمندر اس وقت میرے اردگرد موجزن ہو گیا جب اچانک ہی پرشیانہ میرے جسم میں سے گذر کر دوسری جانب نکل گئی۔ میں نے ہوا کے ایک جھونکے کو اپنے بدن سے گزرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

''اور اسے یقین دلا دو کہ تم صرف ایک ہوا کا وجود ہو۔ صرف ہوا کی بیٹی ہو تم۔ تمہاری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سمجھیں! تم صرف ہوا کی بیٹی ہو۔'' پرشیانہ دوبارہ میرے جسم سے گزر گئی اور میری حیرتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر بوڑھے نے ان دونوں سے کہا۔

''تم لوگ بھی اسے بتاؤ کہ تم صرف خاک کے ہو۔ تمہارا کوئی وجود نہیں ہے۔ کیا سمجھے...... تمہارا کوئی وجود نہیں ہے اسے بتاؤ۔'' دونوں نوجوان آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور اس کے بعد وہ تینوں میرے جسم سے گزرنے لگے۔ ایک ادھر' ایک ادھر' ایک ادھر۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ تینوں ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں اور میرے دل میں بھی غم کا ایک شدید احساس تھا۔ ان دونوں سے تو میری ابھی ملاقات ہوئی تھی لیکن پرشیانہ سے تو میں کئی دن سے واقف تھا۔ ہنستی بولتی' مسکراتی لڑکی۔ پتہ نہیں اس جادوگری میں اس کا وجود اس وقت کیا تھا۔ میں نے اسے ایک سنگی مجسمے کی صورت میں دیکھا تھا اور اس کے بعد اب دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ میرے پاس ایک تیسری شکل میں آتی رہی تھی۔ بوڑھے نے کہا۔

''آؤ......... اب باہر آ جاؤ۔'' پھر وہ مجھے ان غاروں سے باہر نکال لایا لیکن میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس احساس نے مجھے دیوانہ کیا ہوا تھا کہ اصلیت کیا ہے' حقیقت کیا ہے؟ بوڑھے نے اس طرف رخ نہیں کیا تھا جدھر باقاعدہ آبادی تھی۔ وہ مجھے ایک ویران سی جگہ لے گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر بولا۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ تمہاری دنیا سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے اور میں اسی لیے تمہاری زبان' تمہاری تہذیب اور تمہارے رہن سہن سے آشنا ہوں۔ میرے

دوست! بڑے بدنصیب ہیں ہم لوگ، تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ برف کی چھت کے نیچے آباد یہ بستی بہت اچھی حیثیت کی حامل ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ہم لوگ بھی بہت سے عذابوں کا شکار رہتے ہیں۔ برف کی یہ سرزمین انتہائی طویل وعریض ہے اور ذی آنا کی یہ آبادی اس سے پہلے اس طرح زمین کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی۔ بے شک ہمارے سیانوں نے یہاں بہت کچھ پیدا کرلیا ہے لیکن ہم آج بھی اپنی اس آبادی کو نہیں بھول سکتے جو بے شک برف زاروں ہی میں تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ باہر کی دنیا میں جاؤ گے تو تمہیں باقاعدہ ایسی آبادی ملے گی جیسی تمہاری اپنی آبادیاں ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں برفاب بھی ہیں، جنگل درخت بھی ہیں، پہاڑیاں بھی ہیں۔ وہی ہماری سرزمین تھیں اور ہم اسی سرزمین کے باسی تھے لیکن ذی آنا کے جادوگروں نے اس طرح بربادی پھیلائی کہ ہم لوگوں کو اپنی آبادی سمیٹ کر اس طرح زیرزمین آنا پڑا ورنہ ہماری اصل بستی تو اور ہی تھی۔ وہاں ہم گھر بنا کر رہتے تھے۔ ہماری اپنی زندگیاں تھیں لیکن سب سحر کا شکار ہوگئیں۔''

''مگر میں پرشیانہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

اور تب بوڑھے شی وش نے اچانک ہی اس کہانی کا آغاز کردیا تھا۔ جس کا ابتدائی حصہ میرے علم میں نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جذباتی بوڑھا ان دونوں ہی کے بارے میں تفصیل بتا رہا ہے۔ جن میں سے ایک کا نام زیراس اور دوسرے کا روتھن ہے۔ حالانکہ میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ مجھے ساری تفصیل کا صحیح انداز میں پتہ چلے اور پرشیانہ کے بارے میں مجھے تفصیل معلوم ہو لیکن بوڑھے کی آنکھوں میں نظر آنے والے آنسو مجھے روک رہے تھے کہ میں اس خواہش کی تکمیل کے بجائے وہ سنوں جو بوڑھا مجھے بتانا چاہتا ہے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔



ہارلیس کا بیٹا زیراس اور پرشیانہ کا بھائی روتھن بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ وہ ذی آنا کے ان محافظوں میں سے تھے جنہیں ذی آنا کی محافظت کی ذمے داری ورثے میں ملی تھی۔ وہ یہاں کے بے شمار مسائل سے نمٹتے تھے اور عام طور پر گھوڑوں کی پشت ان کا بستر ہوا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی لوگوں کے کام آیا کرتے تھے۔ اوپر کی دنیا میں بہت سے قبیلے آباد تھے لیکن سب کے سب تباہ ہوگئے۔ بہرحال بہت سے معاملات میں بہت سنگین صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان دنوں کچھ ایسے واقعات پیش آ رہے تھے کہ سب حیران رہ گئے تھے۔ روتھن سیلانی تھا اور اسے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہنے کی عادت تھی۔ زیادہ تر وہ ایسی باتیں اور چیزیں دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتا جن سے دوسرے بے خبر رہتے تھے۔ وہ واپس آ کر یہ خبریں زیراس کو دیتا اور زیراس پریشان ہو جاتا۔ بعض اوقات روتھن کی سنائی ہوئی باتوں پر اسے یقین نہیں آتا تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ چلتا اور اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتا۔ اس عمل میں اکثر ان کا واسطہ عجیب وغریب حالات سے پڑ جاتا لیکن وہ اپنی شجاعت، ذہانت اور قوت کے بل بوتے پر بچ نکلنے میں کامیاب رہتے۔

ان دونوں کے درمیان کچھ اس طرح کی گفتگو اکثر ہوا کرتی تھی۔

''یہ مت بھول زیراس! کہ میں نے ہی تجھے اس خوفناک بلا سے نجات دلائی تھی اور ذی آنا میں جو تباہی پھیلنے والی تھی، اس کا تو نے نمونہ بھی دیکھ لیا تھا۔''

''ہاں بے شک۔ لیکن میں اس خوفناک بلا کو مفلوج کرچکا تھا۔ کیا تجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس سے آگے اسے کوئی فتح حاصل نہ ہوسکی۔''

"تو کب اسے روک سکتا تھا؟ میں نے اس بلا کو جنگ کر کے ختم کر دیا۔"

"اگر تو یہ نہ کر پاتا تو میں یہ کام کر ڈالتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے تو اسے دوبارہ تلاش کر۔ وہ تو نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو تو کیا سمجھتا ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکوں گا۔"

پراسرار دنیا کے پراسرار قصے، ذی آنا کے بے شمار لوگوں کو سنائے جاتے تھے اور وہ خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے لیکن یہ کہانیاں پھر بھی دہرائی جاتی تھیں اور حقیقت تو یہ تھی کہ جادو کی دنیا بڑی خطرناک نوعیت کی حامل تھی اور شاید زیراس وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن روتھن بھلا کہاں باز آتا۔ بہر حال زیراس نے فیصلہ کیا کہ روتھن کی خواہش کے سامنے سر جھکا دے چنانچہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر ان پراسرار کرداروں کی تلاش میں چل پڑے جو ذی آنا کی وادی کے انتہائی سنگین نوعیت کے کردار تھے۔ خاص طور سے فولاس اور زوالاجن سے ایک بار ان کا واسطہ پڑ چکا تھا اور جن کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ بلندیوں کی وادیوں کے بدترین کردار ہیں۔ ان دونوں کی پراسراریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کا نام ایک عرصے ذی آنا کے نشیب و فراز میں گونج رہا تھا لیکن آج تک کسی نے انہیں دیکھا نہیں۔

بہر حال انہیں صحیح سمتوں کا تو اندازہ نہیں تھا، بس وہ اپنی یادداشت پر بھروسہ کر کے چل پڑے تھے اور زیراس روتھن کا تعاقب کرتا رہا۔ سنگلاخ چٹانوں اور گھنے جنگلوں اور دلدلوں کی وادیوں میں سمتوں کا تعین کرنا ایک ناقابل یقین عمل تھا۔ ان پوری آبادیوں کے لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ جس سمت جا رہے ہیں، وہ انہیں کہاں لے جائے گی۔ بس کوئی بستی نظر آ جائے تو اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لی جاتی تھی اور وہیں سے آگے کے سفر کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت چونکہ زیراس نے روتھن کے خیال کی نفی کی تھی اس لیے روتھن اس سے منہ موڑے اپنا سفر کر رہا تھا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اسے پوری طرح اس بات کا علم تھا کہ سردار کا بیٹا اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ کافی دور جانے کے بعد اس نے صرف ایک بار چور نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بلندی پر تھا اور زیراس ڈھلانوں میں۔ زیراس کے گھوڑے کو اپنے

پیچھے آتے دیکھ کر روتھن بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ یہ سفر جاری رہا اور رفتہ رفتہ شام ہو گئی لیکن میرے عزیز دوست جیسا کہ میں نے تم سے ذی آنا کی اس سرزمین کا تذکرہ کیا جو برف سے ڈھکی ہوئی نہیں تھی۔ برف کی زیریں وادیوں میں تو ہم ماحول سے اکتا کر آئے کہ جو کچھ ہم پر بیتی تھی وہ ہمارے لیے بہتر تو نہیں تھی۔ بہر حال رفتہ رفتہ شام ہو گئی جہاں تک نگاہ کام کرتی چٹانوں اور ان کے درمیان لگی ہوئی جھاڑیوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جب رات گہری ہو گئی اور آگے کے راستے تاریکیوں میں گم ہو گئے، تو روتھن نے گھوڑا روک لیا اور نیچے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد زیراس بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ جہاں روتھن وہاں زیراس، جہاں زیراس وہاں روتھن۔ بچپن سے یہ دوستی ایک معیاری حیثیت رکھتی تھی اور لوگ اس کے حوالے دیا کرتے تھے۔ بہر حال جب زیراس اس کے قریب پہنچا تو روتھن کے منہ سے ہنسی نکل گئی جس پر زیراس سخت ناراض ہو کر بولا۔

"دانت مت نکال۔ اگر میں تجھ سے کہتا کہ کسی آبادی کو تلاش کر کے ان علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ تو یقیناً تیری ناقص اور گھٹیا کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی اور تو سوچتا کہ زیراس سے اختلاف کرنا چاہیے۔"

"ارے نہیں نہیں۔ زیراس جو سوچتا ہے وہی روتھن کی سوچ ہوتی ہے۔ لیکن تیرے اوپر یہ مشکل کیوں سوار ہے؟ کیا اس سے پہلے ہم نے کسی جگہ یا کسی راستے کے بارے میں اس قدر سوچا اور غور کیا ہے؟ ہم تو جس سمت بھی نکل جائیں اسی طرف ہماری منزل ہوتی ہے۔ منزل وہ لوگ تلاش کرتے ہیں جنہیں کسی کا خوف ہوتا ہے، ہم لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ویسے تیرا کیا خیال ہے، کسی آبادی کی حسینائیں تیری وجہ سے افسردگی کا شکار ہوں گی؟"

"گدھا ہے تو۔ تو یہ نہیں جانتا کہ حسن میری منزل نہیں ہے۔"

"لیکن جب میں ایک حسینہ کا نام لیتا ہوں تو تیرے رخسار سرخ کیوں ہو جاتے ہیں؟" روتھن نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ زیراس گھونسا تان کر اس پر دوڑا اور روتھن نے پھرتی سے دوڑ لگا دی۔ پھر جلدی سے بولا۔ "مم...... مگر میں نے ایسی کوئی بات کہی تو

نہیں۔ بس ایسے ہی منہ سے ایک بات نکل گئی تھی۔ اچھا خیر چھوڑو۔ ویسے تو ذی آنا میں ایک سے ایک پُراسرار وادی موجود ہے لیکن یہ سرزمین بڑے عجیب وغریب اسراروں کی حامل ہے اور تو مجھے یہاں تک لایا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ علاقے کی صحیح طریقے سے سیاحت کر ہی لی جائے۔ لطف آئے گا اور مجھے یقین ہے کہ تو بھی اس سے لطف اندوز ہوگا۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ اگر تو نے کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہ کیا تو میں تجھے ہی کھا جاؤں گا۔" زیراس نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا اور روتھن ہنسنے لگا۔

"ہاں واقعی! ہم جیسے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک ہی ہوتی ہے لیکن کیا اچھی بات ہے کہ سرزمین ذی آنا میں رات کبھی بھوک سے بلکتے ہوئے نہیں گزری۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے، کیا سمجھا؟ اور ایک بات تجھے ماننی پڑے گی۔ وہ یہ کہ تیری یادداشت میں اب کوئی خرابی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔"

"کیسے جا، کیسے جا۔ بک بک تو، تو کرتا ہی ہے۔ میری یادداشت کو کیا ہوا؟"

"تجھے وہ گورخر یاد نہیں جس کا گوشت تو نے بڑی چاہت کے ساتھ محفوظ کر لیا تھا؟"

"ارے واقعی۔ اوہو...... میں تو بھول ہی گیا۔ جلدی نکال وہ گوشت۔ بے شک ٹھنڈا ہو گیا ہوگا لیکن ٹھنڈے گوشت کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ کیا ہی بے عقلی کی بات ہے واقعی! مگر تو ایک بات سن لے۔ جب میں بھوکا ہوتا ہوں تو میری عقل معدے میں چلی جاتی ہے اور کھوپڑی میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ ہمارے پاس تو کچے جو کی شراب بھی ہے۔ جلدی کر جلدی۔"

ٹھنڈا گوشت اور کچے جو کی شراب اس وقت دنیا کی سب سے لذیذ چیز بن گئی تھی ان کے لیے۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ آرام سے ایک جگہ دراز ہو گئے۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا جو کافی تعداد میں یہاں موجود تھی۔ اور اس کے بعد وہ زوالا اور فولاس کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ زوالا اور فولاس کا مسئلہ بڑا الجھا ہوا تھا۔ ان سے ایک طویل اور ہنگامہ خیز جنگ ہوئی تھی

لیکن وہ اپنی جادوگری کی وجہ سے بچ گئے تھے اور اس کے بعد ان کا خیال تھا کہ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو فولاس حکمران بن جائے گا یا اگر زوالا مقابلے میں کامیاب ہو گیا تو فولاس قتل کر دیا جائے گا۔ بہرحال وہ دونوں زوالا اور فولاس کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور رات آہستہ آہستہ اپنا سفر ختم کرتی رہی۔ پھر دوسری صبح انہوں نے طے کیا کہ بالکل وہی سیدھ اختیار کی جائے جو ان کے سامنے ہے۔ پہاڑی راستوں کی حالت بتاتی تھی کہ ان راستوں پر کوئی آبادی نہیں ہے یا ان کے اطراف میں گزرگاہیں نہیں بنائی گئیں۔ اگر گزرگاہیں ہوتی ہیں تو ان کے نشانات پگڈنڈیوں کی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن یہاں کانٹے دار جھاڑیوں میں زہریلے بچھوؤں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور ان کے گھوڑے بھی دوڑتے دوڑتے بدک کر اچانک ہی چھلانگیں لگا دیتے تھے۔ یہ بھی غالباً زہریلے بچھوؤں کا ہی خوف تھا جو پتھر پر بھی ڈنک مارتے تو وہ سلگ اٹھتا تھا اور ایک ایسا زہر بن جاتا تھا جسے چاٹ کر کوئی بھی مر جائے۔ چنانچہ ان زہریلے بچھوؤں سے بچ کر سفر کرتے ہوئے انہیں کافی احتیاط کرنی پڑ رہی تھی۔ گھوڑوں کی رفتار کافی حد تک سست رہی تھی پھر شام تک وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے رہے۔ وہ خطرناک خطہ ختم ہو چکا تھا جو بچھوؤں کا مسکن تھا۔ اب جگہ جگہ درخت نظر آ رہے تھے پھر انہیں ایک پگڈنڈی نظر آئی جو ان درختوں کے درمیان سے گھوم گئی تھی۔ یہاں رک کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ کون سی سمت اختیار کریں۔ روتھن نے جھک کر پگڈنڈی پر آمدورفت کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی پھر داہنا ہاتھ اٹھا کر وہ بولا۔ "ہمارے لیے یہ سمت مناسب رہے گی۔"

"تم پورے یقین کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟" زیراس نے سوال کیا۔

"اگر بغور زمین کا جائزہ لو گے تو تم بھی اس سمت کا تعین کرو گے۔ گو کہ آمدورفت کے نشانات موجود نہیں ہیں لیکن پھر بھی مجھ جیسے زیرک انسانوں کی نگاہیں ان نشانات کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ چلو آؤ...... میرے ساتھ چلتے چلے آؤ۔ میں تمہیں کسی آبادی تک پہنچا دوں گا۔" زیراس نے روتھن کے لہجے سے جھلکتے اعتماد کو محسوس کیا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ روتھن کے اندر شیطانی قوتیں رہتی ہیں اور اگر وہ پوری سنجیدگی سے کوئی بات کہہ دے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بات حقیقت ہے۔ یہاں اس

نے روتھن سے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ خاموشی سے اپنا گھوڑا اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

رات کی تاریکی پھیل گئی لیکن اس تاریکی میں بھی اس نے روشنی کی وہ کرن دیکھ لی تھی جو بہت دور پہاڑیوں کے گرد چمک رہی تھی۔ ظاہر ہے روشنی آبادی کا نشان ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے رکے بغیر گھوڑے اس طرف دوڑا دیئے۔ پہاڑیاں بلند نہیں تھیں اور بہت سے اونچے نیچے ٹیلے تاحد نگاہ دیوار بنائے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان رخنے تھے جو گزرگاہ کا کام دیتے تھے۔ جب وہ ان رخنوں میں داخل ہوئے تو انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ قدرتی دیواریں زیادہ وسیع نہیں ہیں اور صرف چند گز کا فاصلہ طے کر کے ان درختوں کے دوسری طرف پہنچ سکتے ہیں۔ رخنوں کے دوسری جانب ایک خوبصورت دنیا آباد تھی۔ وادی ذی آنا میں بے شمار علاقے آباد تھے۔ گو کہ ان کے کوئی نام نہیں تھے لیکن ان بستیوں کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ کہیں کہیں تو اتنی حسین وادیاں نظر آجاتی تھیں کہ انسانی نگاہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لے اور اگر انسان وہاں پہنچ جائے تو اس کے دل میں ایک ہی خواہش ابھرے کہ کاش موت بھی انہی وادیوں میں آجائے۔ اس بستی کا کوئی نام نہیں تھا جو رخنوں کے دوسری جانب آباد تھی۔ ان دونوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار سست کر لی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

بستی میں زندگی نظر آرہی تھی۔ جگہ جگہ آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لوگ ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ بستی کے مکانوں کی تعمیر زیادہ قدیم نظر نہیں آرہی تھی۔ گھر لکڑی اور مٹی پتھر سے بنائے گئے تھے۔ یہ سارے کے سارے مکانات ایک خوبصورت طرز تعمیر رکھتے تھے جو یہاں کے بسنے والوں کی جدت پسندی کا مظہر تھا۔ یقینی طور پر یہاں کے رہنے والے خاصے ذہین لوگ ہوں گے کیونکہ دور سے خوش لباس لوگ نظر آرہے تھے۔ ان کے حلیے بے ترتیب اور غیر مہذب نہیں تھے جبکہ ذی آنا کی بعض پسماندہ علاقوں کی آبادیوں میں انتہائی پسماندہ لوگ بھی پائے جاتے تھے لیکن یہ دور دراز کی آبادیاں تھیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

بہر حال یہ دونوں ان کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور آہستہ آہستہ چلتے

ہوئے بستی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے ایک بڑا سا قہوہ خانہ دیکھا اور یہ قہوہ خانہ بہت بڑی اور وسیع جگہ پر محیط تھا۔ وہ اس کی جانب چل پڑے۔ یہ قہوہ خانہ دو منزلوں پر مشتمل تھا اور اس کے بیرونی برآمدے میں گھوڑے باندھنے کے لیے وسیع و عریض جگہ بنی ہوئی تھی۔ یہ دونوں اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر گئے اور آگے بڑھ کر انہوں نے اپنے گھوڑے کھونٹوں سے باندھ دیئے۔ ابھی تک انہیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کے یہاں آنے کو کچھ لوگوں نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاید اس جگہ کے لوگ اجنبی لوگوں کا اپنی بستی میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس ناپسندیدگی کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں جو یہاں رہ کر ہی پتہ چلائی جا سکتی تھیں۔ قہوہ خانے کے ایک گوشے میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور یہی اس قہوہ خانے کا مالک تھا۔ زیراس نے روتھن کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گیا جہاں قہوہ خانے کا مالک بیٹھا تھا۔

”بزرگ! کیا یہاں مسافروں کے قیام کے لیے جگہ موجود ہے؟“

”ہاں ہر اس مسافر کے لیے جس کی جیب میں چمڑے کے سکے موجود ہوتے ہیں۔ وہ سکے جو پورے ذی آنا میں استعمال کیے جاتے ہیں۔“ جواب میں زیراس نے ایک تھیلی نکال کر بوڑھے کے سامنے کھول دی اور بوڑھے کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔

میں تمہیں یہ بتاؤں نوجوان لڑکے کہ ہم تہذیب کی دنیا سے واپس ہوئے ہیں، ایسی جگہ جہاں تہذیب نہیں ہے۔ جب وادی ذی آنا بلندیوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر آباد تھی اور ہم صحیح معنوں میں برف پر رہنے والوں میں نہیں تھے تو وہاں کا طرز زندگی تمہاری مہذب دنیا کی مانند تھا۔ میں تو خیر تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق طویل ترین عرصہ تک تمہاری دنیا سے رہا ہے اور میں وہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آیا ہوں لیکن اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تہذیب صرف تمہاری غلام رہی ہے تو اپنے ذہن سے یہ احمقانہ خیال نکال دو کیونکہ بہر حال انسان نے ہر جگہ اچھے ہی انداز میں سوچا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض جگہ وسائل نے اس کا ساتھ دیا اور بعض جگہ ایسا نہیں ہو سکا۔ ذی آنا کی وادیوں میں بھی اس وقت وسائل تھے جب ہمارے ساتھ جادوگروں کا تصادم نہیں ہوا تھا لیکن بعد

میں بہت کچھ بگڑ گیا، بہت کچھ خراب ہو گیا۔ میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ خاص قسم کے چمڑے کے ایسے سکے ایجاد کیے گئے جن پر ایک مشترکہ نشان تھا اور اس کے تحت یہ سکے وادی ذی آنا کی ہر آبادی میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور انہیں چیزوں کی خرید و فروخت میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ زیراس نے چمڑے کے سکوں کی ایک تھیلی نکال کر بوڑھے کو دی تو بوڑھے کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ ایک لالچی آدمی ہے۔ اس نے للچائی ہوئی نگاہوں سے ان سکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھلا تمہیں ایک اچھا ٹھکانہ حاصل کرنے میں کیا دقت ہو سکتی ہے؟"

"بظاہر تو کوئی دقت نہیں ہے۔"

"تو پھر آ جاؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور یہ دونوں مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑے۔ لکڑی کی سیڑھی سے گزر کر بوڑھا آدمی انہیں اس راہداری میں لے گیا جو سامنے کی سمت سے گزرتی تھی پھر یہ راہداری دوسری جانب گھوم جاتی تھی اور اس میں تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد بوڑھے نے ایک دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ اس وقت ہماری آبادی تہذیب کی آبادی تھی اور ہم بھی مہذب لوگوں کی مانند زمین کی بلندیوں پر رہتے تھے لیکن پھر اس کے بعد جب ہم نے یہ دیکھا کہ زندگی ہم پر تنگ ہو گئی ہے اور ہم جانوروں کی طرح جینے پر مجبور ہو گئے ہیں تو ہم نے آبادیاں چھوڑ دیں اور برف کی زندگی اپنالی، برف میں رہنا سیکھ لیا ہم نے اور وہی ہمارا مرکز اور مسکن بن گئی۔ ابتدا میں بہت سے لوگ موت سے دوچار ہوئے تھے کیونکہ شدید سردی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی لیکن پھر کچھ ایسے ذہین لوگوں نے ہمیں برف کی دنیا میں رہنے کا راستہ بتایا جو سویڈن، ڈنمارک اور ناروے وغیرہ رہ کر آئے تھے اور اسکیمولینڈ سے واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف یہ اِگلو بنائے گئے بلکہ زیر زمین ایسی جگہیں تلاش کی گئیں جنہیں وسعتوں میں پھیلایا جا سکتا تھا اور یقین کرو تمہاری دنیا کی طرح یہ بھی ایک سائنسی سرزمین ہے کہ یہاں ہوا، پانی اور دوسری تمام ضروریات کا انتظام خود انسانوں نے کیا ہے خیر تو بات ہو رہی تھی زیراس اور روتھن کی۔ بوڑھا انہیں

ایک کمرے میں لے گیا اور بولا۔ "یہ جگہ کشادہ اور تمہارے لیے مناسب ہے اور دیکھو یہاں دو افراد کے رہنے کا انتظام بھی ہے۔ کھانے پینے کا معاوضہ تمہیں الگ دینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ سکے تم اس جگہ کا معاوضہ تصور کرو اور فوراً ہی ہمارے لیے عمدہ قسم کا کھانا تیار کراؤ۔" زیراس نے کہا اور بوڑھا باہر نکل گیا۔ تب زیراس نے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھی بستی ہے۔"

"ہاں۔ ہمیں اس علاقے میں کسی ایسی بستی کی توقع نہیں تھی۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ شمال کی تمام بستیاں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ وحشت خیز ہوتی ہیں اور یہاں تہذیب کا گزر نہیں لیکن اس بستی کے لوگوں نے اسے جنت بنا رکھا ہے۔"

"ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔" زیراس نے پر خیال لہجے میں کہا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بوڑھا ان کے لیے کھانا لے آیا اور بڑی نفاست سے ان کے سامنے کھانا سجاتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد میں تمہیں قہوہ پیش کروں گا۔"

"ہاں۔ ضرور۔ اور سنو ہمارے گھوڑے باہر بندھے ہوئے ہیں ان کی دیکھ بھال بھی تمہاری ذمے داری ہے۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ اس کا بھی تھوڑا بہت معاوضہ تمہیں دینا ہوگا۔"

"لالچی بوڑھے! ہم تو بزرگ کی حیثیت سے تیری عزت کرنا چاہتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ عزت کا مفہوم تیری نگاہوں میں صرف چمڑے کے یہ سکے ہیں۔ کس کس چیز کا معاوضہ تجھے درکار ہوگا۔" روتھن، زیراس کی نسبت ذرا تیز اور سخت مزاج تھا لیکن اس نے دیکھا کہ بوڑھے کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں آئی۔ البتہ اس نے گردن خم کر کے کہا۔

"معاوضہ ہی تو خدمت کا جذبہ پیدا کرتا ہے میرے بچو! اور میں تو صرف خدمت کا معاوضہ چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک تجھے تیری خدمت کا معاوضہ بھی ملے گا۔ ہاں ذرا گھوڑوں کی نگرانی اچھی طرح سے کرنا، مالش وغیرہ بھی ہونی چاہیے۔"

"اطمینان رکھو۔ ایسی مالش کرائی جائے گی کہ گھوڑے شیشے کی مانند چمکنے لگیں گے۔" بوڑھے نے معاوضہ قبول کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ وہاں سے واپسی کے لیے بڑھنے لگا تو روتھن نے کہا۔ "صرف گھوڑے چمکنے چاہئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مالش سے ان کی ہڈیاں چمکنے لگیں۔"

بوڑھا ہنستا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ کھانا بہت عمدہ تھا اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ بستی بے حد پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کا ان دونوں ہی کو احساس تھا۔



بہرحال اچھا خاصا سفر طے کیا گیا تھا چنانچہ وہ دونوں کسی قدر تھکن محسوس کر رہے تھے۔ وہ آرام کرنے لیٹے اور گہری نیند سو گئے۔ جاگے تو سورج پہاڑیوں میں جا چھپا تھا اور فضا میں تاریکیاں ابھر آئی تھیں لیکن آبادیوں کی حیرت انگیز خاموشی بدستور تھی۔ پھر روتھن اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا۔ سامنے بستی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس میں ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ یہ بات اب ان کے لیے شدید حیرت کا باعث بنتی چلی جا رہی تھی۔ روتھن نے زیراس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا رات گزر گئی ہے؟"

"کچھ اندازہ نہیں ہوتا لیکن خاموشی بتاتی ہے کہ رات آدھی کے قریب ہے۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، میں ذرا دیکھتا ہوں۔" روتھن نے کہا اور نیچے پہنچ گیا۔ قہوہ خانہ خالی پڑا ہوا تھا۔ بنچ اور کرسیاں خالی کر دی گئیں تھیں۔ وہ جگہ بھی خالی تھی جہاں قہوہ خانے کا مالک نظر آتا تھا۔ روتھن نے جھلائی ہوئی آواز میں پکارا۔

"او بے وقوف بوڑھے۔ کیا ہمیں رات کا کھانا بھی نہیں ملے گا۔"

جواب میں بوڑھا بے وقوف نیچے ہی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں کھانا کیوں نہیں ملے گا، لیکن کھانا تو جاگنے کے بعد ہی کھایا جاتا ہے نا۔ تم جاؤ میں کھانا لے کر آتا ہوں۔"

روتھن واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد بوڑھا کھانا لے کر آ گیا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" زیراس نے پوچھا۔

"سورج چھپے زیادہ دیر نہیں گزری لیکن یہاں رات ہوگئی ہے۔"

"گویا یہ رات کا ابتدائی حصہ ہے۔"

"تم جس طرح حیرت سے یہ سوال کر رہے ہو، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بستی میں تم پہلی بار آئے ہو۔ ہاں۔ ہماری اس بدنصیب آبادی میں سورج کے ساتھ ساتھ ہی زندگی گھروں میں جا چھپتی ہے لیکن گھروں میں رہنے والے اپنے اپنے گھروں میں جاگ رہے ہوں گے۔ جب سورج چھپ جاتا ہے تو لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔"

"کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔" زیراس نے پوچھا۔

"نہیں وجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ ہماری بستی کا معمول ہے۔"

"اپنی بستی کے بارے میں ہمیں کچھ اور نہیں بتاؤ گے؟"

بوڑھے کے چہرے پر عجیب سی کشمکش پھیل گئی پھر اس نے کہا۔ "بستیاں تو بستیاں ہی ہوتی ہیں لیکن اس بستی کے بارے میں کسی غیر کو کچھ بتایا نہیں جاتا کیونکہ کسی کو اجازت نہیں ہے کہ بستی کی کہانیاں دوسروں کو سنائے۔"

"کس کی اجازت نہیں ہے؟"

"شیر دل نوجوانو! مجھ بوڑھے سے وہ باتیں مت پوچھو جو میرے لیے مشکل کا باعث بن جائیں۔ اگر تم نے یہاں کچھ وقت قیام کیا تو خود ہی جان لو گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔ میں نے تمہارے لیے بالکل تازہ اور عمدہ کھانا تیار کر کے رکھا ہے۔ بات انسان انسان کی ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم تازہ کھانا کھانے والے ہو۔"

بوڑھے نے خوشامدانہ انداز میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ روتھن حیرت سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اسی وقت زیراس کی ہنسی سنائی دی۔

"بڑی پراسرار جگہ ہے اور تو کہتا تھا کہ پراسرار آبادیاں تجھے بے حد پسند ہیں۔ کیوں، کیا کہتا ہے اس آبادی کے بارے میں؟"

"میں اسے پراسرار نہیں کہتا بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ زندوں کی بستی ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہاں زندگی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ تیری نگاہوں میں تو زندگی ان حسین لڑکیوں کی شکل میں تھرکتی پھرتی ہے جو ایسے قہوہ خانوں میں رقص کرتی ہیں۔" زیراس نے کہا لیکن روتھن نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی اور اس کے بعد وہ لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب تک کھانا کھایا جاتا رہا کسی نے کوئی بات نہیں کی البتہ بعد میں روتھن نے کہا۔ "میرے لیے تو یہ جگہ بڑی دلکش اور پراسرار ہے۔ کل دن کی روشنی میں ہم اس بستی کا جائزہ لیں گے۔ مجھے تو یہ لوگ خاصے الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ اب دوبارہ سونے کی کوشش کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں۔"

اور اس کے بعد دونوں پھر اپنے اپنے بستروں پر جا سوئے لیکن دن میں اچھی خاصی نیند لے چکے تھے اس لیے فوراً ہی نیند نہیں آئی۔ البتہ خیالات نے کچھ اس طرح ان پر حملہ کیا تھا کہ وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتے رہے تھے پھر رات کے سناٹے گہرے ہوتے چلے گئے اور یہ بستی ایک قبرستان معلوم ہونے لگی۔ روتھن اپنے بستر پر جاگ رہا تھا لیکن نجانے کیوں ایک گھٹن کا سا احساس ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھا اور اس نے اپنی بغلی سمت کی کھڑکی کھول دی۔ ہلکی سرد ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ جبکہ دوسری طرف زیراس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نجانے کتنا وقت گزرا تھا کہ دفعتاً روتھن کے کانوں میں ایک آواز پڑی اور وہ چونک پڑا۔ اگر اس کی سماعت نے دھوکا نہیں کھایا تھا تو یہ گھنگھروؤں کی جھنکار اور ڈھول کی آواز تھی جو اس کی کھلی ہوئی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ روتھن چونک پڑا۔ کچھ دیر پہلے زیراس سے اس سلسلے میں بات چیت ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال باطل ہو گیا تھا کہ اس بستی میں زندگی نہیں ہے۔ روتھن کچھ دیر تک اس آواز کو سنتا رہا۔ ڈھول کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے ساز بھی بج رہے تھے لیکن ان کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کھڑا ہوا اور اس نے باہر ایک نگاہ ڈالی۔ نیچے بستی میں سناٹا طاری تھا اور اب تو پوری بستی تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا مکانات سے ہی روشنی کی کوئی کرن نظر آ جاتی تھی لیکن کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ڈھولک کی تھاپ اور ایک عجیب وغریب آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ روتھن نے

سوچا کہ بستی کے کسی دور دراز حصے میں شاید کوئی جشن کا سلسلہ ہے۔ وہ خاموشی سے وہیں کھڑا رہا۔ نیند کی کوئی پرچھائیں اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا پھر اس نے گردن گھما کر زیراس کو دیکھا۔ زیراس ذرا مختلف قسم کا آدمی تھا۔ بظاہر یہ لگ رہا تھا جیسے وہ بے حد گہری نیند سو رہا ہو۔ کیوں نہ اس جشن کو قریب سے دیکھا جائے۔ اس طرح کم از کم اس بستی کے لوگوں سے ہی واقفیت ہو گی۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ آیا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ زیراس کو جگانا بے مقصد ہی تھا لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا کہ زیراس اتنی گہری نیند سو رہا ہے۔ اچانک ہی اس کی آواز ابھری۔ ''کیا بات ہے، نیند نہیں آ رہی؟''

''ہاں نیند نہیں آ رہی لیکن کیا تم نے اس آواز کو سنا؟''

''کیسی آواز؟''

''گھنگھروؤں کی جھنکار ہے اور اس کے ساتھ سازوں کی آواز بھی ابھر رہی ہے۔ لگتا ہے بستی کے کسی دور دراز گوشے میں کوئی جشن برپا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا خیال ہے چلیں۔'' روتھن نے پوچھا۔

''نہیں۔ میری عقل ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اس تاریک اور اجنبی جگہ پر کہیں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ویسے جہاں تک رقص وغیرہ کا معاملہ ہے تو تو جانتا ہے کہ مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ اس بات پر مجھے تعجب ہے کہ سورج چھپے نیند کی آغوش میں پہنچ جانے والے بستی کے کون سے حصے میں جاگ رہے ہیں۔''

''یہ ساری باتیں تو یہیں بستر پر لیٹے لیٹے پوچھ لے گا؟''

''ہاں۔ اور تجھے مشورہ دوں گا کہ کھڑکی بند کر اور آرام سے گہری نیند سو جا۔'' زیراس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تو اپنی مرضی کا مالک ہے۔ میں اپنے طور پر دیکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے دفع ہو جا۔'' زیراس نے کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

روتھن اسے گھورتا رہا اور پھر اس نے کارتوسوں کی پیٹی گلے میں ڈالی۔ بندوق ہاتھ میں

پکڑی اور باہر نکل آیا۔ راہداری سے نیچے جانے والے زینے سے اتر کر اس قہوہ خانے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ باہر کی فضا میں اندر کی نسبت کچھ زیادہ ٹھنڈک تھی۔ روتھن کا گھوڑا اپنے مالک کی آہٹ پہچان کر ناک سے آوازیں نکالنے لگا تو روتھن نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھولیں اور پھر اس کی پشت پر سوار ہو کر گھوڑے کو اس سمت دوڑانے لگا جدھر سے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دن کی روشنی میں بستی اچھی طرح نہیں دیکھی جا سکی تھی لیکن ہوا کے دوش پر رقص کی آوازیں اس کی رہنمائی کر رہی تھیں اور وہ آوازوں کی سمت بڑھا جا رہا تھا۔ گھوڑا آہستہ آہستہ بستی کے آخری سرے کی جانب چل پڑا۔ حیرت اس بات کی تھی کہ بستی کے گھروں سے کسی بچے کے رونے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہر سو مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ رقص کی آواز بھی مسلسل نہیں آ رہی تھی۔ بس جب ہوا کے جھونکے کا رخ اس طرف ہوتا تو گھنگھروؤں کی جھنکار اور سازوں کی آواز ایسا لگتا تھا جیسے بالکل قریب آ کر گزر گئی ہو۔ کہیں کتے تک نہیں بھونک رہے تھے۔ روتھن ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو کر آگے بڑھتا رہا اور آخر کار بستی کا آخری مکان بھی پیچھے رہ گیا۔ اس کا گھوڑا اس لق و دق میدان میں آہستہ روی سے چل رہا تھا۔ تاریکی میں ڈوبے ہوئے درخت سر جھکائے کھڑے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے جنگل بھی گہری نیند سو رہا ہو۔ کھلی جگہ میں آنے کے بعد یہ آوازیں کچھ زیادہ محسوس ہونے لگیں۔ روتھن نے گھوڑے کی رفتار کچھ کم کر دی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک بلندی سی جگہ پہنچ گیا اور اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں تب اسے اپنے بائیں سمت ڈھلان پر ایک مدھم سی روشنی دکھائی دی اور روتھن نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے بستی کے لوگوں کے بارے میں سوچا کہ تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ اپنے گھروں کو تاریک کر دیتے ہیں اور کھلے میدانوں میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ بہرحال گھوڑے کا رخ تبدیل ہو گیا اور وہ مدھم روشنی کی سمت چل پڑا۔ اس نے اب گھوڑے کی رفتار کسی حد تک تیز کر دی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں ہموار زمین نظر آ رہی تھی چنانچہ گھوڑے کو بھی آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ روتھن روشنی پر نگاہیں جمائے اس سمت جا رہا تھا۔ روشنی کے آس پاس درختوں کے جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے اور یہیں یہ رقص کی محفل جمی ہوئی تھی۔ روتھن کے گھوڑے کی رفتار

اچھی خاصی تیز ہوگئی اور وہ تھوڑی دیر بعد ان درختوں کے پاس پہنچ گیا جہاں روشنی ہو رہی تھی لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ کچھ اس طرح کا اندازہ ہوا تھا اسے جیسے روشنی ان درختوں کے پاس ہو لیکن درختوں کے قریب آ کر اسے احساس ہوا کہ یہ تو اس کا وہم تھا۔ روشنی اب بھی درختوں سے کافی فاصلے پر تھی۔ اس نے عجیب سے انداز میں گردن جھٹکی اور گھوڑے کو ایک بار پھر تیز رفتاری سے آگے دوڑا دیا۔ سازوں کی آواز بہت عجیب تھی اور بڑی دلکش بھی تھی۔ ان سازوں میں کسی رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار شامل تھی۔ ڈھولک کی تھاپ یہ بتا رہی تھی کہ ساز بجانے والے اپنے فن کے ماہر ہیں۔ روتھن روشنی پر نگاہیں جمائے آگے بڑھتا رہا لیکن اچانک ہی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا اور وہ ٹھٹک گیا۔ اب پہلی بار اسے اس کا اندازہ ہوا تھا کہ یہ روشنی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ بستی اب اتنی پیچھے رہ گئی تھی کہ اب اس کے دھندلے نقوش بھی واضح نہیں تھے لیکن روشنی ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی۔ روتھن حیران ہو گیا اور پھر اس کی رگ تجسس پھڑکی۔ اس نے سوچا کہ آخر بستی سے اتنے فاصلے پر یہ جشن منانے والے کون ہیں۔ کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔ ممکن ہے ان کا تعلق اس بستی سے نہ ہو۔ وہ اور آگے بڑھا۔

اچانک اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں لیکن دور دور تک گہری خاموشی اور سناٹا تھا۔ پیچھے سے آنے والی آواز کا راز اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے پلٹ کر روشنی کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ روشنی اب وہاں نہیں تھی لیکن سازوں کی جھنکار مسلسل ابھر رہی تھی۔ اچانک ہی روتھن کو احساس ہوا کہ یہ کچھ اور ہی صورت حال ہے۔ یہ بات پہلے ہی پتہ چل چکی تھی کہ یہ طلسمی بستی تھی اور یہ علاقے صحرائے افسوں کہلاتے تھے۔ یہاں کی کہانیاں بڑی عجیب و غریب ہوا کرتی تھیں اور وہ انہی کہانیوں کی تلاش میں اس طرف آئے تھے۔

تو کیا یہ گھنگروؤں کی جھنکار اور سازوں کی آواز کوئی فریب ہے؟ صحرا کے اس فریب میں جکڑ کر وہ بستی سے اتنی دور نکل آیا تھا اور اب عقل کا تقاضا یہی تھا کہ واپس بستی کی جانب نکل پڑے۔ چنانچہ اس نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد گھوڑے کا رخ تبدیل کیا اور اسی وقت سازوں کی آواز بلند ہوگئی۔ اس بار اسے روشنی اپنے داہنے ہاتھ پر زیادہ سے

زیادہ دو سو قدم کے فاصلے پر نظر آئی۔ اس روشنی میں کچھ سائے بھی متحرک تھے اور روتھن کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ صحرا کا فریب ہے اور اس میں کوئی پراسرار کہانی چھپی ہوئی ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہی تھا کہ واپس سیدھا بستی کی طرف چلا جائے اور خاموشی سے اپنی قیام گاہ میں پہنچ جائے۔ دن کی روشنی میں اس روشنی کی کہانی کے متعلق معلوم کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔ اس نے ایک بار پھر قدم آگے بڑھائے کہ دفعتاً اس کا گھوڑا الف ہو گیا۔ اگر وہ ماہر شہسوار نہ ہوتا تو گھوڑے کی پشت سے گر پڑتا لیکن بہرحال گھوڑے کی پیٹھ سے اترنا پڑا کیونکہ گھوڑا الف ہونے کے بعد سر کے بل زمین پر آیا تھا اور روتھن نے پھرتی سے اس کی پیٹھ سے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی تھی۔ گھوڑے کا سر زمین سے ٹکرایا اور پھر وہ الٹ گیا۔ روتھن ایک لمحے کے لیے بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ گھوڑے کی یہ کیفیت کیسے ہوئی لیکن پھر اس نے گھوڑے کو کھر رگڑ رگڑ کر زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس کی گردن کے عین نیچے سے خون کا فوارہ پھوٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ روتھن اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی کہ گھوڑے کی گولی لگی ہے لیکن نہ تو کوئی فائر کی آواز ہوئی تھی اور نہ کہیں سے رائفل کی چنگاری نظر آئی تھی۔ اس کے باوجود روتھن فطری پھرتی سے کام لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ خاموش ہتھیاروں سے چلائی جانے والی گولیاں کسی بھی سمت سے آ کر اسے چاٹ سکتی تھیں اور اب روتھن کو یقین ہو گیا تھا کہ ضرور کوئی بڑی گڑ بڑ ہے۔ اس نے فوراً ہی وہ جگہ چھوڑ دی جہاں گھوڑے سے کودا تھا اور ہاتھوں اور پیروں سے رینگتا ہوا پھرتی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ایسی چٹان کی آڑ لے جہاں گولیوں سے محفوظ رہا جا سکے اور اس کے بعد یہ جائزہ لینے کی کوشش کرے کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ آخر کار وہ تیزی سے ایک چٹان کے عقب میں پہنچ گیا اور یہاں رک کر گہری گہری سانس لینے لگا پھر دفعتاً ہی اسے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور روتھن اس طرف دیکھنے لگا۔ کوئی اس کے بائیں سمت سے دوڑتا ہوا ایک طرف گیا تھا اور آوازیں ایک سے زیادہ انسانوں کے دوڑنے کی تھیں۔ روتھن کا سانس رک گیا تھا پھر اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ایک اور چٹان کو تاک لیا۔ وہ دوڑ کر اس چٹان کی آڑ میں جا پہنچا۔ ایک بار پھر اسے آوازیں سنائی دیں لیکن اس

بار یہ آوازیں دوڑتے قدموں کی نہیں تھی بلکہ کچھ انسانوں کی سرگوشیاں تھیں۔ یہ سرگوشیاں ان درختوں کی سمت سے آ رہی تھیں جو اس سے بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ روتھن کے ہونٹ بھنچ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور درختوں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کوئی عجیب سی شے اس پر آ پڑی ہو۔ نرم اور لچکدار۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکل گئی اور وہ خلا میں اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کتنا اونچا اٹھا ہے۔ اچانک ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ غالباً کوئی ضرب لگی تھی جس نے اس کے حواس چھین لیے اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے تاروں کو گنتا ہوا وہ تاریکی کی آغوش میں پہنچ گیا جہاں چاروں طرف گہرا اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔



"میری کہانی تمہارے لیے اکتاہٹ کا باعث تو نہیں بن رہی میرے نوجوان دوست۔ اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں اپنے غم کی کہانی نہیں سناؤں گا۔" اس نے کہا اور میں ایک دم چونک پڑا۔ بہت سی کہانیاں تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھی تھیں لیکن ایک اور ادیب سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ یہ شخص جو کچھ سنا رہا تھا وہ میرے لیے بے حد سنسنی خیز تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں اور صحراؤں کی سرزمین سحر میرے لیے نجانے کون کون سی دنیا کے دروازے کھول رہی تھی اور میں ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ ذی آنا کی یہ وادی یقینی طور پر انتہائی پراسرار ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں پرشیانہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ روتھن اور زیراس بھی میرے لیے قابلِ توجہ تھے۔ بقول اس شخص کے کہ روتھن اس کا اپنا بیٹا تھا، پرشیانہ کا بھائی اور زیراس اس آبادی کے سردار بارلس کا بیٹا۔ یہ سارا کھیل کیسے ہوا اور اس کے علاوہ ایک بات اور بھی میرے ذہن میں مسلسل چکراتی رہتی تھی۔ پرشیانہ نے بھی کہا تھا کہ یہ لوگ میری پذیرائی بلا وجہ نہیں کر رہے بلکہ ایک اہم ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ذمہ داری کیا تھی، یہ میرے لیے ناقابلِ فہم سی بات تھی لیکن بہرحال ان ساری باتوں میں دلکشی ضرور تھی اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"معزز بزرگ شی وش میں آپ کی باتیں پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں۔ براہ کرم اس کہانی کو سناتے رہیے۔ میں مکمل تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔" بوڑھے نے گردن ہلائی اور دیر تک خلا میں دیکھتا رہا جیسے آگے کے واقعات کو وہ خلاؤں میں تلاش کر رہا ہو۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

ادھر روتھن کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے تھے اور دوسری طرف اس کے جانے کے بعد زیراس گہری نیند سو گیا تھا لیکن نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب اسے رات کے واقعات یاد آئے تو اس کی نگاہیں روتھن کے بستر کی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے دیکھا کہ روتھن کا بستر خالی ہے لیکن اس وقت اسے کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ روتھن شاید جلدی جاگ گیا ہے۔ بہرحال اس نے منہ ہاتھ وغیرہ دھویا اور اسی وقت بوڑھا ہاتھوں میں ناشتے کا سامان لئے اندر آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو زیراس نے اس سے سوال کر لیا۔

"میرا ساتھی کیا نیچے موجود ہے؟"

"بالکل نہیں۔ نیچے تو وہ آیا ہی نہیں۔" دفعتاً ہی زیراس کو رات کے واقعات یاد آئے۔ ڈھول کی آواز، اس پر روتھن کی بے چینی۔ دوسرے لمحے وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ "ذرا تم اس کا گھوڑا دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ اس کا گھوڑا موجود ہے؟"

بوڑھا حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "کیا رات کے کسی حصے میں وہ باہر نکلا تھا؟ آہا مجھے یاد آیا کہ باہر کا دروازہ بھی مجھے کھلا ہوا ملا تھا۔ میں ایک منٹ ابھی دیکھتا ہوں کہ اس کا گھوڑا موجود ہے کہ نہیں۔"

زیراس کو احساس ہونے لگا کہ روتھن یقیناً ان جھنکاروں کی جانب دوڑ پڑا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی نقصان پہنچ گیا ہو۔ ساری رات گزر گئی تھی اگر وہ رقص دیکھنے دوڑ بھی پڑا تھا تو اسے واپس بھی آ جانا چاہیے تھا۔ چنانچہ زیراس بے چین ہو کر نیچے اتر آیا۔ جب وہ راہداری میں پہنچا تو قہوہ خانے کے بڑے ہال نما حصے میں اس نے بہت سی میزوں کو بھرے ہوئے دیکھا۔ لوگ کھانے پینے سے شغل کر رہے تھے۔ ایک انتہائی قوی ہیکل آدمی قہوے کے برتن سامنے رکھے قہوہ پی رہا تھا۔ اس کی شخصیت بے حد گھناؤنی تھی اور جسامت بے شک بہت زیادہ لیکن بے ڈھنگی سی، بڑھی ہوئی ڈاڑھی بھنوؤں کے بال تک پپوٹوں پر گرے ہوئے تھے۔ سر کے بال بے حد لمبے اور بے ترتیب' آنکھوں میں غلاظت جمی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے مہینوں سے اپنے چہرے پر پانی کا چھینٹا بھی نہ ڈالا ہو۔ بہرحال زیراس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اندر پہنچا تو تقریباً تمام ہی

نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ قہوہ خانے کا بوڑھا مالک جو شاید دروازے کے باہر روتھن کے گھوڑے کو دیکھنے گیا تھا، اندر داخل ہوا اور بولا۔ "نہیں، تمہارے ساتھی کا گھوڑا موجود نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر کہیں گیا ہے۔"

"لیکن وہ کہاں جا سکتا ہے؟" زیراس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بھلا مجھے کیا معلوم!"

"ایک بات بتاؤ رات کو ناچ گانے کی محفل کہاں جمی تھی، بستی کے کون سے حصے میں جشن برپا ہوا تھا؟" زیراس کے اس سوال کو دوسرے لوگوں نے بھی سنا تھا اور چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ قہوہ خانے کے بوڑھے مالک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کے آثار نظر آئے۔ اس نے مدہم لہجے میں کہا۔ "کیا بات کرتے ہو؟ یہاں تو ایک عرصہ ہو گیا۔ بھلا ناچ گانے کی محفل کون برپا کرے گا۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے جب یہاں بھی کبھی زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔"

"لیکن میں نے خود اپنے کانوں سے ڈھول اور ساز بجنے کی آوازیں سنیں تھیں۔ وہ ہوا کے دوش پر آ رہی تھیں اور اس میں گھنگروؤں کی جھنکار بھی شامل تھی۔"

"اور تمہارا وہ ساتھی ناچ رنگ دیکھنے کے لیے دوڑا چلا گیا تھا۔" یہ الفاظ اسی بے ڈھنگے اور بے ترتیب شخص نے کہے تھے۔ اس کے انداز میں مذاق اڑانے کی سی کیفیت تھی اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے گردن ہلا ہلا کر بطخ جیسی آوازیں اپنے حلق سے نکالنے لگا۔ شاید وہ ہنس رہا تھا۔ زیراس نے اس کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

بے ڈھنگے شخص نے زیراس کی بات کا جواب دیئے بغیر سامنے رکھا ہوا قہوے کا بڑا برتن اٹھایا تو زیراس نے ہاتھ بڑھا کر اسے قہوہ پینے سے روک دیا۔ "میں نے پوچھا تھا تمہارے ہنسنے کا مطلب کیا ہے؟"

"صاف مطلب ہے۔ جاؤ کسی ویرانے میں اپنے ساتھی کی لاش تلاش کر لو۔"

جواب میں زیراس کا الٹا ہاتھ گھوم گیا، لیکن قہوہ پینے والا شخص پیچھے ہٹ گیا اور زیراس کا وار خالی گیا۔ وہ خونی نگاہوں سے قوی ہیکل آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ قوی ہیکل آدمی

نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد زیراس سے کوئی ایک فٹ اونچا نکلتا تھا حالانکہ زیراس ایک دراز قد آدمی تھا لیکن سامنے والے کے شانے زیراس کے شانوں کے مقابلے میں بہت چوڑے تھے۔ اس کی غلیظ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے خون کے آثار نظر آئے تھے لیکن پھر اچانک ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ آہستہ آہستہ واپس آ کر اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اس نے پھر اپنے برتن کی جانب ہاتھ بڑھائے لیکن زیراس نے ایک بار پھر اس کا قہوے کا برتن پیچھے سرکا دیا۔

"میرے سوال کا جواب دیئے بغیر تم قہوہ نہیں پی سکتے۔" زیراس غرایا۔

"جواب تو تجھے یہ سب لوگ دے سکتے ہیں۔ ان سب سے پوچھ لے۔ میں اکیلا ہی تو نہیں ہوں' صحراؤں میں ابھرنے والی ناچ گانے اور گھنگروؤں کی جھنکار موت کی دعوت ہوتی ہے اور اس دعوت پر ایک قدم آگے بڑھانے والا اپنی موت کی جانب پہلا قدم بڑھا دیتا ہے۔ آج تک یہی ہوا ہے اور یہ فرض اس بوڑھے پاگل کا تھا جو اس قہوہ خانے کا مالک ہے کہ تمہیں اس بات سے آگاہ کرتا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی۔"

"لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" زیراس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سنو۔ مم.......... میں تمہیں سمجھاتا ہوں، مگر قصور میرا بھی تو نہیں ہے۔ تمہیں میرے اس قہوہ خانے میں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ رات ہی کے وقت تو تم آئے تھے اور تم نے مجھ سے قیام کے لیے جگہ مانگی۔ پھر اس کی گنجائش کہاں تھی کہ میں تمہیں یہاں کی پراسرار باتوں سے آگاہ کرتا اور نہ ہی کسی وقت اور دن کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ کب ویرانوں سے سازوں کی آوازیں ابھریں گی اور کوئی اجنبی ان کے درمیان پہنچ کر ان کا شکار ہو جائے گا۔ یہ آوازیں تو کبھی کبھی ابھرتی ہیں اور ہماری بستی میں انہیں موت کی آواز کہا جاتا ہے۔ بستی والے اگر یہ آواز سن لیں تو اپنے کھلے دروازے بند کر لیتے ہیں اور اپنے بچوں کو خاموش ہو کر سو جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ان آوازوں کو سننے کے بعد بھلا کسی کی مجال ہے کہ اپنے دروازے سے باہر قدم رکھے اور یہ تاریخ کا ایک حصہ ہے کہ جس نے بھی ایسا کیا اسے موت نے آ دبوچا۔ مگر تم بتاؤ میرا کیا قصور ہے؟ کیا مجھے یہ بات معلوم تھی کہ رات کو یہ آوازیں سنائی دیں گی؟"

زیراس کا چہرہ کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں تم لوگوں کی کسی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ میرا ساتھی واپس آ جانا چاہیے ورنہ میں جو تباہی پھیلاؤں گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

اس کی غراہٹ نے یہاں موجود لوگوں کو ایک دم خوفزدہ کر دیا تھا۔ بہرحال زیراس واقعی روتھن کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ رات کی کہانی اب اس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ روتھن نے اسے جگا کر رقص کی اس محفل میں شرکت کے لیے کہا تھا اور زیراس نے انکار کر دیا اور پھر اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ روتھن وہاں سے چلا گیا ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جو باعث پریشانی ہوتی۔ اس کا خیال تھا کہ ناچ رنگ کی محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد روتھن واپس آ جائے گا لیکن اب یہ لوگ عجیب وغریب کہانیاں سنا رہے تھے جنہوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ بہرحال وہ باہر نکل آیا اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھولیں اور اس پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوا سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی لمبے چوڑے قد و قامت کا آدمی تھا جو وہاں قہوہ پی رہا تھا اور اس سے زیراس کی تھوڑی سی ٹسل ہو گئی تھی۔ زیراس اپنا گھوڑا آگے بڑھاتا رہا، لمبے چوڑے آدمی نے اس سے کوئی پچاس قدم کا فاصلہ رکھا تھا اور اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ وہ اسی کے پیچھے آ رہا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زیراس اس وقت صرف اور صرف روتھن کے لیے پریشان تھا۔ وہ بستی کے آخری سرے تک نکل آیا۔ کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس سمت گیا ہو گا۔ لوگوں کی زبانی جو کہانیاں اس نے سنی تھیں، انہوں نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ آخرکار بستی پیچھے رہ گئی لیکن قوی ہیکل آدمی بدستور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا تب زیراس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن اس نے محسوس کیا کہ دوسرا آدمی اس کے پاس آنے سے کترا رہا ہے۔

مجبوراً زیراس نے ہاتھ اٹھا کر اسے پکارا۔ "او لمبے، بے وقوف کے بچے جب میرا پیچھا کر رہا ہے تو مجھ سے ڈر کیوں رہا ہے؟ قریب آ جا۔"

قوی ہیکل آدمی نے اپنے گھوڑے کا رخ اس کی جانب کر دیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس کے قریب پہنچ گیا۔ زیراس اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ قوی ہیکل آدمی اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''میرا نام ہیرک ہے۔ میں اس بستی میں رہتا ہوں لیکن تیرا مجھ پہ غصہ بیکار تھا۔ بھلا ان تمام باتوں سے میرا کیا تعلق! میں نے تو وہ بات تجھ سے کہی تھی جو حقیقت پر مبنی ہے۔ میرے علاوہ بھی تو اگر کسی سے یہ سوال کرتا تو وہ یہی جواب دیتا تجھے۔''

''لیکن ہیرک یہ ساری کہانی میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔'' زیراس نے دوستانہ لہجہ اختیار کیا تھا۔

ہیرک نے کہا۔ ''یہ کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اس آبادی کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ جب صحرا میں رقص کی دیوی حالتِ رقص میں ہوتی ہے تو چاروں طرف موت کے بگولے چکراتے رہتے ہیں اور کوئی بھی گھنگھروؤں کی اس جھنکار کو تلاش کرنے نکل پڑے تو کبھی واپس نہیں آتا۔ ایسا بہت بار ہو چکا ہے اور سب جانتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ تجسس کے مارے اپنے گھروں کے دروازوں پر آ کھڑے ہوئے۔ صبح کو ان کی لاشیں ان کے دروازوں پر اکڑی ہوئی ملیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان کی موت کی وجہ کیا تھی۔ نہ ان کے جسموں پر زخم ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ دم گھٹنے سے مرتے ہیں لیکن وہ مردہ ہوتے ہیں اور ایسے بہت سے لوگ ایسی موت کا شکار ہو چکے ہیں۔''

''تعجب کی بات ہے کیا بستی کے لوگوں نے یہ معلوم نہیں کرنا چاہا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' زیراس نے پوچھا۔

''بستی میں کوئی بھی اتنا دلیر نہیں ہے۔ بڑے بڑے دلیروں نے یہ بات معلوم کرنے کے لیے متعدد منصوبے بنائے اور ان کے اہل خانہ آج تک ان کو روتے ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر انہوں نے کیا دیکھا۔''

''اوہ واقعی یہ تو بڑی حیران کن بات ہے۔'' زیراس نے کہا اور مزید پریشان ہو گیا کیونکہ اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ روتھن اسی رقص کو دیکھنے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ زندہ ہے یا مردہ اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔

ہیرک اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''اوہو۔ وہ دیکھو اس طرف دیکھو۔ وہ ایک سیاہ دھبہ نظر آ رہا ہے۔ میری آنکھیں ان علاقوں کو پوری طرح جانتی ہیں۔ یہاں کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں موجود ہے۔ وہ دھبہ میرے لیے اجنبی ہے۔ آؤ ذرا ادھر چلتے ہیں دیکھیں کیا ہے وہ۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھوڑے کو اس سمت موڑ دیا۔ زیراس نے فوراً اس کا تعاقب کیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں گھوڑے کی اس لاش کے پاس پہنچ گئے جس کی گردن کے نیچے ایک گہرا سوراخ بنا ہوا تھا اور اس سوراخ سے نکلا ہوا خون گھوڑے کے بدن پر جگہ جگہ جم گیا تھا۔ یہ پہچاننے میں زیراس کو ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ یہ روتھن ہی کا گھوڑا ہے۔ گھوڑے کو اس کیفیت میں دیکھ کر زیراس کی پریشانی اور بڑھ گئی اور وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ خون اترتا آ رہا تھا۔ گھوڑے کی موت اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ خود روتھن بھی کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے، لیکن کیسا حادثہ! دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا پھر زیراس کی نگاہیں ہیرک پر جم گئیں جو خود بھی گھوڑے سے نیچے اتر کر چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ ہاتھوں اور پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تجسس کے آثار تھے۔ زیراس نے دیکھا کہ وہ ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا ایک سمت بڑھتا چلا رہا ہے۔ اس وقت اس کا انداز بڑا عجیب سا تھا۔ وہ اس طرف سے چلتا ہوا کافی دور نکل گیا اور دفعتاً ہی زیراس نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اسے شبہ ہوا کہ یہ قوی ہیکل آدمی دھوکہ دے کر نکل بھاگنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ زیراس کی گہری نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گیا کہ اگر یہ شخص اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو وہ فوراً اس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لے۔ ہیرک چلتا چلتا درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں اس نے رک کر فضاؤں میں کچھ سونگھا اور پھر اس کی عجیب سی آواز ابھری۔ ''ہے ہے ادھر آؤ۔''

زیراس بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہیرک نے کہا۔ ''جو کوئی بھی اس گھوڑے پر سوار تھا وہ یہاں تک آیا تھا اور پھر یہاں سے آگے نہیں گیا۔''

"مطلب؟"

"مطلب...... مطلب کچھ نہیں۔ اگر کھوپڑی کام کرتی ہے تو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ایک بار کے بعد دوبارہ کوئی بات نہیں کہتا۔"

زیراس نے جھلا کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر تمہاری اس بستی میں میرے ساتھی کو کوئی نقصان پہنچا تو یہ بستی صرف اور صرف کھنڈر نظر آئے گی۔ یہ بات ذہن میں رکھنا، میرا نام زیراس ہے۔"

ہیرک نے آنکھیں سکیڑ کر زیراس کو دیکھا اور پھر ہنسنے لگا۔ زیراس نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔ ہیرک بولا۔ "بہادر! اس بستی کے لوگوں کو تو نجانے کب سے کسی ایسے شخص کا انتظار ہے جو اسے کھنڈر بنا دے۔ تیرے جیسی بیوقوفی کی باتیں بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن کوئی عمل کر کے نہیں دکھاتا یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لے کہ تیرے ساتھی کو نقصان پہنچ چکا ہے اور میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی لاش یہیں کسی ویرانے میں پڑی ہوگی۔ تو اگر چاہے تو اسے تلاش کر سکتا ہے اور میں اس سے زیادہ تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

زیراس کا سر چکرا گیا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور سرد لہجے میں بولا۔ "اس بستی کے بارے میں مجھے پوری تفصیل بتا ہیرک۔"

"ہاں...... ہاں...... ضرور...... ضرور۔ ویسے میں تجھے ایک نام بتاؤں، اگر تو اس سے مل لے تو یہ سمجھ لے کہ تیرا کام آسان ہو جائے گا۔"

"وہ کون ہے؟"

"سیمون! سیمون تیری مشکلات کا حل بن سکتی ہے۔"

"یہ کون ہے؟"

"یوں سمجھ لے یہ تیری آخری امید ہوگی۔"

"کیا وہ کوئی عورت ہے؟"

"ہاں، تو اسے بستی کی سردار سمجھ سکتا ہے۔"

"اس بستی کی سردار کوئی عورت ہے؟"

"اب تو یہ سوال کرے گا کہ اس بستی کی سردار عورت کیوں ہے؟"

"ذہن میں تو یہی بات آتی ہے۔"

"ذہن تیرا ہے میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن ان بیوقوفی کے سوالوں سے تجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"دیکھ میرے سامنے فضول باتیں مت کر، جب تک میرا ساتھی نہیں مل جاتا میرا دماغ میرے قابو میں نہیں آ سکتا۔" زیراس نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"اور مجھ بے وقوف کو دیکھ جو بلاوجہ ہی تیرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ مگر کیا کروں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ کسی بھی پریشان شخص کو دیکھ کر میرے دل میں ہمدردی کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ پھر میں پکڑا جاتا ہوں، الٹا لٹکا دیا جاتا ہوں اور میرے جسم پر کوڑے مارے جاتے ہیں تو یقین کر ہفتوں زخمی رہتا ہوں میں۔ میرے زخموں سے خون رستا رہتا ہے۔ مگر انسان عادت سے مجبور رہتا ہے۔ بس اب یہ عادت ہے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں تجھ سے، کیا سمجھا؟"

"مجھے سیمون کے بارے میں بتا۔"

"اسے بھی سب جانتے ہیں۔ جس سے پوچھے گا اس کا پتہ بتا دے گا۔ میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ اب یہاں رک کر تیری فضول باتیں سنوں اور تجھے تیری فضول باتوں کا جواب دوں۔" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ زیراس خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہیرک اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور اس پر سوار ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گھوڑا زیراس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تب اسے ہیرک کے الفاظ یاد آئے اور وہ پریشانیوں کا شکار ہو گیا۔ آہ...... اگر اس کا ساتھی روتھن ہلاک ہو گیا ہے تو یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا نقصان ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد زندگی کس انداز میں گزرے۔ لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو کس نے ایسا کیا ہے۔ کیا اس سلسلے میں سیمون واقعی کچھ بتا سکتی ہے؟ سیمون۔ بستی کی سردار۔ اس نے سوچا اور عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ پھر اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔ "واقعی پاگلوں کی بستی ہے یہ۔ وادی سحر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔"

دیر تک وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے جوتے اتارے اور ایک اونچے درخت پر چڑھنے لگا۔ درخت کی ایک اونچی شاخ پر پہنچ کر اس نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں لیکن کوئی ایسا نشان، کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے روتھن کا کچھ نشان ملتا۔ اس نے سوچا کہ اگر گھوڑے کے ساتھ روتھن کو ہلاک کر دیا گیا ہے تو اصولی طور پر اس کی لاش بھی کہیں آس پاس ہی ہونی چاہیے لیکن لاش کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً ہی اس کے ذہن کو ایک سکون کا سا احساس ہوا۔ روتھن کا ماضی اس کے ذہن میں آیا۔ اسے مار لینا اتنا آسان نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے گھوڑے کو ہلاک کرنے والوں نے اس کو بھی نشانہ بنایا ہو لیکن روتھن آسانی سے کسی کا شکار نہیں بن سکتا۔ یہ سوچ کر اسے خاصا سکون ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ درخت سے اترا اور اپنے گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ اب بستی واپس جا کر سیمون کے بارے میں معلوم کرنا ضروری تھا۔ ویسے وہ شخص جس کا نام ہیرک تھا، خاصا پراسرار آدمی تھا اور اس نے جو نشاندہی کی تھی وہ غور کے قابل تھی۔ یقیناً سیمون اس بارے میں کوئی اہمیت رکھتی ہے اور شاید یہ بتا سکتی ہے کہ روتھن کو ہلاک کرنے کی کوشش کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔ ویسے واقعی یہ انتہائی پراسرار بستی تھی۔ حالانکہ جس طرح سے اس نے اس بستی کے مکانات اور ان کے طرز تعمیر دیکھا تھا، اس سے اسے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ ذی آنا کی اچھی آبادیوں میں سے ہے لیکن وہی بات یہاں بھی موجود تھی یعنی یہ کہ یہ پراسرار کہانیوں کا تذکرہ ضرور کر سکتے تھے لیکن اپنی تہذیب کے ہاتھوں بزدل ہو چکے تھے اور کسی سے جنگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ خود زیراس نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور شخص کا گریبان پکڑ لیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

اس کا گھوڑا بستی کی جانب چل پڑا اور وہ تیز رفتاری سے بستی کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت سے ایسے مسائل تھے جو غور طلب تھے لیکن اس وقت زیراس کو کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ البتہ یہ فیصلہ اس نے اپنے دل میں ضرور کر لیا تھا کہ وہ بستی کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ بستی میں داخل ہوا تو زندگی کو اسی انداز میں رواں دواں دیکھا جیسی چھوڑ کر گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ دکانیں اور بازار

کھل رہے تھے اور ان میں ہر طرح کی چیزیں پائی جاتی تھیں۔ کسی نے بھی اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ زیراس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر بستی کا ایک چکر لگایا اور اس طرف چل پڑا جہاں اس کا قیام تھا۔ صبح اس نے جس طرح اس قہوہ خانے کو آباد دیکھا تھا اب وہاں ویسی رونق نہیں تھی۔ البتہ اپنی مخصوص جگہ بیٹھا ہوا ہیرک قہوہ پی رہا تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ قہوہ خانے کا بوڑھا مالک بھی اپنی جگہ موجود تھا اور اس نے زیراس کو دیکھ کر پلکیں جھپکائی تھیں۔ زیراس آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔ ”مجھے میرا ساتھی نہیں ملا لیکن تو یہ سوچ لے کہ اگر واقعی وہ نہ ملا تو تیرا یہ قہوہ خانہ راکھ اور مٹی کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔“ بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا تو تب زیراس نے اپنا چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سیمون کون ہے؟“

”سس......سیمون کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں‘ وہ جو اس کونے میں شخص بیٹھا ہے، اس کا کہنا ہے کہ سیمون اس بستی کی سردار ہے اور وہ میرے ساتھی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے۔“

بوڑھا پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ہاں‘ یہ ایک سچائی ہے کہ اگر یہاں کوئی ان واقعات کے بارے میں زبان کھولنے کی ہمت کر سکتا ہے تو وہ صرف سیمون ہے‘ باقی بھلا کس میں جرأت ہے کہ کچھ بول سکے۔“

”آخر کیوں؟ میں اس سوال کا جواب چاہتا ہوں۔“

”اس کا جواب میرا سر ہے۔ اگر تیرے پاس خنجر ہے تو میری گردن پر پھیر کر میرا سر اتار لے۔ اس شکل میں بھی تو میری زبان سے کچھ نہیں سن پائے گا اور صرف میری زبان سے ہی نہیں تیرا یہ خنجر کسی کی بھی گردن اتار لے لیکن وہ تجھے کوئی فضول بات نہیں بتائے گا۔“

زیراس نے دانت پیستے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بھاری لہجے میں بولا۔ ”میرا ناشتہ وہاں رکھ دے......“ اور اس کے بعد وہ بوڑھے کے پاس سے ہٹ کر میز پر جا بیٹھا۔ بوڑھے نے اپنی جان بچ جانے کی خوشی میں جلدی جلدی اس کے لیے ناشتے کا بندوبست

کیا اور کچھ لمحوں کے بعد زیراس کا ناشتہ اس کے سامنے سجا دیا۔

زیراس کھانے میں مشغول ہوگیا۔ روتھن کی لاش نہ ملنے سے وہ بڑا مطمئن ہوگیا تھا جانتا تھا کہ روتھن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اس کی تلاش بھی ضروری تھی اور وہ اس بستی کے بارے میں جاننے کا خواہش مند بھی تھا۔ ہیرک بدستور اپنی جگہ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد زیراس اس کے قریب پہنچا اور ہیرک کے سامنے میز بجاتے ہوئے کہا۔ ''احمق شرابی! اب تجھے میرے ساتھ سیمون کے پاس چلنا ہوگا۔''

ہیرک نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کون ہے تو؟ کہاں سے آیا ہے؟ جا چلا جا۔ اس وقت ہم بلندی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں سے نیچے اترنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔''

''میں تجھے مار مار کر اس فرش پر لمبا کر دوں گا۔'' زیراس نے گریبان پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا اور اسی وقت بوڑھا اس کے عقب میں پہنچ گیا۔

''تم اس کے بدن کے ٹکڑے ہی یہاں سے لے جا سکتے ہو۔ اب اس کا اٹھنا ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' زیراس غرایا۔

''دن کی روشنی میں یہ صرف ایک بوڑھا سا سانپ ہوتا ہے لیکن سورج چھپ جائے تو اور بات ہے۔''

''اس وقت اس کے پیروں میں جان آ جائے گی۔''

''ہاں، اس وقت یہ حیرت انگیز طور پر درست ہو جاتا ہے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا یہ پاگلوں کی بستی ہے!'' زیراس نے پریشانی سے کہا پھر بولا۔ ''سیمون کہاں ملے گی؟''

''اس کے ہرکارے شاید مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔'' بوڑھے نے کہا اور زیراس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ کوئی بات اس کی سمجھ

میں نہیں آ رہی تھی۔ عجیب طرح کے پھیر میں پڑ گیا تھا۔

بوڑھے کی بات حرف بحرف اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ زیراس وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ دو افراد اندر داخل ہوئے اور کسی سمت دیکھے بغیر بوڑھے کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے مدہم آواز میں بوڑھے سے کچھ کہا اور بوڑھے نے زیراس کی طرف اشارہ کر دیا۔ دونوں باادب انداز میں اس کے پاس پہنچ گئے۔

''شمالہ کے اجنبی' کیا تم آقا سیمون سے ملاقات کے خواہش مند ہو؟''

''تم کون ہو؟'' زیراس نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سیمون کے غلام۔''

''اس نے کیسے جانا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں؟''

''یہ ہم نہیں جانتے۔''

''ہاں، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ چلو۔''

وہ باہر نکل آیا۔ باہر ان دونوں کے گھوڑے کھڑے ہوئے تھے۔ زیراس نے اپنا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہوگیا۔ وہ دونوں اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔

بستی کے مکانات کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ ایک نشیبی راستے پر آ گئے۔ جس کا اختتام سرخ پتھروں سے بنی ایک عمارت پر ہوا تھا۔ گھوڑے عمارت کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ پتھروں کی بنی تین سیڑھیاں عبور کر کے زیراس دوسرے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اس کا گھوڑا باہر کھڑے دوسرے لوگوں نے سنبھال لیا تھا۔ پھر کئی پر پیچ راہداریوں سے گزار کر اسے سیمون کے سامنے لے جایا گیا۔

دراز قامت اور انتہائی پرمتانت چہرے والی تقریباً پینتیس سالہ عورت نے سرد مہری سے گردن خم کی۔ اس کے ٹخنوں تک لمبے گھنے بال حسن کی علامت تھے اور بدن کا تناسب بے حد دلکش تھا لیکن کرخت چہرہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ بے حد مغرور ہے۔

زیراس نے سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھا اور سیمون نے اسے ایک نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شمالہ میں، میں اپنے ساتھی کے ساتھ داخل ہوا تھا اور میں نے یہاں معاوضہ ادا

کر کے قیام کیا تھا۔ رات کو کہیں سے رقص و سرود کی آواز سنائی دی اور میرا ساتھی اس طرف چلا گیا اور اب ویرانوں میں اس کے گھوڑے کی لاش پڑی ہے۔ اور وہ گم ہے۔"

زیراس نے مختصراً ساری روئیداد بیان کر دی۔ اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بیٹھو ابھی! موت کے ویرانوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔" سیمون کی آواز دلکش تھی جو اس کے چہرے کی سنجیدگی سے میل نہیں کھاتی تھی۔

"میرا ساتھی کہاں ہے؟"

"اگر اس کی لاش ویرانوں میں اب نہیں ملی تو کبھی نہ کبھی مل جائے گی۔ اس کی زندگی ممکن نہیں ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اسے زندہ تلاش کر شالہ کی سردار۔ اور یہی شالہ کے حق میں بہتر ہے ورنہ تجھے دوسرا تماشہ دیکھنا پڑے گا۔"

"وہ تماشا کیا ہوگا؟" وہ بدستور سرد لہجے میں بولی۔

"شالہ کے ہر گھر سے رونے اور کراہنے کی آوازیں ابھریں گی اور یہ کہ اس کی ہر گلی میں خون بہہ رہا ہوگا۔' زیراس کی آواز بھیڑیئے کی آواز سے مشابہہ تھی۔

"کون سے قبیلے سے تعلق ہے تیرا؟"

"قبیلہ موت سے، اور اس کا تجربہ تو کرلے گی۔"

"میں ایک بار پھر تجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتی ہوں۔ جہاں تک تیرے ساتھی کی گمشدگی کا تعلق ہے تو میں نے اس کی موت کی پیش گوئی ان ویرانوں کی روایات کے تحت کی ہے۔ اگر تیرے ذہن میں یہ خیال ہے کہ تیرے ساتھی کی گمشدگی میں شالہ والوں کا ہاتھ ہے تو اس خیال کو دل سے نکال دے۔"

"ان ویرانوں کی روایات کیا ہیں؟" زیراس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"بہت پرانی بات ہے اس وقت کی جب میرے باغ کے درخت کونپلوں کی شکل میں تھے۔ بستی شالہ امن اور آشتی کی بستی تھی۔ لوگ یہاں خوش و خرم رہتے تھے۔ یہاں ناچ رنگ کی حقیقی محفلیں جمتی تھیں۔ ہر رات ہنسی خوشی کی رات تھی۔ لوگ کاروبار کرتے تھے اور دن بھر کی محنت کی تھکن شراب خانوں اور اپنے گھروں کے سامنے جمنے والی محفلوں

میں اتارتے تھے، کھیل کود ہوتے تھے۔ سپہ گری کے مقابلے ہوتے تھے اور یوں یہ بستی سکون کی بستی تھی لیکن پھر ایک حادثہ ہوا۔ بستی کے چند مسافر سفر پر گئے تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے ایک ہولناک کہانی سنائی۔ یہ کہانی ویرانوں میں پڑی چھ انسانی لاشوں کی تھی جن کا تعلق اس بستی سے نہیں تھا لیکن وہ اس بستی میں آ رہے تھے۔ بستی والوں کے لئے یہ بڑی المناک بات تھی۔ وہ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے لیکن ان میں نہ کوئی اتنا سنگدل تھا اور نہ اتنا بدخو۔

"چھ لاشوں کا راز بہت دن تک راز رہا۔ پھر اس بستی کے دو افراد ویرانوں سے گزرے اور اس کے بعد زندہ واپس نہ آئے۔ ان کی موت درندوں کے حملے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کے بدن پر گولیوں کے نشان تھے۔ تب بستی میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ تنہا سفر کرتے ڈرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اموات کی تعداد بڑھتی گئی اور اندازہ لگایا گیا کہ مخصوص وقت پر سفر کرنے والے ان اموات کا شکار ہوتے ہیں۔ بستی کے سمجھداروں نے کہا کہ ان ویرانوں میں گندی روحوں نے بسیرا کر لیا ہے اور وہ انسانی زندگی کی خواہاں ہوتی ہیں۔

"چنانچہ بستی میں دہشت پھیلتی گئی۔ بھولے بھٹکے رات کی تنہائیوں میں اگر کبھی اس طرف آ نکلتے تو کسی کی زندگی نہ بچتی۔ پھر چار جیالوں نے یہ طے کیا کہ ان گندی روحوں کا سراغ لگائیں گے اور جس جگہ انہوں نے فیصلہ کیا تھا، وہیں ان کے اعضاء کے ڈھیر دستیاب ہوئے۔ یہ سزا تھی ان کے فیصلے کی۔ پھر کوئی نیا فیصلہ کبھی نہ ہوا۔ سب جان گئے تھے کہ نظر نہ آنے والی روحیں بستی میں چکراتی رہتی ہیں اور کوئی اگر کچھ سوچتا ہے تو وہ بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ یوں اس بستی سے رونقیں ختم ہوگئیں۔ موت کے خوف میں زندگی گزارنے والے کہیں ہنسی خوشی رہ سکتے ہیں؟"

"وہ ناچ رنگ کیا حیثیت رکھتا ہے جو ویرانوں میں ہوتا ہے؟" زیراس نے سوال کیا۔

"آہ...... اس کے بعد صورتحال خراب ہوتی گئی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور ڈھول کی تھاپ اشارہ ہوتی ہے کہ روحیں خون کی پیاسی ہیں اور انہیں انسانی خون درکار رہے۔"

''اچھا پھر؟'' زیراس نے سوال کیا۔

''بستی والے محتاط ہو گئے۔ سرِ شام ہی گھروں کے دروازے بند ہونے لگے۔ لوگ باہر بھی نہیں نکلے تھے۔ سب کو زندگی عزیز تھی۔ ناچ رنگ کی محفلیں ختم ہو گئی تھیں۔ تب ایک رات بستی سے دور ویرانے میں رقص و سرود کی آوازیں ابھریں اور چند نوجوان خود کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ وہ چھپ چھپ کر چلے گئے اور پھر ان کڑیل نوجوانوں کی لاشیں مل گئیں۔ یہ بھی روحوں کا فریب تھا۔''

''تو اس بستی کی سردار ہے؟''

''ہاں بدقسمتی سے یہ ذمے داری میرے کاندھوں پر ہے۔''

''تو نے اس بارے میں اپنا فرض پورا نہیں کیا۔''

زیراس کی اس بات پر سیمون نے کسی قدر درشت نظروں سے اسے دیکھا پھر بولی۔ ''ایک بار پھر میں پوچھتی ہوں کون سا قبیلہ ہے تیرا؟''

''پورا ذی آنا میرا قبیلہ ہے۔''

''تو سن، اے سورما۔ تاج سرداری میں ہمیشہ کے لئے تجھے دے دوں، اگر تو بستی شالہ کو اس عذاب سے نجات دلا دے۔ نظر آنے والے دیو پیکروں سے جنگ کی جا سکتی ہے لیکن وہ جو ہواؤں میں رہتے ہیں ان سے جنگ کیسے کی جائے؟''

''مجھے تیری سرداری نہیں، اپنا دوست چاہئے اور جیسا میں نے کہا، اس کی تلاش میں، میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ یوں نہ ہو کہ بعد میں مجھ سے شکوہ کیا جائے۔''

''اگر شالہ کے کسی مصیبت زدہ پر تو نے ظلم کیا تو خود پشیمان ہوگا۔ یہ تو خود عذاب میں گرفتار ہیں۔ تو کسی کو زخم بھی لگا دے گا تو یہ صرف اپنا زخم صاف کرنے لگیں گے تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا۔ ان کی قوتیں بالکل مفلوج ہو گئی ہیں اور میں تجھ سے صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ ان میں سے کسی کی اتنی جرأت نہیں کہ تیرے کسی ساتھی کو نقصان پہنچا سکیں۔'' سیمون نے کہا۔

''تب تو بھی سن لے سیمون۔ زیراس ان روحوں کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے اور شالہ والوں کو خوشخبری سنا دے کہ اب وہ روحیں قائم نہ رہ سکیں گی۔ ہاں اگر یہ فریب ہوا

شالہ کی سردار تو اس کی قیمت تجھے چکانی ہوگی۔''

سیمون کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ زیراس کے الفاظ پر اس نے تبصرہ نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ ایک لفظ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سخت خوفزدہ تھی۔



سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو روشنی اسے اتنی تیز لگی کہ آنکھیں پھر بند کرنا پڑیں۔ سارا دماغ کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور پھر آہستہ آہستہ حواس جاگنے لگے۔ گزرے ہوئے لمحات یاد آئے۔ ذی آنا کی نامعلوم بستی کا قیام۔ گھنگھروؤں کی آواز، روشنی کا فریب اور اس کے بعد وہ اُلجھا جال۔

روتھن نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ سورج نہیں چمک رہا تھا لیکن اجالا بتاتا تھا کہ صبح ہو چکی ہے۔ مگر جال؟ اب اس کے گرد نہیں تھا اور وہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اطراف میں عجیب گھنے گھنے سے درخت تھے۔ جن کے پتے زرد اور مکڑیوں کے جالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ بڑے اور چھوٹے جالوں کے ڈھیر چاروں طرف نظر آ رہے تھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تبھی اس کو ایک عجیب آواز سنائی دی اور کوئی دھپ سے زمین پر گرا۔ روتھن اچھل پڑا تھا۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر اس طرف دیکھا اور بری طرح چکرا کر رہ گیا۔

وہ ایک نسوانی وجود تھا۔ تمام تر دلکش خطوط کے ساتھ۔ بدن پر چند دھجیوں کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن یہ دھجیاں کہاں تھیں! عجیب سے رنگوں سے بدن کے کچھ حصے رنگے گئے تھے اور بس سب سے زیادہ خوفناک بات اس کا انداز تھا۔ جانے کہاں سے ٹپکی تھی جو دھپ سے گرنے کی آواز ہوئی تھی اور اب دونوں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل بڑے عجیب سے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔

روتھن کو وہ بالکل بلی لگ رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل مل کر اسے دیکھنے لگا اور ایک بار

پھر اچھل پڑا۔ اسے بلی کی غراہٹ سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ کئی فٹ اوپر اچھل کر نیچے گری تھی جس جگہ وہ گری تھی وہاں کسی قدر نشیب تھا اور وہ روتھن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ منظر اتنا عجیب تھا کہ روتھن خود کو باز نہ رکھ سکا اور بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ نشیب زیادہ گہرا نہ تھا۔ وہ اسے نظر آ گئی لیکن دوسرا منظر دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ پیلے اور بھورے رنگ کا ایک اژدھا زمین پر پڑا ہوا تھا اور بلی نما لڑکی اس پر حملہ آور تھی اور پھر اژدھے سے اس کی جنگ کا انداز!!

روتھن کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ لڑکی کے منہ سے مسلسل خونخوار غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اژدھا بل کھا کھا کر اس کو لپیٹ میں لینے کے چکر میں تھا لیکن بلی تو اس سے بھی زیادہ پھرتیلی تھی۔ وہ نہ صرف اژدھے کے ہر وار سے بچ رہی تھی بلکہ مواقع ملنے پر وار بھی کر رہی تھی اور اس کا نشانہ اژدھے کا پھن تھا۔

روتھن اس عجیب منظر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اژدھے کی زبان باہر نکل رہی تھی اور وہ تکلیف میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ تب روتھن نے اس کا پھن زخمی دیکھا۔ لڑکی نے اس کا پھن ادھیڑ دیا تھا۔ وہ پینترے بدل بدل کر اپنے پنجے اس کے پھن پر مار رہی تھی اور اس کے پنجے............روتھن کے بدن میں پھریریاں دوڑ گئیں۔ اس کے ناخن بہت لمبے، تیز اور خمدار تھے۔

اژدھے کی ایک کوشش کارگر ہو گئی۔ اس کی دم پوری قوت سے لڑکی کے بدن پر پڑی اور وہ قلابازی کھا گئی۔ کافی دور جا کر گری تھی وہ، لیکن سو فیصد بلی تھی۔ زمین پر پنجوں کے بل ہی آئی تھی۔ زخمی اژدھا بھاگنے کی فکر میں تھا لیکن روتھن نے پہلے سے زیادہ خوفناک غراہٹ کے ساتھ دوبارہ اسے اژدھے پر حملہ کرتے دیکھا۔ اس بار اس نے اژدھے کا پھن دبوچ لیا تھا اور بلیوں ہی کے انداز میں پیروں کے دونوں پنجوں سے دھن رہی تھی۔ اژدھا پھر ایک بار اسے کسنے کی کوشش کرنے لگا لیکن لڑکی کے پیروں کے ناخن بھی اتنے ہی خوفناک تھے۔ دونوں زمین پر لڑھک رہے تھے اور ایک خوفناک جدوجہد ہو رہی تھی۔

روتھن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اصولاً اسے لڑکی کی مدد کرنی چاہئے تھی

لیکن مصیبت میں تو اژدھا تھا۔ یہ لڑکی نما بلی خود اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ چنانچہ روتھن دیکھتا رہا اور وہی ہوا جس کی امید تھی۔ اژدھا آہستہ آہستہ مضمحل ہونے لگا پھر اس کا بدن سیدھا ہوگیا۔

روتھن فوراً سنبھلا اور ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس فتح کے بعد وہ کیا کرے گی؟ پھر وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس نے لڑکی کو بلیوں ہی کے انداز میں ایک جگہ بیٹھ کر پنجے چاٹتے ہوئے دیکھا۔

روتھن چکرائے ہوئے ذہن سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اس آسیب زدہ ماحول کا احساس ہورہا تھا۔ درختوں میں لپٹے ہوئے جالے، عجیب سرزمین اور پھر یہ انسانی بلی۔ اپنی افتاد تو اب ذہن ہی میں نہ رہی تھی۔

بلی نما لڑکی نے دونوں ہاتھ اور پاؤں زمین پر ٹکا کر ایک مستانہ انگڑائی لی اور پھر ایک طرف چل پڑی لیکن وہ چل دو پیروں ہی سے رہی تھی۔

روتھن نہایت چابکدستی سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کے قدم بے آواز تھے اور بلی نما لڑکی اس کی طرف سے بے خبر رہی تھی۔

لڑکی کافی دور تک چلتی رہی پھر روتھن نے اسے ایک جگہ رکتے دیکھا۔ درختوں کے گھنے جھنڈ کے پاس کسی جانور کی لاش پڑی ہوئی تھی جو زیادہ پرانی نہیں تھی اور اس کا اندازہ اس کے گوشت پر نظر آتے ہوئے سرخ خون سے ہورہا تھا۔

لڑکی لاش کے پاس رک گئی۔ اس نے چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر دوسرا انوکھا منظر دیکھنے میں آیا۔ لڑکی لاش کے پاس بیٹھ کر اس کا گوشت ناخنوں سے ادھیڑنے لگی۔

روتھن کے رونگٹے کھڑے ہورہے تھے۔ گزرے ہوئے واقعات ایک خواب ہی معلوم ہوتے تھے لیکن یہ تو عالم بیداری تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ ذی آنا کا علاقہ ہے اور پورے ذی آنا میں اس سے زیادہ پراسرار سرزمین کہیں اور نہیں ہے۔

لیکن اب کیا کیا جائے؟ سوچنے کے لئے سب کچھ تھا۔ رقص اور موسیقی کی آواز، جال اور پھر یہ بلی.........مقصد؟ اسے یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے جال بے

مقصد نہ ہوگا، کسی نے تو یہ کارنامہ سرانجام دیا ہوگا پھر اسے زیراس یاد آیا۔ زیراس کہاں ہوگا؟

اس بار ستارے ہی غلط ہوگئے تھے۔ ہر چال ناکام ہوگئی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہی جال میں پھنس جاتا تھا۔ نہ جانے اس جگہ کا بستی شالہ سے کتنا فاصلہ ہے اور اسے آسانی سے واپسی نصیب بھی ہوگی یا نہیں۔ نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہے؟ اس کا ذہن اندیشوں کے جال بن رہا تھا۔ اس پراسرار خطے میں کسی وقت بھی کوئی خوفناک صورت حال پیش آسکتی تھی اور پھر یہ منظر تو بے حد خوفناک تھا۔

لڑکی کے انداز اور حرکات وسکنات میں جو وحشیانہ پن پایا جاتا تھا وہ قطعی غیرانسانی تھا لیکن روتھن کا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کررہا تھا کہ وہ انسانوں سے ہٹ کر کوئی چیز ہے، نہ ہی وہ اس سے خوفزدہ تھا بلکہ وہ حقیقت جاننے کا خواہش مند تھا۔

لڑکی بدستور گوشت کے اس ٹکڑے کو دانتوں سے جھنجھوڑنے میں مصروف تھی جو اس کے سامنے تھا۔ وہ بلیوں کے سے انداز میں اپنے دانتوں سے کھینچ کھینچ کر گوشت چبا رہی تھی اور روتھن اسے زیادہ سے زیادہ قریب سے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

پھر دفعتاً ہی لڑکی چونکی ہوگئی تھی۔ بالکل یوں لگا جیسے کسی بلی نے کوئی آہٹ سن لی ہو۔ اس نے گوشت چھوڑ کر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور روتھن جو بے اختیارانہ انداز میں آگے بڑھ آیا تھا اور اس وقت کسی آڑ میں نہیں تھا، لڑکی کی نگاہوں میں آگیا۔ دوسرے لمحے لڑکی کی آنکھیں اس پر آجمیں، روتھن کو ان میں ایک شیطانی چمک نظر آئی تھی۔ پھر اس کے ہونٹ پھیل گئے، اس کے حلق سے بلی کی مانند غراہٹیں ابھرنے لگی تھیں۔ بالکل یوں لگ رہا تھا کہ اب وہ روتھن پر حملہ کردے گی۔

ایک لمحے کے لئے روتھن کو سنبھلنا پڑا۔ لڑکی کے لمبے ناخن اور تیز سفید دانت جو اس وقت خون آلود ہورہے تھے اور اس کے چہرے پر جگہ جگہ لگا خون، روتھن کے لئے حیرت کا باعث تھے۔ کچھ کراہت بھی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر لڑکی نے اس پر حملہ کردیا تو یقینی طور پر اس کو سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ اژدھے کی ہلاکت دیکھ چکا تھا۔ لڑکی جتنی پھرتیلی تھی، اس کا بھی روتھن کو اندازہ ہوچکا تھا لیکن لڑکی کے ساتھ

کوئی ایسی کارروائی بھی فوری طور پر نہیں کی جا سکتی تھی جو اس کے لئے باعث نقصان ہو۔ روتھن کو اندازہ نہیں تھا کہ جال میں جکڑنے کے بعد اسے کون یہاں تک لایا ہے۔ اور یہاں کوئی باقاعدہ آبادی بھی ہے یا یہ لڑکی تنہا............

اگر روتھن کی کسی کوشش سے لڑکی کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو صورت حال خراب بھی ہوسکتی تھی۔ اور پھر وہ ترکیب قطعی غیر سوچی سمجھی تھی جس پر روتھن نے ایک دم عمل کر ڈالا تھا۔ لڑکی بدستور غرا رہی تھی۔ دفعتہً ہی روتھن اپنی جگہ پر جھکا تھا اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے کتے کے بھونکنے کی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ ایک خونخوار کتے کی مانند بھونک رہا تھا اور دوسرے لمحے اس نے لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ روتھن کو ذرہ برابر امید نہیں تھی کہ اس کی یہ تدبیر اتنی کارگر ثابت ہو جائے گی۔ کتے کی آواز سن کر لڑکی اس طرح چونکی تھی اور خوفزدہ ہو گئی تھی جیسے بلی، کتے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ اس نے پہلے بائیں سمت اور پھر دائیں سمت دوڑنے کی کوشش کی اور روتھن کو بھی نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ لڑکی کے پیچھے دوڑ پڑا۔

پھر اس نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ لڑکی اچھل کر ایک موٹے اور تناور درخت پر چڑھ گئی اور پھر بلی ہی کی طرح اپنے پنجوں کی مدد سے درخت کی ایک اونچی شاخ پر پہنچ گئی۔ روتھن اس درخت سے دور ہی رہا تھا۔

لیکن پھر اسے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ آواز انسانی ہی تھی لیکن الفاظ روتھن کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ اس نے ایک موٹی سی بھدی عورت کو دیکھا جو عجیب قسم کے لباس میں ملبوس تھی۔ سیاہ رنگ کا ایک کفن نما لباس اس کے بدن پر بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی پھر اس نے روتھن کو دیکھ کر منہ سے عجیب قسم کی آواز نکالی اور ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر روتھن پر دے مارا۔ روتھن جھکائی دے کر اس پتھر سے بچ گیا تھا لیکن موٹی عورت کے ہاتھ سے نکلا ہوا دوسرا پتھر روتھن کی کمر پر پڑا اور دفعتہً روتھن کے حلق سے ایسی ہی آوازیں نکلیں جیسے کتے کو پتھر مار دیا جائے تو وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کر کے چیختا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے درخت کی مخالف سمت چھلانگ لگا دی تھی۔ بس سوجھ ہی گئی تھی۔ نہ جانے کیا سوچا تھا اس نے۔

موٹی عورت نے دو تین پتھر اٹھا کر اور اس کی طرف پھینکے لیکن روتھن اب اس پتھر کی زد سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ دور تک دوڑتا چلا گیا اور چند لمحات کے بعد لڑکی اور موٹی عورت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دیر کے لئے وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ یہ ناقابل یقین منظر اس کے لئے انتہائی حیران کن تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

جنگلوں کا یہ سلسلہ نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت ناک ان درختوں کی شکلیں تھیں۔ ایسے بدنما درخت اس سے پہلے کبھی روتھن کی نگاہوں سے نہیں گزرے تھے۔ ان سب میں مکڑیوں جیسے جالے شاخوں سے لے کر زمین تک تنے ہوئے تھے۔ کم از کم یہ مکڑیوں کا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پھر کیا بات تھی؟

اس علاقے میں دور دور تک ویرانی نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ موٹی عورت اور انسانی بلی اس کی نگاہوں کے سامنے نہ آتے تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ہولناک ویرانے میں کوئی انسان بھی رہتا ہے۔

ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا وہ کافی دور نکل آیا تھا اور اب ایک جگہ بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور یوں ہی بے مقصد آگے بڑھ گیا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ کہیں کہیں اسے چھوٹے موٹے جانور بھی دوڑتے نظر آ جاتے تھے۔ گویا یہ جنگل کم از کم جانوروں سے خالی نہیں تھا۔ البتہ درندوں کے نشانات ابھی تک نہیں مل سکے تھے۔ اگر یہاں درندے ہوئے تو کافی مشکل پیش آسکتی ہے۔ لیکن ایک خیال اور بھی اس کے ذہن میں تھا۔ اسے بے ہوش کر کے یہاں تک لانے والوں کے ذہن میں کوئی مقصد ضرور ہوگا گزرے ہوئے لمحات اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ اس کے لئے جال بچھایا گیا تھا۔ رقص و موسیقی کی وہ آوازیں بلاشبہ حیرت انگیز تھیں اور اس کے بعد اس کے گھوڑے کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہیں، محض پراسرار طاقت کے مالک ہی نہیں ہیں بلکہ ہتھیاروں کا استعمال بھی جانتے ہیں۔

ابھی تک ذہن کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ ایک بار پھر وہ زیراس سے بچھڑ گیا تھا اور

وہ جانتا تھا کہ اب زیراس اس کے لئے پریشان ہوگا۔

اور پھر کچھ فاصلے پر اسے ایک تالاب نظر آیا تھا۔ اس میں پانی موجود تھا اور اس کے کنارے کنارے اونچے نیچے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ روتھن کا رخ اس تالاب کی جانب ہوگیا لیکن ایک پتھر کے سامنے اس نے ایک انوکھی چیز دیکھی اور ایک بار پھر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ ایک بڑے میاں دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں پھیلائے، لباس سے بے نیاز پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چہرہ انسانوں جیسا ہی تھا۔ ہاتھ پاؤں کی بناوٹ بھی انسانوں سے مختلف نہیں تھی لیکن ان کا منہ جس انداز میں ہل رہا تھا وہ حیرتناک تھا۔ ان کی گول گول آنکھیں روتھن کا جائزہ لے رہی تھیں اور ان کے منہ سے مینڈک کی سی ٹرٹراہٹ نکل رہی تھی۔

روتھن ایک قدم آگے بڑھا تو بوڑھا دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے مینڈک کی طرح چھلانگیں لگانے لگا۔ اس کا چھلانگیں لگانے کا انداز مینڈکوں جیسا ہی تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے حلق سے ٹرٹراہٹ بھی نکلتی جارہی تھی۔ پھر وہ ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں اس طرح جا بیٹھا جیسے اس نے کسی بیرونی خطرے سے پناہ لے لی ہو۔

روتھن نے پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور اسی وقت اسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر پلٹا تو ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ایک تنومند نوجوان تھا جو ہاتھوں، پیروں کے بل کھڑا ہوا گھوڑے کی طرح ہنہنا رہا تھا اور اپنا ہاتھ اس طرح زمین پر مار رہا تھا جیسے گھوڑا کبھی کبھی اپنا کھر زمین پر مارتا ہے۔

دفعتہ ہی ایک اور آہٹ ہوئی اور گھوڑا نما نوجوان سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ ہاتھ پیروں کے بل اس کے دوڑنے کی یہ رفتار روتھن کے لئے ناقابل یقین تھی۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند دوڑ گیا تھا۔ پتھر کے عقب میں بیٹھا ہوا بوڑھا اب بھی ٹرٹرا رہا تھا۔

روتھن دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس کے ہوش وحواس واقعی جواب دیتے جارہے تھے۔ یہ انسانی جانور کیا حیثیت رکھتے ہیں، کہاں سے وارد ہوئے ہیں؟ انہیں دیکھ کر دل میں خوف بھی ابھرتا تھا اور حیرت بھی ہوتی تھی۔

پھر روتھن نے ایک فیصلہ کرلیا۔ اس نے ایک موٹی سی لکڑی اٹھائی اور آہستہ آہستہ

چلتا ہوا مینڈک نما بوڑھے کی طرف بڑھنے لگا جو اسے دیکھ کر سمٹتا جارہا تھا۔ روتھن اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"او مینڈک کی اولاد، تو مینڈک تو کیا کچھوا بھی بن جا تو مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن اگر میری بات کا صحیح جواب تو نے نہیں دیا تو میں تیرے چاروں ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا۔ پہلے تو پتھر کی اوٹ سے باہر نکل آ۔"

مینڈک نما بوڑھا خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا لیکن بولا کچھ نہیں، تب روتھن نے لکڑی اس کے بدن میں چبھوئی اور وہ ادھر ادھر سرکنے لگا۔ اس بار روتھن نے ذرا زور سے لکڑی اس کے بدن پر ماری تو ایک بار پھر وہ اچھلتا ہوا بھاگا اور دوسرے لمحے اس نے ایک لمبا چکر لے کر غڑاپ سے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔

روتھن اس کے پیچھے دوڑا تھا لیکن اس نے پانی میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پانی اتنا گدلا تھا اور اس پر کائی کی اتنی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی کہ بوڑھا اس میں غائب ہوگیا تھا اور اب پانی پر بلبلے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

روتھن نے آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکی اور پھر سوچنے لگا کہ اس طرح وہ کب تک اس جادونگری میں بھٹکتا رہے گا۔ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہئے۔ پھر اسی موٹی لکڑی کی مدد سے روتھن نے ایک خرگوش شکار کیا۔ خرگوش کے سر پر لکڑی پڑی تھی اور اس کا بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ روتھن نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جیب سے چاقو نکال کر اس کی کھال ادھیڑنے لگا۔ اس کے بعد اسے آگ کی تلاش ہوئی اور اس نے درختوں کے نیچے سوکھی ہوئی لکڑیاں جمع کرکے ایک جگہ ڈھیر کردیں۔ آگ جلانے کے لئے زمانہ قدیم کا وہی طریقہ استعمال کیا جاسکتا تھا جس سے انسان آگ حاصل کیا کرتا تھا یعنی پتھروں سے نکلنے والی چنگاریاں۔ روتھن نے دو پتھر تلاش کئے اور لکڑیوں کے اس ڈھیر کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے پتھروں کو ایک دوسرے پر مارا۔ چنگاریاں پیدا ہوئیں، اس کے ساتھ ہی روتھن کو اچھل کر پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ چنگاری جونہی لکڑی سے ٹکرائی، لکڑیوں میں اس طرح شعلہ بھڑکا جیسے بارود کو آگ لگادی گئی ہو۔ ایک لمحے میں وہ تمام لکڑیاں خاکستر ہوگئی تھیں۔ شعلہ کافی اونچا بلند ہوا اور پھر ایک دم سرد ہوگیا۔ نیچے زمین

پر جلے ہوئے نشانات باقی رہ گئے تھے۔

روتھن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ لکڑیوں کے بالکل قریب ہوتا تو یقینی طور پر اس شعلے کی لپیٹ میں آ سکتا تھا لیکن بارود کی طرح بھڑک اٹھنے والی یہ لکڑیاں بھی اس کے لئے حیرت انگیز تھیں۔ آگ بجھ گئی تھی اور روتھن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں ایسے درختوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ چنانچہ خرگوش کا گوشت کو بھوننے کا مسئلہ بھی یونہی رہ گیا۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ مظلوم خرگوش لوتھڑے کی شکل میں ایک پتھر پر رکھا ہوا تھا اور اسے بھوننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ روتھن کو افسوس بھی ہونے لگا کہ اس نے بلاوجہ اس کی جان لی۔ تالاب کے گدلے پانی کو پی کر پیاس بھی نہیں بجھائی جا سکتی تھی اور کھانے پینے کی کوئی شے آس پاس موجود نہیں تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس صحرائے افسوں میں اسے بھوکا ہی رہنا پڑے گا تاوقتیکہ کوئی ایسا ذریعہ نہ نکل آئے جو پیٹ بھرنے کا باعث ہو۔

خرگوش کو وہیں چھوڑ کر وہ آگے چل پڑا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک پیروں میں جان ہے۔

ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ اس کا یہ سفر جاری رہا اور جب سورج غروب ہونے کو پہنچا تو اس نے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا ایک میدان دیکھا جو ویسے ہی درختوں کے درمیان گھرا ہوا تھا جیسے درخت وہ اپنے عقب میں دیکھ چکا تھا۔ ان ٹیلوں میں غار نظر آ رہے تھے۔ غاروں کے سامنے روتھن کو کچھ ایسے نشانات بھی نظر آئے جن سے اسے اندازہ ہوا کہ یہاں کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے۔

وہ گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا اور پھر دفعتاً ہی اسے سنبھلنا پڑا۔ پہاڑی ٹیلوں میں بنے ہوئے غاروں سے اچانک انسانی غول نمودار ہونے لگے تھے لیکن سب کے سب اسی رنگ میں۔ چاروں طرف سے ان کی یلغار ہوئی تھی اور وہ مختلف ہیئت اختیار کئے ہوئے تھے۔ کچھ گھوڑوں کی طرح ہنہنا رہے تھے، کچھ گدھوں کی طرح چل رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے حلق سے بھینسوں کی آوازیں نکل رہی تھیں، دو چار اڑتے ہوئے بھی آ رہے تھے لیکن اُن کا اڑنا باقاعدہ نہیں تھا۔ بس وہ پنکھ پھیلا کر جوان

کے بازوؤں کے علاوہ کچھ نہ تھے، دوسروں کی پیٹھ پر پھدکتے ہوئے آ رہے تھے۔ عورتیں بھی تھیں جن میں سے بعض ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھیں، بعض تتلیوں کی طرح اڑ رہی تھیں لیکن اڑنے کا انداز یہی تھا کہ زمین سے ایک دو فٹ اونچی چھلانگیں لگاتیں اور اس کے بعد نیچے آ جاتیں۔

انہوں نے چاروں طرف سے روتھن کو گھیر لیا تھا لیکن ان کے انداز میں جارحیت نہیں تھی۔ عورتیں بے حد حسین تھیں۔ مرد بھی اچھی صورتوں کے مالک تھے۔ کچھ کے جسم پر لباس موجود تھے کچھ بے لباس تھے۔ بلیاں بھی تھیں اور بھونکنے والے کتے بھی، ٹرٹرانے والے مینڈک اور نہ جانے کون کون!

لیکن یہ سب کے سب انسان تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ زمین کے سوراخوں سے باہر آ رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے روتھن کے چاروں طرف ایک جم غفیر لگ گیا۔ وہ سب طرح طرح کی آوازوں میں بول رہے تھے اور روتھن کو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی پڑی تھیں۔ پھر ان میں شیر کی دھاڑیں سنائی دیں اور روتھن بری طرح اچھل پڑا۔ بالکل شیر ہی کی آواز تھی لیکن یہ ایک عمر رسیدہ بوڑھا تھا جو چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا اسی جانب آ رہا تھا۔ کہیں اونٹ کی بلبلاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

روتھن ان سب کے درمیان اپنے آپ کو نہ جانے کیا محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا شیر کی آواز نکالنے والے کے لئے خصوصاً راستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا روتھن کی طرف آ رہا تھا اور روتھن ادھر ادھر دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اب کس سمت چھلانگ لگائی جائے۔

لیکن یہ ناممکن تھا کیونکہ دور دور تک وہ پھیل گئے تھے اور ان کی تعداد بے شمار تھی۔ اگر وہ سب کے سب روتھن پر ٹوٹ پڑے تو اس کی تکا بوٹی ہی کر ڈالتے۔

بالآخر شیر نما بوڑھا اس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے زمین پر جھک کر اپنا منہ روتھن کے پیروں پر رگڑنا شروع کر دیا۔ روتھن نے ایک لمحے میں یہ محسوس کیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ہے یا جو کچھ بھی ہو رہا ہے، کم از کم وہ لوگ اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ اسی بات نے تھوڑی دیر کے لئے اسے سنبھال لیا تھا۔ اس نے شیر کی آواز نکالنے والے کے شانے پر

ہاتھ رکھا اور اسے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اچھا خاصا قبول صورت بوڑھا آدمی تھا۔ عمر بھی کافی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے روتھن کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔ یقیناً وہ روتھن کو اس سمت لے جانا چاہتا تھا۔

روتھن نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اب اس کے سوا کچھ نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ ایک اور پراسرار بستی اس کے سامنے تھی۔ یقینی طور پر یہ سحر کی بستی تھی اور یہ سب بیچارے کسی عذاب کا شکار تھے لیکن یہ سب کچھ کیا تھا اور کس نے ان پر سحر کر کے انسان کے روپ میں جانور بنا دیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس شخص کے ساتھ تعاون کرے جو اسے کہیں لے جانا چاہتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھ گیا۔

شیر کی آواز نکالنے والا بوڑھا جو چہرے سے کافی سنجیدہ معلوم ہوتا تھا، روتھن کو ساتھ لئے ایک ٹیلے کے قریب پہنچ گیا جس میں ایک بڑا سا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے روتھن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ روتھن نے بس ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر اس دہانے سے اندر داخل ہو گیا۔

لیکن اندر داخل ہو کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ ٹیلے کے اندر کا ماحول محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ ان جیسے جانوروں کی رہائش گاہ ہے۔ وہاں بہترین رہائش موجود تھی اور اندر سے یہ جگہ اتنی وسیع وعریض تھی کہ ناقابل یقین سی لگتی تھی۔ ٹیلے تو بس ایک دکھاوا تھے۔ ورنہ تو وہاں بڑی وسیع وعریض دنیا آباد کر لی گئی تھی۔ یہاں نرم قسم کی گھاس بچھا کر زمین کو آرام دہ بنایا گیا تھا۔ دیواروں کو بھی اس گھاس سے سجایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ نہ جانے کیا کچھ آباد تھا۔ روشنی کے لئے وہاں دیواروں میں مشعلیں لگائی گئی تھیں جو کسی خاص قسم کے موم یا چربی سے جل رہی تھیں۔ نہ دھواں تھا نہ بدبو۔ ماحول بے حد خوشگوار اور صاف ستھرا تھا۔

یہ لوگ غالباً اپنی اپنی غاروں میں رہتے تھے۔ ان کے عقب میں اور کوئی نہیں آیا تھا۔ صرف وہی شیر کی آواز والا بوڑھا روتھن کو لئے ہوئے چلتا رہا تھا۔ یہ سلسلہ غار در غار پھیلا ہوا تھا۔ نیچے دروازے بنے ہوئے تھے اور پھر تقریباً چھ دروازے سے گزرنے کے بعد غاروں کا یہ سلسلہ ختم ہوا اور وہ ایک چھوٹے سے غار میں پہنچ گئے جس میں تین مشعلیں

روشن تھیں اور ان کی روشنی غار میں کھڑے ہوئے ایک شخص پر پڑ رہی تھی۔

وہ شخص کچھ عجیب نظر آ رہا تھا۔ اس کا رنگ بھورے مٹیالے پتھر جیسا تھا اور اس کے بدن پر وہی گھاس لپیٹ دی گئی تھی جس سے یہاں آرائش کی گئی تھی۔

شیر کی آواز والے بوڑھے نے روتھن کو اس شخص کے سامنے لا کھڑا کیا جو اس غار کے درمیان تنہا کھڑا تھا اور پھر خود پیچھے ہٹ کر غار کے دروازے سے جا لگا۔

روتھن مشعلوں کی روشنی میں کھڑے شخص کو بغور دیکھ رہا تھا جس کے جسم میں ابھی تک کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

روتھن نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ غار کے درمیان کھڑے ہوئے شخص کی کھلی ہوئی سفید آنکھیں روتھن پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے اور اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سیلان کی دنیا میں آنے والے تجھے سلام۔''

روتھن خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس شخص نے پھر کہا۔

''میرا نام سیلان ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ میری اس بستی میں اجنبی ہے۔''

''میرا خیال ہے اس پوری بستی میں آدمی کا بچہ صرف تو ہے۔ ورنہ یہ گدھے اور گھڑوں کی اولادیں چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔'' روتھن نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا اس لئے اس کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا تھا۔

''اوہ۔ شاید تو ان کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ تو نے دیکھا کہ یہ تجھ جیسے ہیں لیکن پھر بھی یہ تجھ جیسے نہیں...... ہماری بستی میں آنے والے، ہم تیرے خیر مقدم کے لئے ہر طرح سے تیار ہیں اور شاید ہم میں سے ہر ایک تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' سیلان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اور اب تو مجھے کوئی کہانی سنائے گا۔ کسی ایسی ساحرہ کی جس نے تم سب کو سحر زدہ کر دیا ہے۔'' روتھن ترچھی نظروں سے اسے گھورتا ہوا بولا۔

''ہاں! ہم یہ بھی جانتے تھے کہ تو دوسروں سے زیادہ ذہین ہوگا اور تجھ میں سب کچھ سمجھ لینے کی صلاحیت ہوگی۔ یہ سچ ہی تو ہے کہ شمالہ میں تیرا نزول ہوا اور بالآخر تو ہم

تک پہنچ گیا۔" سیلان بولا۔ اس کے چہرے پر پتھریلی سنجیدگی طاری تھی۔

"اب تو اپنی کہانی بھی سنادے تاکہ زیادہ وقت ضائع نہ ہو اور یہ بھی بتا دے کہ یہاں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔" اب روتھن کا خوف دور ہو چکا تھا اور وہ اپنی پرانی روش پر آتا جارہا تھا۔ اس کے اعصاب بحال ہو گئے تھے۔

"اس سے پہلے کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم تیری ضیافت کا بندوبست کریں اور مجھے شکم سیر کر دیا جائے؟"

"اگر تو نے یہ بات سچے دل سے کہی ہے تو بس یہ سمجھ لے کہ یہاں سے تیری اور میری دوستی کا آغاز ہو جائے گا۔ میں سخت بھوکا ہوں۔"

سیلان نے شیر کی طرف دیکھا اور شیر کی گردن خم کر کے باہر نکل گیا۔ روتھن اب اس دلچسپ تماشے سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ سیلان دوبارہ روتھن کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "میں تجھے بیٹھنے کی پیشکش کرتا ہوں۔ یہاں جو کچھ ہے اسے اپنے لئے سمجھ۔ ہم اس سے زیادہ تیری کوئی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ ابھی کھانے پینے کی اشیاء تیرے پاس پہنچ جائیں گی۔"

"اتنا ہی کافی ہے۔ اب اپنا تعارف کرادے۔" روتھن بولا۔

"میں...... میں ان سب کا سردار ہوں لیکن ایک ایسا بے بس اور بے کار سردار جو اپنی بستی کے رہنے والوں کی مصیبت دور نہیں کر سکتا۔ ہاں میں پیش گو ہوں۔ گزرے ہوئے اوقات اور آنے والے وقت کے بارے میں تھوڑا بہت جان لیتا ہوں اس لئے اے معزز شخص! ہم سب کو تیرا ہی انتظار تھا اور وقت یہ بتاتا تھا کہ تیرے آنے کے بعد ہماری مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے۔" سیلان مودبانہ لہجے میں بولا۔

روتھن ایک لمحے کے لئے چونکا تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو کیسے جانتا ہے کہ میں یہاں آنے والا تھا؟"

"میں نے تجھ سے کہا نا کہ میرے پاس صرف پیش گوئیاں رہ گئیں ہیں اور میری یہی پیش گوئی تھی تیرے بارے میں کہ تو آئے گا اور ہماری نجات کی راہ بنے گی۔"

روتھن خاموش ہو گیا اس جملے نے اسے متاثر کیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد تین تتلیاں

اڑتی ہوئی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر کی تراشی ہوئی پلیٹیں تھیں جن میں انتہائی نفیس قسم کے خشک میوے اور تازہ پھل رکھے تھے۔ ان ویران جنگلوں میں اس میوے اور پھلوں کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی چنانچہ یہ بات بھی روتھن کے لئے باعث حیرت تھی کہ یہ اشیاء انہیں کہاں سے حاصل ہوئیں۔

ذی آنا کی اس پر اسرار آبادی کی کہانی بھی دلچسپ تھی۔ یہ چیزیں روتھن کے سامنے رکھ دی گئیں اور روتھن مربھکوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ خوبصورت تتلیاں اسی طرح اپنے سفید بازو پھیلائے ہوئے پرواز کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ یہ تینوں کم سن لڑکیاں تھیں جو بے حد حسین تھیں۔

روتھن نے اپنا معدہ پر کرتے ہوئے سوچا۔ ذی آنا کی آبادی کا یہ حصہ کم از کم حسن و جمال میں بے مثال ہے۔ مرد بھی خوش شکل تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں تو بے حد حسین تھیں۔

پتہ نہیں یہ سب کیا چکر ہے جب معدہ پر ہو جاتا ہے تو دماغ کے راستے بھی کھل جاتے ہیں۔ بالآخر کچھ نہ کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔ دفعتہً اس نے چونک کر کہا۔

"عظیم سیلان! کیا تو میرے ساتھ ان اشیاء میں شریک نہیں ہوگا کہ یہ آداب میزبانی کے خلاف ہے؟"

جواب میں بوڑھے کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے زندگی کی ان نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تو اچھی طرح اپنا معدہ پر کر لے، اس کے بعد میں تجھ سے گفتگو کروں گا۔"

روتھن نے شانے ہلائے اور سامنے رکھی ہوئی چیزیں صاف کرتا رہا۔ اب اسے دوسری چیزوں سے غرض نہ رہ گئی تھی۔ پھر جب اس نے اچھی طرح کھا پی لیا تو پتھر کی پلیٹیں ایک جانب سرکا دیں اور ایک لمبی ڈکار لے کر بوڑھے سے بولا۔ "اب اگر تو چاہے تو مجھے سینکڑوں کہانیاں سنا سکتا ہے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

بوڑھے سیلان نے آہستہ سے کہا۔ "تو پہلے میرے بدن کو ٹٹول کر دیکھ۔ اس سے تجھے تیرے سوال کا جواب مل جائے گا۔ میں پتھر کا ہوں۔"

روتھن اچھل پڑا۔ اس دوران میں اس نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ بوڑھے کے پورے وجود میں صرف اس کی آنکھیں جاندار ہیں اور ہونٹ ہل رہے ہیں، اس کے علاوہ اس کے پورے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ بوڑھے کے ان الفاظ نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے بوڑھے کے چہرے پر انگلی پھیر کر دیکھا۔ درحقیقت اس کی انگلی پتھر کے گالوں سے ٹکرائی تھی اور روتھن ششدر رہ گیا تھا۔ گھاس کے نیچے چھپے اس بوڑھے کے سارے جسم کو اس نے ٹٹول ڈالا۔ پتھر کے مجسمے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ایک انتہائی پراسرار صورت حال تھی۔ چنانچہ روتھن کو اب اس سلسلے میں سنجیدہ ہو جانا پڑا تھا۔



زیراس سیمون سے ملاقات کرنے کے بعد باہر آ گیا تھا اور پھر اس نے قہوہ خانے ہی کا رخ کیا تھا۔ اس کا دماغ بہت الجھا ہوا تھا۔ قہوہ خانے میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد اس نے جھلائے ہوئے انداز میں سوچا کہ کل دن کی روشنی میں وہ بستی شمالہ سے نکل جائے گا۔ روتھن کو آخر کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ ڈھول اور سازوں کی آوازیں سنتے ہی پاگلوں کی طرح اس جانب دوڑ پڑا تھا۔ خود مصیبت میں گرفتار ہوا تھا اور دوسروں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ واقعی بعض اوقات اس کی قربت زیراس کے لئے بہت الجھنوں کا باعث بن جاتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے روتھن کے بارے میں سوچنا ہی ترک کر دیا تھا۔

پھر رات کے کسی پہر اسے سیمون کے الفاظ یاد آئے۔ اس کا کہنا تھا کہ شمالہ بستی اس عذاب کا شکار ہے اور اگر وہ شمالہ کو اس عذاب سے نجات دلا سکے تو سیمون تاجِ سرداری اس کے حوالے کر دے گی۔ تاجِ سرداری تو زیراس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن یہ للکار زیراس کے لئے بہت اہمیت رکھتی تھی اور چلتے ہوئے اس نے سیمون سے کہا تھا کہ اب شمالہ کے گرد منڈلانے والی ارواح خبیثہ کے آخری لمحات قریب آ گئے ہیں۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کے ذہن میں جوش اور ولولہ تھا لیکن اب ہوش پکار رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ نظر نہ آنے والی روحوں کے خلاف آغاز جنگ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ دل ہی دل میں وہ روتھن کو کوسنے لگا تھا اور کہہ رہا تھا کہ روتھن اگر تو میرے ساتھ ہوتا تو

شاید اتنی الجھنوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پھر جب زیراس کی آنکھوں میں نیند اتری تو اس نے آخری فیصلہ یہی کیا تھا کہ کل نہ صرف روتھن کو تلاش کرے گا بلکہ شالہ کے ان ویرانوں میں جہاں سے گزرنے والے صرف لاشوں کی شکل میں کسی کو ملتے تھے، گشت بھی کرے گا اور ان روحوں کو تلاش بھی کرے گا۔

دوسری صبح اس نے قہوہ خانے کے مالک سے ناشتہ طلب کیا۔ سہمے ہوئے بوڑھے نے زیراس کی طلب کردہ اشیاء اس کے سامنے رکھ دیں۔

آج ہیرک نظر نہیں آ رہا تھا لیکن زیراس کا ذہن اس طرح الجھا ہوا تھا کہ اس نے ہیرک کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور پھر وہ اس کے کسی کام کا بھی تو نہیں تھا۔ ہاتھیوں جیسا ڈیل ڈول رکھتا تھا لیکن چوہے سے کم نہیں تھا۔

زیراس کو بستی شالہ کے لوگوں کے بارے میں یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بستی میں ایک بھی ایسا جیالا نہیں ہے۔ جو اتنے تن و توش سے مطابقت رکھتا ہو۔ کسی کا گریبان پکڑ کر اس کے دو چار ہاتھ جھاڑ دو، وہ گریبان کی شکنیں درست کرتا ہوا چلا جائے گا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں خوف اس طرح بٹھا دیا گیا تھا کہ کم از کم کسی اجنبی سے وہ تلخ آواز میں بھی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ جیسا کہ سیمون نے کہا کہ یہاں کا کوئی شخص ان پراسرار روحوں کے خلاف زبان نہیں کھولے گا۔ زیراس کو اس کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا اور اب ان لوگوں سے پوچھنا حماقت کے مترادف تھا۔

روتھن کے گھوڑے کی لاش تو مل چکی تھی لیکن روتھن کے جینے یا مرنے کے نشان کہیں نہیں ملے تھے۔ البتہ زیراس نے بستی شالہ سے باہر نکلتے ہوئے اس طرح کا بندوبست ضرور کر لیا تھا کہ اگر اسے بہت سے دن اور بہت سی راتیں صحرا میں گزارنی پڑیں تو کم از کم خوراک اور پانی کی تکلیف نہ ہو اور اس کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر

چل پڑا تھا۔

ایک بار پھر اس نے وہیں سے اپنے سفر کا آغاز کیا جہاں روتھن کے گھوڑے کی لاش ملی تھی۔ یہاں کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا کہ گھوڑے پر چلائی جانے والی گولیوں سے بچ کر روتھن کون سا رخ اختیار کر سکتا ہے؟ آخری فیصلہ تو مشکل ہی تھا۔ نہ ہی اسے اس قسم کے کچھ نشانات ملے تھے جو اس کی رہنمائی کرتے۔ بس اپنے ذہن کے فیصلے پر عمل کرتا ہوا وہ ایک سمت میں آگے بڑھ گیا تھا۔

شالہ کے نواحی علاقے بھی خوب تھے۔ کہیں بدنما بھدی اور تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانیں اور کہیں سرسبز گھاس کے وسیع و عریض میدان...... جن میں خودرو پھولوں کے دور دور تک پھیلے ہوئے پودے بھی تھے اور سبز گھاس اور دوسرے درخت بھی نظر آ جاتے تھے۔

نہ جانے وہ کتنا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ سورج ایک نخلستان میں ڈوبا تھا جہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ پتھروں سے ابل کر گھاس کو سیراب کرتا ہوا دور دور تک پھیل جاتا تھا۔ لمبی لمبی سرسبز گھاس میں پانی بھرا ہوا تھا لیکن پتھریلی زمین پر کہیں دلدل نہیں پیدا ہوئی تھی۔

زیراس نے ایک جگہ منتخب کی اور گھوڑے کو گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ چھاگل سے پانی پینے کے بعد اس نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے تھوڑا بہت کھایا۔ رائفل کو اس نے اپنی زندگی سے زیادہ سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کے پاس یہی ایک ایسا سہارا تھا جو اسے مدد دے سکتا تھا۔ کمر سے کلہاڑا ابھی لٹکا ہوا تھا لیکن ان دونوں چیزوں کو احتیاط سے رکھنا بے حد ضروری تھا۔

پتھر کی ایک چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ مختلف باتیں سوچ رہا تھا۔ رات کے کسی پہر اسے نیند آ گئی تھی۔ دوسری صبح اس نے پھر صحرا گردی شروع کر دی اور اس بار سمت ذرا سی تبدیل کر دی تھی۔ اگر کہیں کوئی نشان مل جاتا تو آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی

لیکن یوں لگتا تھا جیسے روتھن آسمان کی طرف پرواز کر گیا ہو۔

نخلستان ختم ہوا تو اس بار ایک زیادہ ہولناک صحران اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ دور دور تک باریک باریک پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان کے درمیان چٹان نما ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سبزے کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ بات بھی عجیب وغریب تھی۔ نخلستان اور چٹیل علاقوں کے درمیان کچھ اس طرح حد بندی ہو جاتی تھی جیسے انسانی ہاتھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو حالانکہ یہ تمام چیزیں قدرتی ہی ہوتی تھیں۔

زیراس کا گھڑا ان نوکیلے پتھروں پر سست رفتاری سے سفر کرتا رہا اور چلچلاتی ہوئی دھوپ اور آگ برساتا ہوا سورج دونوں کے سروں سے گزرتا رہا۔

صحرا اتنا وسیع تھا کہ زیراس کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ آنے والے وقت میں اسے دقت پیش آ سکتی ہے۔ بہر حال وہ ایسی مشقتوں کا عادی تھا۔ گھڑے کی پشت پر تھا۔ اس نے نہ جانے کتنا طویل عرصہ ہولناک صحراؤں میں سفر کرتے گزار دیا تھا لیکن وہ سفر بہت دلچسپ ہوتا تھا جس میں روتھن ساتھ ہو۔ کم از کم زبان خاموش نہیں رہ پاتی تھی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔ روتھن خاموش رہنا جانتا ہی نہیں تھا۔

صحرا میں دوسرا دن زیادہ سخت ثابت ہوا۔ چلچلاتا ہوا سورج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چیز کو جھلسا دے گا۔ زمین تپ رہی تھی۔ اس دن گھوڑا بھی بہت زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ زیراس نے سفر کے لئے کوئی ایسی سمت اختیار نہیں کی تھی جسے خاص طور پر نگاہوں میں رکھا گیا ہو۔ بس اس کی نظریں بھٹکتی رہی تھیں اور وہ روتھن کا متلاشی رہا تھا۔

شام ہوئی تو موسم تبدیل ہونا شروع ہو گیا لیکن صحرا ختم نہیں ہوا تھا۔ راستوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں رکھا گیا تھا کہ کون سے راستوں سے گزر کر وہ اس طرف آیا تھا۔ چنانچہ یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ واپسی میں کسی نخلستان کا رخ کیا جائے۔ بستی شالہ کے بارے میں ابھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اب اس تک واپسی کے لئے

کون سے راستے صحیح ثابت ہو سکتے ہیں۔

شام تک وہ کچھ نڈھال ہو گیا تھا۔ ایک بڑے ٹیلے کے عقب میں اس نے گھوڑے کو ایک بڑے پتھر سے باندھ دیا۔ جگہ ایسی نہیں تھی کہ گھوڑے کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ خود اپنے لئے تھوڑا سا حصہ صاف ستھرا کیا اور وہاں ایک پتھر سر کے نیچے رکھ کر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ سورج کے چھپ جانے کے بعد موسم میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تھیں۔ زیراس نے گھوڑے کی پشت خالی کر دی تھی۔ سامان کا انبار اس کے پاس موجود تھا۔ رائفل میں کارتوس لگے ہوئے تھے اور زیراس پوری طرح تیار تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی خطرہ ہو تو رائفل استعمال کی جا سکے۔

وقت گزرتا رہا۔ کھانے پینے کی کچھ اشیاء اس نے معدے میں اتار لیں تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ چاند ابھرنے لگا تھا۔ زیراس تھکن سے نڈھال ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور بند آنکھوں میں نیم غنودگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن گھوڑے کی مخصوص کھر کھر نے اسے جگا دیا۔ گھوڑا یہ آواز اسی وقت نکالتا تھا جب وہ کوئی اجنبی شے دیکھ لیتا تھا۔

زیراس کا ہاتھ برق رفتاری سے رائفل پر جا پڑا تھا۔ رائفل اپنے قبضے میں لینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ گھوڑا کسی اجنبی شے کو دیکھ کر مخصوص انداز میں ہنہنایا تھا۔ اس نے ایک انسانی سائے کو کچھ فاصلے پر چلتے دیکھ لیا تھا۔ زیراس اس پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ انسان کون ہو سکتا ہے؟ ان ویرانوں میں کوئی تنہا اجنبی پہلی بار اسے نظر آیا تھا۔ زیراس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں وہ روتھن نہ ہو لیکن جب تک اس کی صورت واضح نہ ہو جاتی اسے آواز دینا مناسب نہیں تھا۔

آنے والے نے یا تو گھوڑے کے منہ سے نکلنے والی کھر کھراہٹیں سنی نہیں تھیں یا

بہرہ تھا یا پھر جان بوجھ کر اسی طرف آ رہا تھا اور شاید اسے بھی صحرا میں کسی انسان کی تلاش تھی۔ پھر وہ کچھ اور قریب آیا تو چاندنی میں زیراس نے کم از کم یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ وہ روتھن نہیں ہوسکتا۔ آنے والے کا تن و توش روتھن سے کہیں زیادہ تھا۔ پھر جب کچھ خدوخال نمایاں ہوئے تو زیراس بری طرح اچھل پڑا۔ یہ تو ہیرک تھا...... یہ کم بخت یہاں کہاں سے آ مرا۔ اور وہ بھی پیدل......

زیراس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اسی لمحے اس نے سوچا جو کچھ بھی ہے کم از کم ہیرک بستی شمالہ میں سب سے زیادہ پراسرار شخصیت کا مالک ہے اور اس شخص کو ایک مجہول سا انسان سمجھ کر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے۔

ہیرک کا رخ زیراس کی جانب نہیں تھا۔ حالانکہ زیراس کا گھوڑا اس وقت جس رخ پر تھا اسے دیکھ لئے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی تھی لیکن یا تو ہیرک نے زیراس کا گھوڑا دیکھا نہیں تھا یا وہ نشے میں تھا یا پھر اس نے اگر دیکھ بھی لیا تھا تو کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

ہیرک ایک ایسی چٹان کے پاس پہنچ گیا جو جڑواں تھی۔ یعنی دو الگ الگ چٹانیں درمیان سے کچھ اس طرح جڑ گئیں تھیں جیسے دو انسان آپس میں ہاتھ ملا رہے ہوں۔ ہیرک اس کے پاس جا بیٹھا اور پھر زیراس نے ایک اور منظر دیکھا۔ چاندنی نے ہر چیز واضح کر دی تھی۔ اس لئے زیراس کو کافی فاصلے تک کی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ہیرک نے اپنے کمرے میں لٹکی ہوئی پیٹی سے ایک عجیب سی چیز نکالی۔ یہ چھوٹی سی ایک کدال تھی۔ اس نے ہاتھ ملاتی ہوئی چٹان کے دامن میں ایک جگہ کھدائی شروع کر دی اور زیراس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ اب اس کے لئے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بدبخت شرابی یہاں کیا کر رہا ہے اور اتنا فاصلہ اس نے پیدل کیسے طے کیا؟ جبکہ زیراس کو اتنا فاصلہ گھوڑے کی پشت پر بھی طے کرتے ہوئے بہت دشواری اٹھانا پڑی تھی۔

یہ منظر اس کے لئے حیرت ناک تھا۔ چنانچہ وہ خود کو اس جگہ محدود نہ رکھ سکا۔ اس نے اپنی رائفل ہاتھ میں اٹھائی۔ کلہاڑی کمر میں لٹکائی اور آہستہ آہستہ چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا تاکہ ہیرک کو اس کے بارے میں معلوم نہ ہوسکے۔ حالانکہ یہ ایک بیکار کوشش تھی کیونکہ زیراس کا گھوڑا تو سامنے ہی تھا۔ اس نے ہیرک کو اپنے کام میں مصروف دیکھا۔

ہیرک جس زمین کی کھدائی کر رہا تھا وہ شاید بہت زیادہ سخت نہیں تھی۔ کیونکہ ہیرک نے باآسانی کافی مٹی ادھر ادھر انبار کر دی تھی اور اس کے بعد زمین سے جو شے برآمد ہوئی، اسے دیکھ کر زیراس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ایسا ہی مٹکا تھا جیسے مٹکے اس نے شراب خانے میں دیکھے تھے یعنی جن میں شراب بھری ہوئی تھی۔ ہیرک نے ایک مٹکا نکال کر ایک جگہ رکھا اور پھر دوسرا پھر آخر میں تیسرا مٹکا بھی نکال لیا۔ اس کے بعد اس نے یہ تمام مٹی اسی طرح برابر کر دی۔ کدال کو ایک جانب رکھا اور پھر مٹکے کا منہ کھولنے لگا۔

زیراس کے لئے اب رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ بے آب و گیاہ علاقہ جہاں تک پہنچنے کے لئے بھی انسان کو ہزارہا مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، یہاں اس شراب کے تین دفن شدہ مٹکے...... یہ شخص ہے کیا بلا! ہیرک کی شخصیت اسے بے حد پراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ یہ شرابی یقینی طور پر ایک عام انسان نہیں تھا۔

پھر شاید ہیرک نے بھی اس کے قدموں کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ شراب کے مٹکے کا ڈھکن کھل گیا تھا اور ہیرک اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہونٹوں سے لگانے جا ہی رہا تھا کہ زیراس کی رائفل کی نال مٹکے پر جا لگی اور ہیرک منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا پھر اس کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"او جیالے تو تو ابھی تک یہیں بھٹک رہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہ

آئی کہ چٹان سے بندھا ہوا وہ گھوڑا تیرا ہی ہوسکتا ہے۔ جو اس طرح کھر کھرا رہا ہے جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن اپنے اس آگ اگلنے والے ہتھیار کو تو پیچھے ہٹا لے جس سے تو نے اس مقدس شے کو چھوا ہے، نہیں......نہیں یہ مناسب نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ جب تک یہ شراب میرے معدے میں نہ اتر جائے، میں تجھ سے گفتگو کے قابل ہوسکوں۔''

''اوئے بے وقوف......اوہ احمق شرابی، بہتر ہے کہ اس مٹکے کو نیچے رکھ دے اور میں تجھ سے جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دے ورنہ میرا نام زیراس ہے اور میں اس وقت جس ذہنی کوفت کا شکار ہوں وہ مجھے کسی نرمی کے لئے آمادہ نہیں کرسکتی۔''

''ایک بار پھر میں تجھ سے کہہ رہا ہوں اجنبی! جو کچھ تجھے پوچھنا ہے، ضرور پوچھ لینا۔ پہلے مجھے اپنی پیاس تو بجھانے دے۔ یہ جب تک میرے معدے میں نہ اترے گی میں پیاسا رہوں گا اور میرا جی کچھ کہنے کو نہ چاہے گا۔''

زیراس کو غصہ آگیا۔ اس نے پوری طاقت سے شراب کے مٹکے کو بندوق کی نال سے دھکیل دیا اور مٹکا ہیرک کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ شراب زمین پر بہہ گئی اور ہیرک بری طرح اچھل پڑا۔ وہ ہاتھوں پیروں کے بل جھک کر کتے کی طرح زمین پر بہنے والی شراب چاٹنے لگا لیکن تپتی ہوئی زمین نے بہتی ہوئی شراب کو آن کی آن میں خود میں جذب کرلیا تھا۔ وہ خالی مٹکے کو اٹھا کر ٹٹولنے لگا اور پھر دفعتہً اس کے چہرے پر خونخوار تاثرات نظر آنے لگے۔ اس نے خونی نگاہوں سے زیراس کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''لوگ شالہ کے رہنے والوں کو گالیاں دیتے ہیں، انہیں تھپڑ مار دیتے ہیں، کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور وہ کسی سے کچھ نہیں بولتے۔ لیکن میرا نام ہیرک ہے اور میں اس مقدس شے کی بے حرمتی برداشت نہیں کرسکتا۔ آگ اگلنے والے ہتھیار کو رکھ کر بات کر اجنبی! تو نے نہ جانے کیوں ہیرک کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے جبکہ میں نے تجھ سے کوئی ایسی تلخ

بات نہیں کی۔ تاہم تجھے زمین پر گری ہوئی شراب کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔''

''یہ معاوضہ تیرے خون کی شکل ہی میں ہوسکتا ہے۔ میں ایک بار پھر تجھے آگاہ کر رہا ہوں کہ مجھ سے بات کر اور اس کے بعد شراب کے یہ دونوں مٹکے پی جا مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں اس تیسرے مٹکے کی بات کر رہا ہوں جو تو نے زمین پر بہا دیا ہے اور سن اس کے عوض مجھے تیرے بدن سے اتنا ہی خون درکار ہے جتنی شراب اس مٹکے میں موجود تھی۔''

ہیرک نے قریب رکھی ہوئی کدال اٹھائی اور زیراس کو اس کی آنکھوں میں خون جھلکتا ہوا نظر آیا۔

زیراس نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر اپنی رائفل ایک جانب اچھال دی۔ ساتھ ہی اس نے کمر سے لٹکی ہوئی کلہاڑی نکال لی تھی۔ اگر ہیرک کے پاس آتشیں ہتھیار ہوتا تو اس وقت مقابلہ آتشیں ہتھیار سے مناسب ہوتا لیکن اس کے ہاتھ میں کدال تھی اور کلہاڑی ہی سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔

ہیرک پینترے بدلنے لگا۔ زیراس کو بخوبی محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت ایک خونخوار لڑاکا اس کے سامنے ہے جبکہ اس سے پہلے اس نے ہیرک کو ایک عجیب و غریب مجہول سے انسان کی حیثیت سے دیکھا تھا۔

''یہ کدال میں تیرے جسم کے کسی حصے میں گاڑ کر اس سے اتنا خون نکالوں گا کہ یہ مٹکا بھر جائے اور اس کے بعد میرے اور تیرے درمیان جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ تو اگر اس کے بعد بھی جنگ کرنا چاہے گا تو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن اتنا خون تجھے دینا ہی پڑے گا اجنبی!''

جواب میں زیراس نے کلہاڑے والا ہاتھ گھما دیا تھا۔ ہیرک نے وہ کلہاڑا اپنی کدال پر روکا۔ اگر وہ چاہتا تو اس وار کو پیچھے ہٹ کر خالی دے سکتا تھا لیکن کدال سے وار

روکنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ زیراس سے باقاعدہ جنگ کرنا چاہتا ہے اور درحقیقت اس نے جیسے کلہاڑے کو اپنی کدال پر روکا تھا، وہ اس کی جنگی صلاحیتوں کا غماز تھا۔

زیراس کو ایک لمحے میں یہ اندازہ ہوگیا کہ مدمقابل سے جنگ کرنے کے لئے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا اور اس کے بعد وہ محتاط انداز میں ہیرک سے جنگ کرنے لگا تھا۔

کلہاڑی اور کدال آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور چنگاریاں فضا میں اڑ رہی تھیں۔ ہیرک بڑے نپے تلے حملے کر رہا تھا لیکن مدمقابل کے بارے میں شاید بہت ہی جلد اسے اندازہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ اب اس کے حملوں میں احتیاط آگئی تھی۔ وہ جوش جنوں میں جنگ کر رہا تھا ورنہ شاید زیراس کے دو چار حملوں کے بعد ہی اسے پسپائی اختیار کرلینی چاہئے تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے زیراس کا وار تو اپنی کدال پر روک لیا تھا لیکن اس کا گھٹنا زمین سے جا ٹکا تھا اور ایسے لمحے میں اگر زیراس چاہتا تو فوری طور پر پیچھے ہٹ کر اس کے سر کو نشانہ بنا سکتا تھا اور اس صورت میں شاید ہیرک اپنے سر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے نہ بچا سکتا تھا لیکن وہ باظرف جنگجو تھا اور جانتا تھا کہ مدمقابل کو پوری مستعدی سے جنگ کرنے کا موقع دیا جائے تو جنگ کا لطف ہی الگ ہوتا ہے اور اگر اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ختم کر دیا تو پھر جنگ دشمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتی، جبکہ ان دونوں میں باقاعدہ کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس غصے کا اظہار تھا جو ہیرک نے اس لئے کیا تھا کہ زیراس نے اس کی شراب کا مٹکا توڑ دیا تھا اور زیراس اس سے جنگ اس لئے کر رہا تھا کہ وہ روتھن کی تلاش میں سرگرداں اور جھنجلاہٹوں کا شکار تھا۔

دونوں خوں خوار وحشی چاندنی رات میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور دونوں ایسے ایسے داؤ پیچ دکھا رہے تھے کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جائیں لیکن یہاں چٹانوں کے علاوہ اور کوئی دیکھنے والا موجود نہ تھا۔

پھر دفعتاً ہی ہیرک نے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ اس کا سر پتھر سے ٹکرایا تھا اور کدال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ اس نے پلٹ کر وحشیانہ نگاہوں سے زیراس کو دیکھا۔ اس لمحے اسے یقین تھا کہ اب چونکہ کدال بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی ہے اور مدمقابل کو اس پر مکمل فتح حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہ ضرور اس پر حملہ کر دے گا۔ ہیرک اپنے آپ کو اس حملے سے بچانے کا خواہش مند تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ زیراس اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اپنا کلہاڑا ہلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک خوفناک درندگی پائی جاتی تھی لیکن یہاں بھی اس نے کم ظرفی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اس کی غراہٹ ابھری۔

”شالہ کے واحد دلیر اٹھ اور اپنی کدال اٹھا۔ میں اس وقت تک تجھے قتل نہیں کروں گا جب تک کہ تیری کدال تیرے ہاتھ میں نہ ہو اور تو مجھ سے جنگ نہ کر رہا ہو۔“

ہیرک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی سے بہتا ہوا خون چہرے پر پھیلتا ہوا سینے تک آنے لگا۔ تب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنا خون ہاتھوں پر مل لیا۔ چاند کی روشنی میں اس نے سرخ سرخ ہاتھوں کو دیکھا اور پھر نہ جانے اس کے چہرے پر کیسے تاثرات پیدا ہوگئے۔ دفعتاً ہی اس نے اپنا خون زبان سے چاٹنا شروع کر دیا۔ پیشانی سے بہتے ہوئے خون کو وہ دیر تک اپنے ہاتھوں پر لگا لگا کر چاٹتا رہا اور زیراس متحیرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر دفعتاً ہی ہیرک ہنس پڑا تھا۔

”بس...... بس یہ مذاق اب ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر تو میرے اور اپنے درمیان فتح اور شکست کا فیصلہ چاہتا ہے تو میں نے اپنی شکست قبول کر لی۔ دیکھ لے میرا ہتھیار مجھ سے کئی گز کے فاصلے پر پڑا ہوا ہے اور اب میں اسے اٹھانا نہیں چاہتا۔“

”تو پھر یہ بتا کہ شراب کے یہ مٹکے یہاں کہاں سے آگئے اور تو اتنا طویل فاصلہ طے کر کے یہاں کیسے پہنچ گیا؟ میرا سوال برقرار ہے۔“ زیراس نے غراتے ہوئے لہجے

میں کہا اور ہیرک ایک بار پھر ہنس پڑا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم آگے بڑھا اور شراب کے مٹکوں کو زوردار ٹھوکریں ماردیں۔ مٹکے اچھل کر چٹانوں سے ٹکرائے اور ٹوٹ گئے۔ ساری شراب زمین پر بہہ گئی تھی۔ ہیرک نے اپنی جیب سے ایک کپڑا نکال کر اپنی پیشانی کے زخم پر کس کے باندھ لیا اور آہستہ سے بولا۔

''میرے ساتھ آنا پسند کرے گا اجنبی! آ...... میں تجھے وہ تمام باتیں بتا دوں جو تو پوچھنا چاہتا ہے۔''

''لیکن میرا گھوڑا یہاں موجود ہے۔''

''اس کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تجھے زیادہ طویل فاصلہ طے نہیں کرنا پڑے گا۔''

زیراس نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور اس کے بعد وہ گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ پہلے اس نے اپنی رائفل اٹھائی اور اس کے بعد گھوڑے کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی رسی پتھر سے کھول لی۔ ہیرک بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا۔ جب زیراس اس کے قریب پہنچا تو اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ ساتھ چلا آ اور یہ نہ سوچنا کہ میں نے تجھے تیرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں یہ سفر تیرے سوال کا جواب دینے کے لئے ہی طے کر رہا ہوں۔''

زیراس نے کچھ نہیں کہا۔ ہیرک آگے آگے چل پڑا تھا۔



زیراس اطراف سے چوکنا بھی تھا۔ ہاں ہیرک سے جنگ ختم ہو جانے کے بعد یہ احساس ایک بار پھر اس کے ذہن میں پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شخص شمالہ کا واقعی سب سے پراسرار شخص ہے اور ہو سکتا ہے اس کا ان روحوں سے کوئی تعلق ہو جن کی کہانیاں شمالہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔

وہ آگے بڑھتے رہے اور تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ایسے درے میں داخل ہو گئے جس کے دونوں سمت اونچی اونچی پہاڑی دیواریں ابھری ہوئی تھیں۔

زیراس اب تک صبر و سکون کے ساتھ یہ سفر طے کرتا رہا تھا۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ دیوانہ ہیرک جانے اسے کہاں لئے جا رہا ہے، یہ شخص تو ویسے ہی ذہنی طور پر معطل سمجھا جاتا تھا۔ کہیں اس کے ساتھ یہ بھاگ دوڑ حماقت نہ ہو۔ چنانچہ جب درے میں بھی سفر کرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تو اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرے ہاتھ میں رائفل ہے اور تیری پشت میری جانب۔ جی چاہ رہا ہے کہ اس رائفل کی گولی تیری پشت میں اتار دوں۔''

جواب میں ہیرک نے پلٹے بغیر قہقہہ لگایا تھا اور پھر ہنستا ہوا بولا تھا۔

''لیکن میں جانتا ہوں تو ایسا نہیں کرے گا اور شاید میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیری اس جھلاہٹ کی وجہ کیا ہے۔ لیکن ابھی بس ایک موڑ مڑنے کے بعد اس درے کا سفر ختم ہو جائے گا اور تو ایک دلچسپ منظر دیکھے گا۔''

زیراس خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ موڑ بھی آ گیا جس کا تذکرہ ہیرک نے کیا تھا۔ زیراس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا، ایسی کون سی بات تھی جو اس کے لئے حیرت ناک ہو، لیکن چند لمحات کے بعد درہ بھی ختم ہو گیا۔

''درہ ختم ہو گیا ہے ہیرک۔'' زیراس نے غرا کر بولا۔

''بائیں سمت نگاہ دوڑاؤ۔'' ہیرک نے کہا اور زیراس کی نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی۔ اس طرف کچھ مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

''کوئی بستی ہے یہ؟'' زیراس کے منہ سے نکلا۔

''اور غور سے دیکھ اجنبی سورما۔'' ہیرک نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''شمالہ کے گدھے، میرے لئے اب اور برداشت کرنا مشکل ہے۔ بہتر ہے تو خود زبان کھول دے۔''

''یہ بستی شمالہ ہے۔'' ہیرک نے کہا اور زیراس چکرا کر رہ گیا۔

''شمالہ!''

''ہاں، تو بستی کے گرد ہی چکراتا رہا ہے زیراس، یہاں سے دور ہی کتنا نکلا تھا تو، بس اس درے کی دوسری طرف اور اب تجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ میں یہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ میں ویرانوں کا رسیا ہوں اور دلربا میری ساتھی وہ میرے ساتھ ان ویرانوں میں ہوتی ہے اور یہ دنیا مجھے حسین نظر آتی ہے لیکن......''

زیراس نے اس لیکن کے آگے کچھ نہ پوچھا۔ ہیرک کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اگر تو میرے ساتھ چلتا ہے تو آج بہت سے راز تجھ پر کھل جائیں گے۔''

''تو نے شراب کے مٹکے توڑ دیئے۔'' زیراس نے کہا۔

''ہاں۔ بہت عرصہ بعد میں نے خون کا مزا چکھا ہے۔ خون جو مجھے سب سے زیادہ مرغوب تھا، میری مرغوب غذا تھی۔ مگر اس خون کے عشق میں، میں نے اپنی ایک محبوب ہستی کھو دی اور اس کے بعد میں نے خون چاٹنا چھوڑ دیا۔ مگر زیراس تو نے...... تو نے ہیرک کو اس کا خون چٹا دیا اور میں نے شراب چھوڑ دی...... سمجھا، میں نے شراب چھوڑ دی۔''

''کیا تو اب شراب نہیں پیئے گا۔'' زیراس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نہیں، اشتالہ کی قسم نہیں، اس طرف جیالے، اس طرف وہ میرا گھر ہے۔'' ہیرک نے ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

زیراس کی نگاہیں اس ویران کھنڈر کی جانب اٹھ گئیں جس میں شاید ایک بھی کمرہ ثابت نہیں تھا، اینٹیں چاروں طرف انبار کی صورت میں تھیں اور گھر میں داخل ہونے

والے دروازے کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ زیراس ہنس پڑا۔

''وہ تیرا گھر ہے؟ میرا خیال ہے شراب کا نشہ ابھی تک تجھ پر طاری ہے۔''

''میرے ساتھ چلا آ اجنبی جوان! تجھ پر بہت سی حیرتوں کے انکشاف ہوں گے۔ لیکن میں نے تجھ سے درخواست کی ہے کہ میرے ساتھ تعاون کر اور یہ تعاون تیرے حق میں برا نہ ہوگا، نہ میں تیرا تعاقب کر رہا تھا اور نہ مجھے تیری ذات سے کوئی دلچسپی تھی لیکن اب سب کچھ ہو گیا ہے اور تو نے میرے مردہ وجود میں زندگی دوڑا دی ہے۔ ایک بار پھر مجھے خون کا مزہ چکھا دیا ہے۔ تو بہتر ہے میرے ساتھ تعاون کر اور اگر تو یہ محسوس کرے کہ میں تیرے لئے باعث دلچسپی نہیں تو تجھے اختیار ہوگا کہ مجھے ٹھوکر مار دینا۔'' ہیرک کے لہجے میں عاجزی تھی۔

زیراس خاموشی سے اس کے ساتھ کھنڈر کی جانب بڑھ گیا۔ کافی وسیع جگہ تھی۔ ہیرک نے دروازے کے نشان کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔

''کبھی میرا یہ گھر شمالہ بستی کے دوسرے تمام گھروں سے زیادہ خوبصورت تھا لیکن اب اس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کی تصویر ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں میری دلچسپیاں ختم ہو گئی ہیں، آ میں تجھے وہ تمام چیزیں دکھاؤں جو کبھی اس گھر کی زینت تھیں۔''

''کیا تو اب بھی اس گھر میں رہتا ہے؟'' زیراس نے پوچھا۔

''نہیں، میں کبھی اس گھر میں رہتا تھا۔ اب یہاں میری یادیں رہتی ہیں لیکن اب میں اتنا بددل نہیں ہوں کیونکہ خون کی طلب دنیا کی ہر طلب سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ دیکھ یہ میرا آرام کا کمرہ ہے اور اس کی تہوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو لوگوں کو اتنا ملے گا کہ وہ سرشار ہو جائیں گے لیکن شمالہ میں کوئی ایسا جیالا نہیں ہے جو اس احاطے کو عبور کر سکے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے، ہیرک کی ملکیت ہے اور یہ دیکھ، اس طرف وہ جگہ ہے جہاں میں اپنی محفلیں سجاتا تھا۔ آ میرے ساتھ آ۔'' ہیرک نے

کہااور زیراس ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

اینٹوں پر سے گزرنا بہت مشکل کام تھا۔ پھر ایک اور ٹوٹے کمرے میں پہنچنے کے بعد ہیرک نے مسکراتی نگاہوں سے زیراس کو دیکھا اور پھر اپنی وہ چھوٹی کدال پیٹی سے نکال لی جس سے اس نے زیراس سے جنگ کی تھی اور واپسی میں جسے اپنے ساتھ لیتا چلا آیا تھا۔ اس نے ایک جگہ سے چند اینٹیں ہٹائیں اور وہ جگہ صاف ستھری کرنے کے بعد کدال سے اس کی کھدائی کرنے لگا۔

زیراس ایک بار پھر ہنس پڑا تھا۔ ''کیا یہاں بھی شراب کے مٹکے دفن ہیں؟''

ہیرک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک مخصوص نشان لگا کر کھدائی کرنے لگا، اور اس نے وہاں سے کافی مٹی ہٹادی۔ زیراس کو اندازہ نہیں تھا کہ اس گڑھے سے کیا برآمد ہوگا لیکن تھوڑی دیر بعد اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کدال لوہے کی کسی شے سے ٹکراتی ہو۔ ہیرک نے کدال ایک جانب ڈال دی اور اس کے بعد وہ مٹی صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے گڑھے میں ہاتھ ڈال کر لوہے کے کسی صندوق کا ایک ڈھکنا سا ہٹا دیا اور اس کے بعد لوہے کے صندوق سے کچھ چیزیں نکال نکال کر اس نے باہر ڈھیر کر دیں۔

زیراس خاموشی سے اس کی ان تمام کارروائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ویسے اسے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اتنا طویل سفر طے کرنے کے باوجود بستی شالہ کے آس پاس ہی موجود تھا۔ غالباً یہ راستوں کی بھول بھلیاں تھیں جنہوں نے اسے زیادہ دور نہیں جانے دیا تھا۔ زیراس کو اس بات پر جھنجھلاہٹ بھی تھی لیکن اب وہ ہیرک کی جانب متوجہ ہوسکتا تھا اور اسے اس شخص کی شخصیت سے کچھ دلچسپی سی محسوس ہو رہی تھی چنانچہ وہ صبر وسکون کے ساتھ ہیرک کی حرکتیں دیکھتا رہا۔

ہیرک نے اپنے بدن کا بوسیدہ لباس اتار پھینکا اور صندوق سے برآمد ہونے والے چمڑے کے ایک خوبصورت لباس کو اپنے جسم پر سجانے لگا جو غالباً اسی کا تھا کیونکہ

اس کے بدن پر بالکل فٹ آیا تھا۔ زیریں لباس بھی اس نے پہنا اور پھر کسی موٹی کھال والے جانور کے بھدے قسم کے جوتے اس نے اپنے پیروں میں پہنے اور ان میں لٹکی ہوئی رسیاں باندھنے لگا۔ ویسے ہی قدآور تھا۔ چمڑے کے اس قیمتی لباس نے اس کے جسم کی بناوٹ نمایاں کر دی اور زیراس تحسین آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ویسے بھی وہ ہیرک کی جنگی صلاحیتوں کا معترف ہوگیا تھا کیونکہ ہیرک نے اس سے جو جنگ کی تھی وہ عام نہیں تھی اور زیراس کے بجائے کوئی اور اس کا مدمقابل ہوتا تو شاید اسے جینا نصیب نہ ہوتا۔

پھر ہیرک نے اپنی کمر پر ایک چوڑی پیٹی باندھی اور اس میں ایک چمکتا ہوا خنجر سجالیا۔ عقب میں ایک تیز دھار کلہاڑی بھی اس نے لٹکا لی تھی البتہ جو بندوق اس نے نکالی تھی وہ زنگ خوردہ ہوگئی تھی اور شاید ناقابل استعمال، ہیرک اسے دیکھتا رہا اور پھر اس نے بندوق کو ایک پتھر پر مار کر توڑ ڈالا۔ وہ کافی شاندار نظر آرہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور زیراس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

''میں نہیں جانتا کہ ہیرک کتنے عرصے بعد زندہ ہوا ہے لیکن اب وہ زندہ ہوگیا ہے۔''

''اور بدقسمتی ہے کہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اگر اس نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا۔'' زیراس بولا۔

''او دلیر...... او جیالے، دوستی ہوچکی ہے ہمارے درمیان، اور دوست دوستوں کو مارنے کی بات نہیں کرتے۔ کیا تمہاری بستی میں دوستیاں اسی طرح نبھائی جاتی ہیں؟''

''مگر تیری حرکتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں اور جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی، وہ مجھے پاگل کر دیتی ہے۔''

''آہ! ابھی ہمیں ایک گھوڑے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلحے کی بھی،

لیکن دونوں چیزیں مل جائیں گی، اور اس کے لئے ہمیں بس تھوڑا سا سفر کرنا پڑے گا۔''
ہیرک، زیراس کے ساتھ کھنڈر سے باہر نکل آیا۔

زیراس اب بھی جھنجھلایا ہوا تھا۔ روتھن کے لئے اس کا دل پریشان تھا۔ پتہ نہیں کہاں مر گیا؟ ہمیشہ ہی مصیبتوں کا باعث بنتا ہے۔

ہیرک نے اس سے درخواست کی کہ وہ تھوڑی دیر انتظار کرے۔ وہ ابھی واپس آتا ہے۔ یہ جگہ سیمون کی اس رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جہاں زیراس، سیمون سے ملنے آیا تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن ہیرک، روتھن کی تلاش میں اس کا رہبر بن سکتا تھا۔ چنانچہ اس خبطی کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔

وہ انتظار کرتا رہا اور تھوڑی دیر بعد اس نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ قد آور گھوڑا جس کی پشت پر ہیرک نظر آ رہا تھا۔ اس کے دونوں شانوں سے رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی بندوقیں اور کافی فالتو کارتوس، زیراس کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا اور ایک بندوق اسے پیش کرتا ہوا بولا۔

''بے شک تیری بندوق شاندار ہے لیکن اس میں استعمال ہونے والے کارتوس بہت معمولی سی تعداد میں ہیں جبکہ میں جو یہ بندوق لایا ہوں، اس کے بہت سے کارتوس بھی ساتھ لے آیا ہوں تاکہ اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں کسی طرح کی دقت نہ ہو۔''

زیراس نے اس کی پیش کی ہوئی بندوق قبول کر لی اور پھر اس کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ''کون سے دشمنوں کی بات کرتا ہے تو؟''

''وہ دشمن جنہوں نے تجھ سے تیرا ساتھی چھین لیا ہے۔ میں ان دشمنوں کی بات کر رہا ہوں زیراس! جنہوں نے شالہ سے خوشیاں چھین لی ہیں اور اب یہ بستی صرف ایسے انسانوں کی بستی ہے جو محنت کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور خوفزدہ ہو کر سو جاتے ہیں۔

جن کی زندگی میں خوشی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جو خوف کی دنیا میں جیتے ہیں اور شاید ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ان سے ان کی زندگی ہی چھین لی جائے۔''

''کیا تو سچ بول رہا ہے؟''

''اشتالہ کی قسم، میں تجھ سے جو کہہ رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔''

''یہ قسم تو نے دوسری بار کھائی ہے ہیرک! کون ہے یہ اشتالہ؟''

''جیالے! ساری کہانی ایک دم ختم نہیں ہو جاتیں اور نہ ہی ساری کہانیاں ایک دم سنائی جا سکتی ہیں۔ کچھ صبر تو کر ہیرک کو یہ یاد تو آ جانے دے کہ وہ اپنے اس رنگ میں کیسا ہے اور اشتالہ کی قسم میرے لئے مقدس دیوتاؤں کی قسم سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا یقین تو بہت جلد کر لے گا۔ آ میرے ساتھ آ۔'' ہیرک نے اچانک ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

زیراس نے اس کی دی ہوئی بندوق اپنے گھوڑے کی زین میں اڑس لی تھی اور اس کے بعد زیراس کا گھوڑا بھی ہیرک کے گھوڑے سے پیچھے نہ رہا تھا۔

وہ دونوں بستی کے صدر دروازے سے ہی باہر نکلے تھے لیکن اس وقت بستی میں تاریکیوں کا راج تھا اور باہر کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ہیرک کے ساتھ گھوڑا دوڑاتے ہوئے زیراس نے سوچا کہ اب وہ رقص کرنے والی روحیں کہاں گئیں؟ رقص و موسیقی کی وہ آواز اس رات کے بعد دوبارہ نہیں سنائی دی جس رات روتھن غائب ہو گیا تھا۔ کیا یہ صرف ان لوگوں کے لئے تھی؟ زیراس کے زیرک ذہن نے فیصلہ کیا کہ روحوں کا یہ بلاوا یقیناً دو اجنبیوں کے لئے تھا ورنہ شالہ بستی کے لوگ تو اس موسیقی کی آواز سے دہشت زدہ ہو جاتے تھے اور اپنے کان بھی بند کر لیا کرتے تھے۔ وہ تو زیراس رقص و موسیقی کا اس قدر رسیا نہیں تھا ورنہ شاید روتھن کی طرح وہ بھی شالہ سے غائب ہو جاتا۔

لیکن دوسرا خیال یہ بھی آیا تھا زیراس کے ذہن میں کہ اگر ایسا ہو جاتا تو کم از کم

روتھن کا ساتھ تو ہوتا۔ اب یہ شرابی دیوانہ جس نے چمڑے کا ایک لباس پہننے کے بعد خود کو بدلے ہوئے آدمی کی شکل میں محسوس کیا ہے، نہ جانے کیا ڈھونگ رچانے جا رہا ہے۔ ویسے اس کی ذات میں ایسی باتیں بھی تھیں جو زیراس کے لئے پسندیدہ تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ گھوڑے کی پشت پر جس انداز میں بیٹھا تھا وہ انداز بہترین شہسواروں کا تھا اور زیراس کو شہسواری سے عشق تھا اور یہ کہ اس نے جس انداز میں زیراس سے جنگ کی تھی، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہترین جنگجو ہے اور اگر طویل عرصے تک لڑائی بھڑائی سے دور رہ کر اس نے اپنے آپ کو زنگ آلود کر لیا ہے تو زنگ جھڑ جانے کے بعد وہ ایک بہترین لڑاکا ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کا گھوڑا زمین سے پیٹ لگائے دوڑ رہا تھا لیکن اس نے کئی بار تحسین آمیز نگاہوں سے زیراس کو بھی دیکھا تھا۔ غالباً زیراس کی گھڑسواری کے بارے میں وہ بھی اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔

رات کے اندھیرے ان کے چاروں طرف سے گزرتے رہے۔ ہیرک کے گھوڑے کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ زیراس کے اندازے کے مطابق وہ طویل سفر طے کر چکے تھے اور پھر اس وقت غالباً رات کا آخری پہر اپنے آخری مراحل طے کر رہا تھا جب انہیں ایک سوئی ہوئی بستی نظر آئی۔

ہیرک کا رخ اس بستی کی جانب تھا۔ آن کی آن میں وہ اس بستی میں داخل ہو گئے۔ زیراس کے گھوڑے نے بھی کہیں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بستی میں داخل ہونے کے باوجود ہیرک نے گھوڑے کی رفتار سست نہیں کی تھی اور وہ بستی کے مکانوں کی قطار کے درمیان سے اپنا گھوڑا گزارتا رہا لیکن اس کی آخری حرکت زیراس کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ اس وقت وہ وسیع و عریض احاطے والے مکان کے سامنے پہنچے تھے اور زیراس نے اپنے گھوڑے کو اس انداز میں سنبھالا تھا جیسے کہ اندازہ لگا رہا ہو کہ ہیرک اس احاطے

کے سامنے رکنا چاہتا ہے لیکن ہیرک کا گھوڑا نہ رکا اور دفعتہً ہی اس نے چھلانگ لگا کر احاطے کی کافی بلند دیوار عبور کر لی۔ زیراس نے کمال ہوشیاری سے اپنے گھوڑے کو سنبھالا۔ ہیرک چونکہ پہلے سے اس کے لئے تیار تھا اس لئے اسے گھوڑے سمیت دیوار پھاندنے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی ہوگی، لیکن زیراس اگر اپنے گھوڑے کو نہ سنبھالتا تو لازمی طور پر مکان کے احاطے کی دیوار سے ٹکرا جاتا اور جس رفتار سے گھوڑا دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا، اسی رفتار سے اگر دیوار سے ٹکراتا تو شاید ان دونوں کے بدن دیوار سے ہی چپکے رہ جاتے لیکن زیراس شہسوار تھا۔ اس کے گھوڑے نے بھی زقند لگائی اور احاطے کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

ہیرک کا گھوڑا اب رک گیا تھا اور اس کے ہنہنانے کی آواز پر غالباً احاطے کے اندر موجود لوگ جاگ گئے تھے۔ دفعتاً ہی مکان میں روشنیاں ہونے لگیں۔ زیراس نے اپنا گھوڑا ہیرک کے گھوڑے کے قریب لا کھڑا کیا۔ ہیرک نے بندوق سنبھال لی تھی۔ دو تین آدمی اس طرف دوڑے تو دفعتاً ہیرک کی بندوق گولیاں اگلنے لگی اور وہ سب کے سب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اندر سے چیخیں ابھرنے لگی تھیں۔

ہیرک نے برق رفتاری سے گھوڑے کا رخ تبدیل کیا اور اس کے بعد صدر دروازے کی روشنی میں جو بھی نظر آیا ہیرک نے اسے ڈھیر کر دیا۔ پھر وہ ان لاشوں کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ زیراس بے وقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جن لوگوں کو ہیرک نے قتل کیا ان کے بارے میں زیراس اپنا رویہ کیا رکھے؟ چند ہی لمحات کے بعد ہیرک اندر داخل ہو گیا اور پھر وہ زیادہ دیر اندر نہ رکا وہ ایک موٹے اور پستہ قامت شخص کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لا رہا تھا اور اندر سے عورتوں کے چیخنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ تب اس نے چیخ کر زیراس سے کہا۔

”جیالے۔ باہر سے کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے گولی کا نشانہ بنا دینا۔

خبردار! کسی پر رحم نہ کرنا۔ یہ لوگ رحم کرنے کے قابل نہیں ہیں۔" موٹے اور پستہ قامت آدمی کو اس نے احاطے کے اندر زمین پر دھکا دیا تھا اور پھر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔

اس کی بندوق اس موٹے شخص کے سر کا نشانہ لئے ہوئے تھی پھر اس نے گھوڑے کو موٹے کے اردگرد تین چار چکر دیئے اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شیطان زادے! تو نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ اچھی طرح پہچان لیا ہوگا۔ جیراس کہاں ہے؟ ایک لمحے میں مجھے جیراس کا پتہ بتا دے ورنہ تیرے اس گھر کو جہنم بنا دوں گا۔ جیراس کا پتہ درکار ہے مجھے۔"

"ہک..... ہیرک..... ہیرک رب عظیم کی قسم میں جیراس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ میں صرف نمباسیہ کے خادموں میں سے ہوں۔ میں خود وہ باتیں تو نہیں جانتا جو نمباسیہ کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور جیراس کے بارے میں صرف نمباسیہ جانتا ہے۔ اگر تو چاہے تو اپنی بندوق کی تمام گولیاں میرے بدن میں اتار دے لیکن جو بات مجھے معلوم نہیں وہ میں کیسے تجھے بتا سکوں گا۔ ہیرک میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ م..... میں، میں تو صرف حکم کا ایک غلام ہوں۔ م..... مجھ پر رحم کر ہیرک..... مجھ پر رحم کر۔"

"ہاں..... ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ پر رحم کروں گا لیکن جیراس کے بارے میں تو نے جو کچھ کہا وہ درست نہیں ہے۔"

"یقین کر ہیرک..... یقین کر۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا..... میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہا تجھ سے۔ جیراس کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے۔ رب عظیم کی قسم۔"

"نمباسیہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنی بستی ہی میں رہتا ہے اور اب تو بہت عرصے سے میرا اس سے رابطہ بھی نہیں رہا۔ میں یہاں شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ نمباسیہ اپنی بستی میں ہے اگر یہ بات غلط ثابت ہو جائے تو تو میرے ساتھ جو تیرا دل چاہے سلوک کرنا۔"

"ہوں، نمباسیہ کا تعلق اب بھی جیراس سے ہے؟"

"وہ باتیں مجھے کبھی نہیں معلوم ہوتیں جن کا تعلق براہ راست نمباسیہ سے ہوتا ہے۔ نمباسیہ مجھ سے کہتا ہے، یہ کام کرلو سو میں اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہوں اور بس، لیکن جیسا کہ میں نے تجھے بتایا میرا کوئی براہ راست تعلق نمباسیہ سے نہیں ہے۔ مجھ پر رحم کر ہیرک..... مجھ پر رحم کر۔"

"بے شک..... بے شک اور تیرے لئے بہتر یہی ہے کہ تو زندہ نہ رہے۔ ذرا سوچ اگر تو زندہ رہا اور نمباسیہ کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ تو نے مجھے نمباسیہ کے بارے میں بتایا تھا تو کیا نمباسیہ تجھے زندہ چھوڑے گا؟ اور اگر میں تجھے زندہ چھوڑ کر نمباسیہ کی تلاش میں جاؤں تو کیا مجھ سے پہلے تیرے ہرکارے نمباسیہ تک نہیں پہنچ جائیں گے؟ اور نمباسیہ ہوشیار نہیں ہو جائے گا؟ چنانچہ تیرے لئے بہترین فیصلہ یہی ہے....." دفعتاً دھائیں دھائیں کی آوازیں گونجیں اور ایک گولی زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے سینے میں دل کے مقام پر اور دوسری اس کی پیشانی میں لگی۔ نشانہ ایسا جچا تلا تھا کہ موٹے آدمی نے آواز تک نہیں نکالی اور خاموشی سے مر گیا۔ تب ہیرک نے اپنے گھوڑے کا رخ تبدیل کیا اور زیراس سے بولا۔

"چلو زیراس! اب اس بستی میں ہمارا کوئی کام نہیں ہے۔"

زیراس ایک بار پھر چونک پڑا۔ ہیرک کے گھوڑے نے دوڑ لگا دی تھی لیکن اس بار زیراس کا گھوڑا اس سے پہلے احاطے کی دیوار عبور کر گیا تھا۔ زیراس نے باہر نکل کر بندوق سے فائر کئے۔ کہیں کسی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی اور آن کی آن میں وہ بستی

سے دور نکل آئے۔

ہیرک کا گھوڑا ایک بار پھر چٹانوں میں دوڑ رہا تھا اور زیراس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ صبح کی روشنی رفتہ رفتہ نمودار ہوتی جا رہی تھی اور اطراف کے مناظر روشن ہو گئے تھے۔ دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے...... چٹانوں کے درمیان زمین کو ہموار کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشت کی گئی تھی۔ یہ منظر بھی چند لمحات کے بعد نگاہوں میں اوجھل ہو گیا اور رفتہ رفتہ زمین کی ہریالی ختم ہونے لگی۔

زیراس دانتوں میں گھوڑے کی لگامیں دبائے گھوڑے کی پشت پر بیٹھا ہوا تھا لیکن گھوڑے کی رفتار کسی بھی طرح ہیرک کے گھوڑے سے کم نہیں تھی۔ یہ سفر اس وقت تک جاری رہا جب تک سورج نہ نکل آیا اور سورج نکلنے کے بعد ہیرک نے اپنا گھوڑا ایک نخلستان کے قریب روک دیا۔ یہاں کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے اور تھوڑے ہی فاصلے پر پانی بھی چمک رہا تھا۔ گھوڑے شاید پیاسے تھے۔ پانی کو دیکھ کر مچل اٹھے اور ہیرک نے چشمے کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے کی پشت چھوڑ دی۔

زیراس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ہیرک کی تو شخصیت ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جو مردنی چھائی رہتی تھی اب نہ جانے کہاں جا سوئی تھی اور وہ انتہائی چاق و چوبند اور خوش نظر آ رہا تھا۔ گھوڑے کی پشت سے اترنے کا مظاہرہ اس طرح ہوا تھا کہ زیراس کو ایک بار پھر اس کی چابک دستی کا قائل ہونا پڑا۔

زیراس خاموشی سے اپنے گھوڑے کی پشت خالی کرنے لگا اور ہیرک نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''نسل نسل کا فرق ہے...... ظرف ظرف کا فرق ہے۔ اعلیٰ ظرف میں تیرا بھی قائل ہوں اور تیرے گھوڑے کا بھی جو میرے بے غیرت گھوڑے کی مانند سب کچھ بھول بھال کر پانی کی جانب نہیں دوڑا بلکہ تیری اجازت کا انتظار کرنے رک گیا۔''

زیراس نے اپنے گھوڑے کی پشت پر تھپکی دی اور گھوڑا خراماں خراماں چشمے کی جانب چل پڑا۔ پھر اس نے اپنا منہ پانی میں ڈال دیا۔

ہیرک اپنا لباس اتارنے لگا۔ اس نے پھرتی سے سارا لباس اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ صرف ایک زیر جامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے زیراس کی طرف رخ کر کے کہا۔

''ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا یہ چشمہ، چشمہ حیات ہے۔ آؤ زیراس، تازہ دم ہو جائیں۔''

زیراس کے چہرے پر ایک لمحے کیلئے عجیب سے تاثرات نظر آئے اور پھر وہ مسکرا دیا۔ چند لمحات کے بعد وہ لباس سمیت ہیرک کے پیچھے پیچھے ہی چشمے میں کود گیا۔ یہ فرحت بخش لمحات زیراس کو بڑے پرمسرت محسوس ہوئے۔ دونوں دیر تک چشمے میں غسل کرتے رہے۔ اس کے بعد ہیرک باہر نکل آیا لیکن زیراس پانی میں رہا تھا۔ گھوڑے سیراب ہو کر گھاس کی تلاش میں چل پڑے تھے۔ ہیرک نے اپنا لباس پہن لیا اور پھر وہ اپنے جوتے ایک درخت کے تنے کے نیچے رکھ کر بندروں کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھنے لگا۔ اس نے آن کی آن میں درخت کے اوپر پہنچ کر بہت سے پھل توڑ لئے اور نیچے آ گیا۔

اس دوران زیراس بھی چشمے سے نکل آیا تھا۔ ہیرک نے یہ پھل بڑے احترام سے زیراس کو پیش کئے اور ادب سے بولا۔ ''اجنبی! صبح کا ناشتہ۔''

زیراس نے خاموشی سے پھل دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر نیچے رکھے اور دوسرے لمحے اس کا ہاتھ ہیرک کے گریبان پر پہنچ گیا۔ اس نے ہیرک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہیرک کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ زیراس کافی دیر تک اسے جھنجھوڑتا رہا اور پھر اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''اور اس کے بعد اگر تیری زبان نہ کھلی تو پھر کبھی نہ کھل

سکے گی۔ سن لیا تو نے۔'' اس نے ہیرک کو زور سے دھکا دیا اور ہیرک نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد وہ کہنیوں کے بل زمین پر لیٹ گیا تھا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے گردن جھٹک کر کہا۔

''بہت بے صبرا ہے تو، ٹھیک ہے ہیرک کی کیا مجال کہ تیرے حکم سے انحراف کر سکے۔ لیکن اگر کچھ پھل پیٹ میں پہنچ جائے تو......تو......''

''نہیں تیرے پیٹ میں کچھ پہنچنے سے پہلے جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے باہر آنا چاہئے۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں اپنے خنجر سے تیرا پیٹ پھاڑ کر سارے راز باہر نکال لوں گا۔''

ہیرک مسکرا پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''نہیں زیراس تجھ سے انحراف مقصود نہیں ہے۔ سننا ہی چاہتا ہے تو لے یہ کہانی وقت سے پہلے سن۔''

اس کا چہرہ رفتہ رفتہ سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ سر پھرے شرابی کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ ان کی پتلیاں سکڑتی جا رہی تھیں۔ اس حالت میں اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا تھا لیکن زیراس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سوچ کے راستے پر چلتا ہوا ماضی کے کسی دور دراز گوشے میں گم ہو گیا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس بات کو جو عرصہ گزرا ہے۔ اس کا تعین دنوں، ہفتوں یا مہینوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب..........''



شالہ زندگی سے بھرپور تھا۔ اس کی گلیوں اور کوچوں میں ناچ رنگ ہوتا تھا۔ لوگ خوش حال تھے اور ہیرک جو ایک سنگی چٹان کی مانند تھا۔ اسے سر اٹھا کر چلنے والوں سے نفرت تھی۔ اسے چوڑے سینے، جھکے ہوئے پسند تھے۔ ہاں اگر وہ ہیرک کے سامنے سے گزر جائیں تو کوئی ہرج نہیں تھا اور جنہوں نے گردن اٹھائی وہ میرے ہاتھوں فنا ہو گئے۔ آس پاس کی بستیوں میں مجھ سے بڑا لڑاکا نہ تھا اور میں تفریحاً قتل کرتا تھا۔ بس بہتے خون سے زیادہ خوبصورت کوئی منظر نہیں لگتا تھا مجھے۔ میرے باپ نے مجھے سمجھایا، انسانی خون پانی نہیں ہوتا کہ اس طرح بہایا جائے تجھے سنبھلنا ہوگا ورنہ شالہ میں تیرے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

''مجھے کون یہاں سے نکالے گا؟'' میں بپھر گیا تھا۔

''میں......'' میرے باپ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ایسا نہ کرنا میرے باپ۔ ورنہ میرے یہاں سے نکلنے کے بعد شالہ آباد نہ رہ سکے گا۔'' میں نے باپ کو تنبیہ کی تھی۔

''اسے غیر آباد کون کرے گا؟'' وہ گھور کر بولا۔

''میں......'' میں نے بھی گردن جھکا کر جواب دیا تھا۔

''اس کے بعد تو کسی کو ہلاک نہ کرے گا، ورنہ میں تیرے لئے منصفوں سے سزا مانگوں گا۔'' اور جوان اسی رات چھ منصف ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ میں نے ان سب کی

گردنیں کاٹ کر اپنے باپ کے گھر کے دروازے پر ڈال دی تھیں۔ پھر میں نے اپنے باپ سے کہا تھا۔

"یہی تھے وہ جو میرے لیے سزا تجویز کرتے۔"

میرا باپ اندر گیا، اس نے اپنی گردن میں رسی کا پھندہ ڈالا اور موت سے ہم آغوش ہو گیا۔ پھر کون تھا جو مجھے روکتا، سرزنش کرتا۔ میں سرکش شیر بن گیا۔ جس نے راستے میں قدم رکھا اسے چیر پھاڑ کر پھینک دیا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ سے آنکھ ملاتا اور ولد الحرام جیراس بھی میرا دست راست تھا۔ اس کے ساتھ چند اور لوگ بھی تھے۔ جیراس میرے نام پر خفیہ طور پر لوگوں سے دولت لوٹتا مگر مجھے دولت سے کوئی رغبت نہیں۔ میں تو اپنی دنیا میں مست تھا اور انہی دنوں جیراس نے مجھ سے کہا۔

"کسی کو تیری ضرورت ہے ہیرک۔"

"کسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہم میں سے نہیں ہیں مگر ان کے پاس دولت کے انبار ہیں۔ وہ سب کچھ ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔"

"مگر وہ میرا کیا کریں گے؟"

"وہ تیری حمایت چاہتے ہیں اور تجھے ایک مرتبہ دینا چاہتے ہیں اور پھر تیری حمایت سے یہاں اپنے پاؤں جمانے کے خواہش مند ہیں۔"

"مگر کیا وہ مجھے اپنا غلام بنا کر مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں؟"

"غلام نہیں دوست بنا کر۔"

"میں اپنی دنیا میں مست ہوں۔ مجھے کسی کی دوستی کی درکار نہیں۔"

"ایک بار تو ان سے مل تو لے۔"

"مل لوں گا ابھی جلدی نہیں ہے۔" میں نے زور سے کہا اور جیراس خاموش ہو

گیا۔ میں نے اس کی خاموشی پر غور بھی نہیں کیا تھا۔

ذی آنا کے سارے علاقے میری ملکیت تھے۔ جہاں بھی جاتا میری شہرت پہلے سے وہاں موجود ہوتی۔ تب میں ایک بار ایک خوبصورت بستی میں پہنچ گیا۔ قدرتی مناظر کی یہ بستی اس خطے کی سب سے حسین بستی تھی۔ یہاں کا حسن دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ بستی سے کچھ فاصلے پر ایک چشمے کے کنارے میں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ میرے ساتھی شکار کرنے نکل گئے، چشمے کے اطراف میں پرندوں کی ڈاریں اتر رہی تھیں، موسم بے حد خوشگوار تھا اور میں تو دلکش مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے میرا کوئی ساتھی چہل قدمی کر کے واپس آیا ہو۔ چنانچہ میں نے اس جانب توجہ نہیں دی لیکن کافی دیر گزر گئی اور میرے کسی ساتھی نے مجھے مخاطب نہ کیا۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں وہ کوئی اور تو نہیں۔ اس خیال کے تحت میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر میری نگاہ ایک جانب اٹھ گئی۔

ایک درخت کی شاخ پر کچھ کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ رنگین لباس اور ان کے بارے میں میرا اندازہ غلط نہیں تھا وہ زنانہ لباس تھا۔ میں نے ٹھٹکتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر میرے ذہن میں شرارت جاگ اٹھی۔

میں چشمے کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور وہاں سے چشمے میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ میں نے ایک نازک بدن کو دیکھا جو مچھلی کی مانند پانی میں تیر رہا تھا۔ وہ نوجوان اور حسین لڑکی تھی۔ ایک شرارت جو ذہن میں آئی تھی، میں کھڑا اسے دیکھتا رہا اور دفعتہً اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ پانی میں مچھلی کی طرح غوطہ لگا گئی۔ وہ خود کو چھپانے کے لیے چشمے کی گہرائیاں ناپ رہی تھیں۔ میں اسے تنگ کرتے ہوئے لطف محسوس کر رہا تھا کیونکہ شفاف پانی میں وہ خود کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ میں نے وہ سمت دوبارہ اختیار کی جہاں اس کا لباس موجود تھا۔ لباس کے حصول کے لیے اسے اسی سمت آنا

پڑا میں اسے دیکھتا رہا۔

غضب کی خوبصورت لڑکی تھی! پانی میں اس کے لمبے لمبے بالوں نے پورے جسم کو ڈھانپ دیا تھا۔ وہ بے چین مچھلی کی مانند پانی میں چکراتی رہی اور میں اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کی تیراکی کی مہارت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر مجھے نجانے کیوں اس پر رحم آ گیا۔ خیال آیا کہ ممکن ہے وہ تھک گئی ہو۔ اس لیے میں نے وہ کنارہ چھوڑ دیا جہاں اس کے کپڑے رکھے ہوئے تھے اور دوسری جانب چل پڑا۔ بس ایک بجلی سی چمکی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے ایک سفید لکیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنچ گئی ہو۔ اس نے اتنی برق رفتاری سے اپنا سفر طے کیا تھا کہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ انسان ہے۔

چشم زدن میں وہ کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ اپنا لباس پہننا تھا لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا تھا۔ جب اس نے اپنے لباس کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا اور اس میں سے کوئی شے نکالی تھی۔ وہ غیر معمولی چمک دمک دیکھ کر میں چونکنا ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ پانی میں اتر گئی تھی۔

میں حیران تھا کہ اس نے یہ انوکھی حرکت کیوں کی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

چند لمحات کے بعد اس نے پانی سے گردن نکال کر مجھے دیکھا۔ اب میں اس کے چہرے کو بھی بخوبی دیکھ سکتا تھا اور بلاشبہ ایسی حسین لڑکی اس سے قبل میری نگاہوں سے نہ گزری تھی۔ وہ شدید غصے کے عالم میں اپنی بے لباسی کو بھول گئی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچی اور دفعتہ ہی میں نے ایک دفعہ پھر بجلی سی چمکتی دیکھی۔ وہ مڑا ہوا چوڑا سا خنجر تھا جو اس طرح میری جانب آیا کہ اگر میں ہوشیار نہ ہو جاتا تو یقیناً وہ میرے دل میں پیوست ہو جاتا۔

میں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن لڑکی تھی کہ قیامت، اس کے پورے جسم میں برقی صفات پائی جاتی تھیں۔ وہ بجلی کی تیزی سے ہٹی اور دوسرا وار مجھ پر کر دیا لیکن اب میں

ہوشیار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا وار پھر خالی کر دیا لیکن لڑکی کسی قیمت پر نہیں ہٹ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے ہر حالت میں ختم کرنا چاہتی ہو۔ اس کی ان حرکتوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کے جسم میں خنجر کے درجنوں زخم ہوتے لیکن میں غیر معمولی پھرتی سے اس خوفناک بلا کے وار خالی دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا سی بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس وقت تک مجھے نہیں چھوڑے گی جب تک میرے جسم میں لاتعداد زخم نہیں بن جائیں گے۔ وہ مسلسل پینترے بدل بدل کر مجھ پر حملے کر رہی تھی پھر جب یہ کھیل طویل ہو گیا تو میں نے اسے ختم کرنا مناسب سمجھا اور اس بار جب وہ سامنے سے مجھ پر حملہ آور ہوئی تو میں نے پینترا بدل کر اسے اپنے بازوؤں میں لے کر پانی میں سے کھینچ لیا۔

طوفان آ گیا تھا۔ ایسی شدید جدوجہد کی تھی اس نے کہ توبہ بھلی۔ بالآخر میں نے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں خنجر تھا۔ اس کی انگلیاں مضبوطی سے خنجر کے دستے پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کی ایسی نس دبائی کہ اس کی انگلیاں بے جان ہو گئیں اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے ایک بار بھی چیخنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش میں اس نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں فرط اشتعال سے انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور بھوکی شیرنی کے انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔ خنجر میں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جنگلی بلی! مجھ سے انتقام لینا ہے تو اس کی وجہ بھی بتانا ہوگی۔“

”میں تیری دونوں آنکھیں چاہتی ہوں۔ یہ دونوں آنکھیں اب تیرے چہرے پر نہ رہ سکیں گی گندے کتے۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسا نہ کرنا۔ میری خواہش ہے کہ تم میرے سارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو لیکن ان آنکھوں کو میرے چہرے پر چسپاں رہنے دو۔ یہ آنکھیں ہی تو تمہارے حسن کو دیکھ سکتی ہیں۔''

''میں تیرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ بہادوں گی۔ میں تیری آنکھیں ضرور پھوڑ دوں گی جنہوں نے مجھے اس حال میں دیکھا ہے۔''

''چلو فکر نہ کرو۔ شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ میری بینائی کمزور ہے میں تو تمہیں ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ کہاں ہو تم؟'' میں نے اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے کہا لیکن لڑکی نے جواب نہ دیا۔ میں دیر تک آنکھیں بند کر کے اس کے اگلے قدم کا انتظار کرتا رہا لیکن اس کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنی جگہ موجود نہ تھی۔

